زمین پر برپا فساد سے گھبرائے لوگوں کے لئے ایک ہنستی مسکراتی دُنیا

ماہنامہ

چاند

لاہور

نومبر 2012ء

قیمت: 50 روپے

یہ وہاں ہے

کارٹون	ادارہ	5
ہنس بیتیاں	مستقل عنوان	8
ڈاکٹر یا عاشق	شوکت علی مظفر	10
انگریزی اور ہم دیسی	خادم حسین مجاہد	11
میڈان---؟	سید بدر سعید	12
نگاہِ انتخاب	محمد سعید خان	13
مکس پلیٹ	شاہد اطہر	19
خفیہ ایجنسی	کے۔ایم خالد	33
ڈھول کا پول	منظور احمد اعوان	45
شعراء اور شاعری	سید ابرار بخاری	51
لالہ بندو	شبیبہ مظہر رانجھا	57
غ سے غلطیاں	قاضی محمد الیاس	63
رسم کڑوی	سرتاج صدیقی	67
بعد مرنے کے کیا ہوگا	عمران قریشی	74
جینی اور جن	محمد محبوب ملک	79
بے چارہ	محمد فاروق انجم	83
موبائل مسکراہٹیں	ہارون حسرت	89

☆☆

سندیسے	رقعہ باز	94
ٹکریں	ماہر ٹکریات	95

☆☆☆

چاند نگر

نکتہ چینی	سید بدر سعید	97
مشاغل+مشغول	سمیع ناظم	99
تین بٹا تین	ایلفا اینڈ اومیگا	102
واشنگ مشین	روح اللہ روح	103
آشنا	محمد عباس	104
محفلِ مشاعرہ	صائمہ	105
جھوٹے وعدے	ستارہ	107
کھیل کھیل میں	اظہار المصطفیٰ صدیقی	108
قصہ آخری درویش کا	یادش منصور	109
معدنیات	شبیبہ مظہر رانجھا	111
شاعرانہ بونگیاں	عاشر نثار	112
کہتا ہوں سچ	توصیف احمد	113

☆☆☆

مرزا عاصی اختر، ڈاکٹر امبر شہزادہ، محمد کامران شہزاد، روح اللہ روح، جواد حسین جواد، نوید ظفر کیانی، واجد نگینوی کے خوش رنگ کلام کے علاوہ قہقہہ بار کٹ پیس، کارٹون اور دیگر مسکراہٹیں صفحہ بہ صفحہ!

بانی وحشی مارہروی

مہینہ بھر کے قہقہوں اور مسکراہٹوں کا راشن

تیس روزہ

چاند

لاہور

جلد نمبر:65 شمارہ نمبر:06 نومبر 2012ء

CPL-192

مغز مار خصوصی

ناکتخدائے اعظم، صدر الہام کنوارا کلب، انجمن ریش درازانِ پاکستان، دشمن عقل و عریانی، تاریک العورات، رقیب زن مریدگان و مجروح فیشن زدہ دوشیزگان

ابوالمزاح ہستی خوامخواہ

پیر جنگلی علیہ ماعلیہ (افریقہ پلٹ)

مدیر اعلیٰ خالد بن حامد

مدیران صباحت زیاد خالد

ناظم طباعت ○ رانا نذیر احمد ● کمپوزنگ ○ سیف اللہ

برائے رابطہ: 0312/0333-4284875

کاغذی گھوڑے دوڑانے کا پتہ

"چاند" 31-F شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور

قیمت: 50 روپے

"تو گویا آپ میری بیٹی سے شادی کے خواہش مند ہیں---میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنی شکل دکھانے کی بجائے جائیداد اور بنک بیلنس دکھائیں تو شاید وہ مان جائے---"

"باس کا دل رکھنے کے لئے تم بھی ہنسو، بے وقوف! ان کے سنائے لطیفے کا مطلب میں تمہیں گھر جا کر سمجھا دوں گا۔"

''ارے بھاگو، جان بچاؤ، بے وقوف! جنہیں تم سکتے کے عالم میں دیکھ رہے ہو، یہ میرے ڈیڈی ہیں---''

''تم خوش قسمت ہو جو تمہیں شادی کر کے گھر لایا ہے ورنہ اس سے پہلے جتنی بھی آئیں انہیں اسی وعدے پر لے کر آیا تھا کہ تم سے جلد شادی کرلوں گا۔''

''بھکاری بن کر کہیں سے گوشت ہی مانگ لاتے، احمق! بکرا عید پر بھی ڈیٹ پر بلایا تو چپس ہی کھلائے، لعنت ہے تم پر---''

خدارا لوڈشیڈنگ ختم کرو ورنہ اِتنے بچے ہوجائیں گے کہ سنبھالنا ناممکن ہوجائے گا 😊 شاہد اطہر

''آنکھیں کھول کے دیکھیے، ڈیڈی! یہ تو میرا بوائے فرینڈ ہے۔ آپ کی آنکھ اس کے نہیں، کتے کے بھونکنے سے کھلی ہے---''

''شادی کے بیس سال بعد صرف اتنا فرق پڑا ہے کہ پہلے یہ میرے جیسے تھے، اب میں ان کے جیسی ہوں۔ یہ صرف رعب جماتے تھے جبکہ میں رعب جما کر اب ان سے ہر قسم کا کام بھی لیتی ہوں۔''

اب تو لڑکے بھی جب اکٹھے ہوتے ہیں تو وہ لڑکیوں کی طرح بناؤ سنگھار پر گفتگو کرتے ہیں ☾ نازیہ ناز نازی

ہنس بیتیاں

کبھی کوئی مکالمہ، کسی کی معصومیت یا بدحواسی پر بے ساختہ قہقہے وارد ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کو کسی واقعہ پر بے تحاشہ ہنسی آئی ہو تو ایک کاغذ پر ہمیں لکھ بھیجئے۔ ہم اِن صفحات پر اسے آپ کے نام سے جگہ دیں گے اور چاہیں گے کہ آپ کے ساتھ اور لوگ بھی اِس واقعہ سے لُطف اُٹھا سکیں، ہنس سکیں۔ کسی لطیفے کو توڑ مروڑ کر واقعہ بنانے کی کوشش نہ کیجئے۔ واقعہ کاپی سائز کے دو صفحات سے زیادہ نہ ہو، اخلاق سوز نہ ہو۔ سب سے زیادہ قہقہے آور واقعہ پر سال بھر کے لئے چاند مفت بطور انعام دیا جائے گا۔ واقعہ اِس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج "ہنس بیتیاں" تیس روزہ "چاند" شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور 54600

تو پھر؟
✿ سمیرا شاہ اینڈ حمیرا شاہ، لاہور

اپنے چھوٹے بھائی چودہ سالہ زاہد کے سامنے جب ہم نے اپنے اِس عزم کا اظہار کیا کہ کس طرح ہم چاند کے کاکوں کی مت مارنے جا رہے ہیں تو وہ بے ساختہ بولا۔

"میری بھولی باجیو! ایک مَیں تو آپ سے سنبھالا نہیں جاتا، چاند کے تیز و تند کاکوں کی مت آپ کیا مار پائیں گی؟"

"ارے، وہ تو ہم پیار کی وجہ سے تمہیں کچھ نہیں کہتے۔" حمیرا فوراً بولی۔

"اچھا یہ بات ہے---" شرارتی زاہد فٹ بولا۔ "اگر وہاں بھی یہی سچوایشن پیدا ہو گئی تو پھر؟

کہہ کر زاہد بہت زور سے ہنسا اور ہم دونوں نے اپنا اپنا تکیہ پوری قوت سے اُس شیطان پر دے مارا۔

نیا وزیراعظم
✿ حکیم عنایت اللہ شاہد، حافظ آباد

پچھلے ہفتے بیگم کو معمولی امراض کے میڈیکل ٹیسٹ کروانے کے لئے کسی عزیز رشتہ داروں کے پاس تین چار دِن کے لئے رہنا پڑا۔ اتفاقاً اُسی دِن اُن عزیزوں کی والدہ ہمارے گھر حافظ آباد آ گئیں۔ تیسرے دِن ہی عزیز کی طرف سے مجھے فون آیا کہ والدہ صاحبہ کے جانے کی وجہ سے ہم سب اُداس ہیں، ہماری رونق (ماں) جلدی واپس بھیجیں۔ مَیں نے کہا کہ اِس شرط پر والدہ کو بھیجوں گا کہ میری ٹینشن (بیگم) کو کم از کم دو ماہ لاہور میں ہی رہنے دیا جائے۔ یہ سن کر عزیز نے فوراً جوب دیا۔

"اور یہ جو تین دِن سے آپ کی بیگم نے یہاں ٹینشن پھیلائی ہوئی ہے، اِس کا بل پاکستان کا نیا منتخب ہونے والا وزیراعظم ادا کرے گا کیا؟"

اور اِس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

بٹھا دو
✿ ڈاکٹر ادیب عبدالغنی شکیل، ملتان

حال ہی میں منعقد ہونے والے عام انتخابات میں میرے دوست ڈاکٹر محمد افضل ایک پولنگ سٹیشن پر فرائض منصبی بحیثیت اسسٹنٹ پریذائیڈنگ آفیسر ادا کر رہے تھے۔ اُن کے پولنگ سٹیشن پر ٹرن آؤٹ صبح سے اچھا خاصہ تھا اِس لیے دوپہر تک چاروں ٹرانس پیرنٹ بیلٹ باکسز تقریباً مکمل بھرے نظر آ رہے تھے۔ ایک پولنگ آفیسر بولا۔

"سر! یہ تو چاروں اوپر تک بھرے نظر آ رہے ہیں، کیوں نہ ایک ایک جگ پانی کا بھر کر اِن چاروں میں ڈال دوں تاکہ سارے ووٹ نیچے بیٹھ جائیں اور ووٹوں کے لئے جگہ بن جائے؟"

ڈاکٹر افضل نے جواب دیا۔ "بیٹا! ووٹ بیٹھیں نہ بیٹھیں، اُمیدواروں کا بھٹہ ضرور بیٹھ جائے گا اور پھر وہ جو ہماری "خدمت" کریں گے، وہ ہمارے گٹوں گوڈوں میں بیٹھ جائے گی۔"

میکے جانا ہے
✿ سیّدہ عظمیٰ گیلانی، راولپنڈی

یہ اِن دِنوں کی بات ہے جب ہم تیسری کلاس میں پڑھتے تھے۔ ہماری امی جان نے ہم سے کہا کہ پانچ دِن کی چھٹیاں لے آنا کیونکہ ہم کل نانا جی کے گھر جائیں گے۔ ہم جب سر کے آفس پہنچے تو سر نے پیار سے پوچھا۔

"کیا بات ہے، بیٹا! آپ آفس کیوں آئی ہو؟"

ہم نے جلدی جلدی اپنی روئیداد سنائی۔ "سر! مجھے پانچ دِن کی چھٹیاں چاہئیں کیونکہ مَیں نے کل اپنے میکے جانا ہے۔"

سر ہنستے جا رہے تھے اور بار بار پوچھ رہے تھے کہ کہاں جانا ہے اور ہم بھی جملہ دہرا رہے تھے کہ میکے جانا ہے۔ اِس وقت تو ہمیں اپنی غلطی کا احساس نہ ہوا مگر بعد میں ہمیں پتا چلا کہ ہم نے میکے نہیں بلکہ ننھیال جانا تھا۔

شاندار استقبال
✿ محمد فاروق نوید، رحیم یار خان

میرے اور عبدالقیوم اسد کے ایک مشترکہ دوست ہیں جن کا نام تو شاہد اقبال ہے مگر ہم سب دوست آپس میں اُنہیں "سُستی" کے نام سے پکارتے ہیں۔ سُستی کو رنگ برنگے سٹیکر جمع کرنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ حالیہ الیکشن میں بھی وہ سٹیکر جمع کرنے کی مہم کو زور و شور سے سر کرنے کی کوشش میں مصروف رہے اور کافی سٹیکر جمع کئے۔

ایک صبح ہم اڈہ خانپور پر کھڑے تھے کہ وہاں سے پیپلز پارٹی کا جلوس گزرا اور اُسے دیکھتے ہی مستی صاحب سٹیکر لینے کی غرض سے اُس میں شامل ہو گئے۔ جب وہ واپس آئے تو حسب توقع کامیاب رہے تھے، آ کر ہمیں کہنے لگے۔

''یار! چلو جناح پارک میں آج مسلم لیگ (ق) کا جلسہ ہے، وہاں جا کر سٹیکر لیتے ہیں۔''

ہم نے انکار کیا اور اُسے بھی ایسے کاموں سے منع کیا لیکن وہ ہمیں وہاں چھوڑ کر خود ہی جناح پارک چلا گیا۔ پھر یہ دوسرے دِن کی بات ہے کہ محلے میں ہمیں مستی صاحب ملے۔ ماتھے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ لنگڑا کر چلے رہے تھے۔ ہم نے حیران ہو کر اِس کی وجہ پوچھی تو وہ سرد آہ بھر کر بولے۔

''یار! دراصل جب وہاں پہنچا تو مجھے اپنی جیب پر لگے ہوئے تیر کے نشان والے سٹیکر اُتارنے یاد نہیں رہے اور اُنہوں نے مجھے دوسری پارٹی کا سمجھ کر میرا شاندار استقبال کیا جس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔''

یہ سنتے ہی ہم قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور مستی صاحب دوسری پٹی کروانے ڈاکٹر کی طرف روانہ ہو گئے۔

کشمیر جل رہا ہے

۞ ہارون حسرت جالندھری، سرگودھا

میری عادت ہے کہ ہر اتوار کو اور کسی بھی خاص تہوار کے دِن علی الصبح دوستوں کو ایس ایم ایس کر کے محبتیں شیئر کیا کرتا ہوں۔ اِس دفعہ 5 فروری کو جبکہ یوم یکجہتی کشمیر کے سلسلے میں سرکاری تعطیل تھی، مَیں نے علی الصبح تقریباً 3:00 بجے اپنا موبائل آن کیا اور اپنے تمام دوستوں کو ایک ایک کر کے کشمیر کے موضوع پر اپنا یہ شعر ایس ایم ایس کرنے لگا۔

''بارود شعلے اُگل رہا ہے اُٹھو کہ کشمیر جل رہا ہے
محاذِ جنگ بدل رہا ہے اُٹھو کشمیر جل رہا ہے''

میرا ایک پٹھان دوست جو غالباً گہری نیند سویا ہوا ہوگا، اِس ایس ایم ایس سے ڈسٹرب ہو کر بیدار ہوا اور فوراً غصے میں آ کر مجھے ایس ایم ایس کیا۔

''کوچہ، کشمیر جل رہی ہے تو ام کیا کریں، فائر بریگیڈ کو فون کرو، آگ بجھانا اُن کا کام ہے۔ آخر وہ تنخواہ کس کام کی لیتے ہیں، ام کو کیوں اِس وقت ایس ایم ایس کر رہی ہے؟''

اُس کے اِس جواب سے مجھے اتنی ہنسی آئی کہ گھر کے باقی افراد بھی جاگ کر میرے قہقہوں میں شریک ہو گئے۔

صرف تین

۞ سمیع ناظم، موسیٰ خیل میانوالی

یہ واقعہ میرے ایک کالج فیلو دوست نے مجھے سنایا تھا، اُس کی زبانی عرض ہے۔

ایئر کنڈیشنڈ بس میں ایک مرتبہ مَیں اسلام آباد سے واپس آ رہا تھا۔ میری جگہ ڈرائیور سے پچھلی سیٹ پر تھی اِس لئے مَیں ڈرائیور اور کنڈیکٹر کے قریب بیٹھا ہوا تھا جہاں سے اُن کی باتیں سن سکتا تھا۔ بائیں طرف ایک علیحدہ سیٹ ہوتی ہے جس کو VIP سیٹ کا نام دیا جاتا ہے، اِس پر ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھی جو اکیلی سفر کر رہی تھی۔ ایک جگہ جب گاڑی رُکی تو اِس بوڑھی مائی نے کنڈیکٹر سے پوچھا۔

''پتر! یہ کون سی جگہ ہے؟''

کنڈیکٹر نے بتایا کہ یہ فلاں جگہ ہے تو بوڑھی مائی نے کہا کہ بیٹا! مَیں ''چھوٹی'' کر لوں؟ کنڈیکٹر نے گاڑی رُکوائی اور بوڑھی مائی کا مسئلہ حل کیا۔ اب جہاں کہیں بھی گاڑی رُکتی تو بوڑھی مائی پہلے جگہ کا نام پوچھتی اور کنڈیکٹر سے ''چھوٹی'' کرنے کی اجازت لے کر اُتر جاتی۔ کنڈیکٹر بہت تنگ آ چکا تھا۔ جب گاڑی بوڑھی عورت کی منزل مقصود سے ڈیڑھ گھنٹہ کے فاصلے پر پہنچی تو ایک جگہ سٹاپ پر گاڑی رُکی تو بوڑھی عورت نے اپنا پرانا عمل دُہرایا اور پھر اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے کنڈیکٹر سے پوچھا۔

''پتر! مجھے گھر پہنچنے میں کتنی دیر لگے گی؟''

کنڈیکٹر جو تنگ آ چکا تھا، اُس نے جھنجلا کر جواب دیا۔

''بس ماں جی! زیادہ نہیں صرف تین ''چھوٹیاں'' اور ہوں گی۔''

اور یہ سن کر ڈرائیور سمیت بہت سے دوسرے لوگ ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔

ضرورت

۞ پرنس کشمیری، تونسہ شریف

راہ چلتے اچانک میری نگاہ ایک دوکان کے اندر گئی تو مَیں نے اندر اپنے دوست عالی خان کو موجود پایا۔ مَیں اندر گھستے ہوئے بولا۔

''عالی خان! کہاں ہو آج کل؟ نظر ہی نہیں آتے ہو مَیں تمہیں کافی دِنوں سے ڈھونڈ رہا ہوں۔''

''کیوں، کیا کسی پر کتے چھوڑنے ہیں؟'' عالی خان جواباً بولا۔

''بالکل ٹھیک سمجھے، تین کتے مل گئے ہیں، چوتھا نہیں مل رہا تھا۔ چلو آؤ۔''

مَیں فوراً عالی خان کا ہاتھ پکڑ کر دوکان سے باہر گھسیٹتے ہوئے بولا تو دوکان کے اندر موجود تمام لوگوں کے قہقہے بلند ہو گئے۔

☆☆

ڈاکٹر یا عاشق

شوکت علی مظفر

عاشقی کا طب سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ جو کام ڈاکٹر بڑی بڑی فیسیں لے کر کرتے ہیں‘ وہی کام عاشق مفت میں کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر بڑی محنت سے ایک مریض کو نیا دل لگاتے ہیں اور عاشق یہی کام سیکنڈوں میں کر لیتا ہے‘ فوراً ہی اچھا چہرہ دیکھ کر دل لگا لیتا ہے۔ محبت اگرچہ اندھی ہوتی ہے لیکن ہوتی ہمیشہ خوبصورت لوگوں سے ہی ہے--- میڈیکل کے شعبے نے اب جا کر ترقی کی ہے کہ کسی مریض کو دوسرے انسان کا دل ٹرانسفر کیا جا سکتا ہے‘ عاشقی میں یہ کام برسوں سے چل رہا ہے۔ دل اس سبک رفتاری سے اور بغیر چیر پھاڑ کے ٹرانسفر کئے جاتے ہیں کہ سامنے والے کو احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کے سینے میں ایک کی بجائے دو دل ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹروں میں اگر کوئی انفرادیت نظر آتی ہے تو صرف اتنی کہ وہ گردے بھی تبدیل کر لیتے ہیں‘ عشق میں گردوں کا کوئی خاص عمل دخل نہیں ہوتا ورنہ یہ بھی ارزاں ہوتے۔ ملک کہتا ہے کہ عشق میں گردوں کا ہی تو اصل کام ہوتا ہے ورنہ دل گردہ نہ ہو تو عاشقی کیسے ممکن ہے؟--- میڈیکل کی رو سے آنکھیں چار ہونے کا مطلب کسی کو چشمہ لگ جانا ہے جبکہ یہی کام عاشق کو پھر کبھی بھی نظر نہیں آتا جبکہ ملک کہتا ہے کہ آنکھیں چار ہونے کے بعد ہی تو سب کچھ نظر آنے لگتا ہے--- سرجری میں نشتر چلتے ہیں تو عاشقی میں بھی نظروں کے نشتر چلائے جاتے ہیں جس سے عاشق کا دل گھائل ہی رہتا ہے۔ ملک نے ہماری غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی کہ نظروں سے تو تیر چلائے جاتے ہیں‘ نشتر تو باتوں کے لگتے ہیں۔ دلیل یہ دیتا ہے کہ محبوب دیکھنے سے زیادہ بولنے کو ترجیح دیتی ہے۔ ظاہر ہے‘ بولے گی نہیں تو پھر فرمائشیں کیسے کرے گی‘ انہی فرمائشوں سے تو دل زخمی ہوتے ہیں--- ڈاکٹروں کو عاشقی کبھی راس نہیں آتی کیونکہ عشق میں کبھی آہ بھی بھرتے ہیں تو اپنے لئے خود ہی نسخہ بھی لکھ کر کمپاؤنڈر کو پکڑا دیتے ہیں--- میڈیکل میں ہر عضو کا الگ اسپیشلسٹ ہوتا ہے اور عاشق میں یہ کوالٹی ہوتی ہے کہ ہر اسپیشلسٹ میں الگ ہی ہوتا ہے۔ ایک ڈاکٹر جتنی دیر میں مریض کے لئے نسخہ لکھتا ہے‘ عاشق اتنی دیر میں کیوٹ سا ایس ایم ایس لکھ سکتا ہے۔ ہم نے ملک سے پوچھا‘ ڈاکٹر کو تو نسخہ لکھنے کے پیسے ملتے ہیں‘ عاسق کو کیا ملتا ہے؟ ملک نے جواب دیا کہ میج ڈیلیوری رپورٹ--- اس کا مطلب ہے‘ عاشقی ڈاکٹری سے زیادہ تیز ہے کیونکہ ڈاکٹرز نے ابھی تو صرف نسخہ ہی لکھا ہوتا ہے اور عاشق کے میسج کی ڈیلیوری رپورٹ بھی آ چکی ہوتی ہے--- ہم نے ملک سے پوچھا‘ ڈاکٹری اور عاشقی میں کون سی ایسی چیز ہے جو ان دونوں شعبوں کو علیحدہ کرتی ہے؟ ملک نے جواب دیا‘ ڈگری---!

مستند ڈاکٹر وہی ہوتا ہے جس کے پاس ڈگری ہو اور مستند عاشق وہی ہوتا ہے جس کی عادت بگڑی ہو۔ اچھی عادتوں والا کبھی عشق نہیں کر سکتا‘ ڈاکٹری کر سکتا ہے--- کہتے ہیں‘ عشق نہ پچھے ذات۔ میڈیکل میں بھی یہی قانون لاگو ہے‘ یہ بھی ذات پات سے بالاتر ہے۔ اچھا ڈاکٹر اور عاشق ہمیشہ دل سے توجہ دیتا ہے۔ ڈاکٹری میں مریض کی دھڑکنیں سنی جاتی ہیں اور عاشقی میں محبوبہ کی‘ گویا عاشق اچھے ڈاکٹر بن سکتے ہیں لیکن ڈاکٹر کبھی عاشق نہیں بن سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اسٹیتھو اسکوپ سے دھڑکنیں سننے سمجھنے کے عادی ہوتے ہیں اور عاشق صرف اسکوپ سے دھڑکنیں سن لیتے ہیں۔ عاشق سے کوئی مشورہ لیا جائے تو وہ کبھی اچھا مشورہ نہیں دے گا‘ اگر دے سکتا تو عاشق نہ ہوتا‘ کوئی اچھا کام کر رہا ہوتا۔ ڈاکٹر سے بھی اچھے مشورے کی امید نہیں رکھنی چاہئے کیونکہ یہ بھی اچھے مشورے دینے لگیں تو پھر ڈاکٹر کرنے کا فائدہ؟--- ایک لڑکی ڈاکٹر کے پاس آئی۔

”سر! میں اپنی نازک‘ ملائم اور حساس جلد کی حفاظت کے لئے کیا کروں؟“

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”گھر کے اندر سے کنڈی لگا کر رکھا کرو۔“

ڈاکٹروں اور عاشقوں میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ دونوں ہی میٹھی میٹھی باتیں کر کے اپنا کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اچھا ڈاکٹر وہی ہے جس کی دوا سے زیادہ زبان میں تاثیر ہو اور اچھا عاشق بھی وہ ہوتا ہے جس کی ”زبان“ میٹھی ہو۔ عشق اور ڈاکٹری میں بندہ دشمنی پر آ جائے تو دوسرے کی جان بھی لے سکتا ہے۔ دونوں کی ہی گولیاں بڑی جان لیوا ہوتی ہیں‘ ایک پسٹل میں رکھ کر مارتا ہے اور دوسرا ہسپتال میں--- عاشقی اور ڈاکٹر سنجیدہ لوگوں کا کام ہے۔ ملک کو اعتراض ہے کہ ہم نے عاشقی کو کام کیوں کہا ہے؟ یہ تو بیکاروں کا شغل ہوتا ہے--- ملک کا اعتراض اپنی جگہ مگر عاشق کی ڈیوٹی ڈاکٹر کی طرح سخت ہی ہوتی ہے‘ کسی بھی وقت ”ایمرجنسی“ ہو سکتی ہے--- موجودہ دور میں ڈاکٹر اور عاشق دونوں ہی معیاری لباس میں نہ ہوں تو کوئی انہیں پہچان نہیں سکتا۔ ڈاکٹر اور عاشق سب سے پہلے ہاتھ پکڑتے ہیں اور دونوں ہی آنکھوں میں بڑے غور سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ عاشق اور ڈاکٹر کسی مرض میں مبتلا ہو جائیں تب بھی اپنی ہی منواتے ہیں۔ جیسے ایک عاشق بیمار ہو گیا تو دوا لینے چلا گیا۔ ڈاکٹر نے نرس کو دونوں ہاتھ پکڑ کر نبض چیک کرتے دیکھا تو ڈانٹا۔

”بے وقوف! ایک ہاتھ پکڑ کر نبض چیک کرتے ہیں‘ تم نے دونوں ہاتھ کیوں پکڑ رکھے ہیں؟“

نرس نے بتایا۔ ”سر! میں نے تو ایک ہی ہاتھ پکڑا ہوا ہے‘ دوسرا تو مریض نے پکڑا ہے۔“

جلد کے ڈاکٹر اور پرانے عاشق دونوں ہی بچت میں رہتے ہیں‘ اس میں کیس خراب ہونے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ دانتوں کے ڈاکٹر اور جذباتی عاشق ہمیشہ دوسروں کے دانت نکالنے میں دیر نہیں لگاتے۔ ہڈیوں کے ڈاکٹر اور جدید عاشق دونوں ہی جوڑ جوڑ سے واقف ہوتے ہیں‘ اسی لئے تو عاشق کباب میں سے ہڈی کو بھی اس صفائی سے نکالتے ہیں کہ خود ہڈی کو بھی خبر نہیں ہو پاتی۔ گلے کا ڈاکٹر اور گلی کا عاشق دونوں ہی کبھی ترقی نہیں کر سکتے‘ اگر کر سکتے تو ڈاکٹر کا کلینک گلی گلی میں ہوتا اور عاشق گلے ضرور پڑتا رہتا--- کان کا ڈاکٹر اور کانا عاشق ہمیشہ ایک آنکھ سے تانک جھانک کرتے ہیں۔ بالوں کا ڈاکٹر اور بالوں والا عاشق ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔ جنرل فزیشن اور جنرل عاشق دونوں ہی ”حرارت“ کے بل بوتے پر کام چلاتے ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر اور لیڈی عاشق دونوں ہی مسکرا کر نہ دیکھیں تو سامنے والا خود کو بیمار نہیں سمجھتا اور اگر دیکھ لیں تو ہمیشہ بیمار ہی رہتا ہے۔ ڈاکٹر اور عاشق دونوں مصنوعی سانس دینے کے ماہر ہوتے ہیں اور دونوں ہی سامنے والا کا منہ اپنی اپنی ترکیب سے بند رکھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ بہترین ڈاکٹر اور عاشق وہی ہے جس کی لکھائی خراب اور کمائی بے حساب ہو۔ ایمرجنسی وارڈ کا ڈاکٹر اور ایمرجنسی عاشق دونوں کی ہی قوت فیصلہ کمزور ہو تو کیس ہاتھ سے نکل جاتا ہے--- ڈاکٹر اور عاشق تو بہت سے ہیں مگر انہیں ”ایڈجسٹ“ کرنے کا مسئلہ ہے اس لئے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ گزشتہ دنوں اپنے جمہوری صدر صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ اپنے تمام جسمانی اعضاء بعد از وفات عطیہ کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔ اس بیان کے بعد ملک صاحب اس کشمکش میں مبتلا ہیں کہ محترم صدر صاحب کے تو لاکھوں عاشق ہیں‘ کس کس کی فرمائشیں پوری کی جائیں گی کیونکہ سچا عاشق اپنے محبوب کی کوئی نہ کوئی نشانی اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے اور دوسرا مسئلہ ڈاکٹروں کے لئے ہے کہ وہ کیسے صدر صاحب کو حصوں بخروں میں تقسیم کرنے کی جرات کریں گے کیونکہ اتنا ”عظیم انسان“ صدیوں میں جنم لیتا ہے اور ویسے بھی اچھی قومیں اپنے محسنوں کو اس طرح ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا کرتیں۔ یہ احسان نہیں تو کیا ہے کہ آج پاکستان انہی کے دم سے تو قائم ہے۔ اگر وہ نعرہ نہ لگاتے ”پاکستان کھپے“ تو سوچئے‘ نہ پاکستان ہوتا‘ نہ ڈاکٹر ہوتا اور نہ عاشق ہوتا اس لئے ملک تو یہی نعرہ لگاتے ہیں۔ ”زرداری کھپے‘ زرداری کھپے!“--- کیا کہا‘ ملک پاگل ہے؟ تو ہمیں آپ سے اتفاق ہے‘ پاگلوں کے ڈاکٹر اور پاگل عاشق کا کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ ☆☆

انگریزی اور ہم دیسی

خادم حسین مجاہد

انگریزی زبان بیوی کی طرح ہے جس کے بغیر بھی کوئی چارہ نہیں اور جس کے ساتھ نبھانا بھی مشکل ہے--- بات صرف زبان کی ہوتی تو خیر تھی لیکن اگر اسے اختیار کریں تو اس کے ساتھ اس کا کلچر بھی آ جاتا ہے۔ جیسے شادی میں سسرالی رشتے داریاں تحفے میں ملتی ہیں۔ اسی وجہ سے اول انگریزی کو حرام قرار دیا گیا مگر آہستہ آہستہ یہ خود ہی حلال ہوتی چلی گئی تو مجبوراً علماء نے بھی اسے یوں گوارا کر لیا جیسے حالات اضطرار میں شراب کی اجازت ہو جاتی ہے لیکن اب یہ مجبوری سے بڑھ کر فیشن میں شامل ہو گئی ہے حتیٰ کہ اگر کسی کو بولنا نہ بھی آئے پھر بھی وہ اسے بولنا ضروری سمجھتا ہے جس سے بعض اوقات بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔

ہمارے ایک رائٹر دوست کی انگلش کچھ کمزور ہے لیکن وہ انگلش کلچر کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ شادی کے آٹھ سال گزر جانے پر بھی شادی کی سالگرہ منانے سے باز نہیں آتے حالانکہ آخری درویش کے بقول دو چار سال بعد تو شادی کی سالگرہ نہیں، برسی منانی چاہئے۔ یہ اپنے مقامی احباب کو اپنے خوشی نما غم یا غم نما خوشی میں شریک کرنے کے ساتھ ساتھ ملکی و غیر ملکی احباب کو بھی بذریعہ sms اطلاع دے کر دعائیں وصول کرتے ہیں تا کہ جو حماقت کر بیٹھے ہیں، اس پر خوشی خوشی قائم رہیں۔ اسی سلسلے میں ایک دفعہ مجھے ان کا انگریزی اردو مکس میسج ملا تو میں نے سر پیٹ لیا، لکھا تھا۔

"میری میرج (Marriage) کی برتھ ڈے (Birth day) ہے آپ کی دعاؤں کا ویٹ (wait) کروں گا۔"

شادی کی سال گرہ کا ترجمہ جو انہوں نے اپنی دوسری (Anniversary) کی بجائے برتھ ڈے کیا، اس کی صحیح داد تو کوئی انگریز ہی دے سکتا ہے لیکن اگر وہ اس زحمت میں پڑے بغیر سالگرہ ہی لکھ دیتے تو اس حماقت سے بچ جاتے۔

اسی طرح ایک دن شام کی سیر کے دوران ایک شاعر دوست کے صاحبزادے سے ملاقات ہو گئی جو میٹرک کا امتحان دے کر تازہ تازہ فارغ ہوئے تھے اور ہر وقت انگریزی کے استعمال کی تاک میں رہتے تھے۔ جب میں نے پوچھا کہ "کیا ہو رہا ہے، برخوردار؟" تو فوراً بولے۔

"just enjoying your self! Nothing"

اس میں my self کی جگہ your self استعمال کرنے کی جو حماقت اس نے کی، اس کا صحیح لطف تو انگریزی جاننے والے ہی اٹھا سکتے ہیں--- انگریزی نہ جاننے والوں کے لئے عرض ہے کہ جو کچھ اس نے کہا اس کا ترجمہ سلیس اردو میں کچھ یوں بنتا ہے۔

"کچھ نہیں، بس آپ کو لطف اندوز کر رہا ہوں۔"

امید ہے، اب سب لوگ اس فقرے کی بلاغت تک پہنچ گئے ہوں گے۔

sms اور E.mail کی بدولت انگلش کی ایک اختصار شدہ شکل وجود میں آ گئی ہے، جس میں You کو u، your کو ur، for کو 4، eye کو i، we کو v، why کو y، اور کیونکہ کو qk لکھا جاتا ہے۔ ہمارے دوست میاں عقیل احمد اسی وجہ سے انگلش کے پرچے میں فیل ہو گئے۔ حالانکہ خاصے لائق تھے۔ دراصل وہ sms بہت کرتے تھے اور پیپرز میں بھی sms والی اختصار شدہ انگریزی ہی لکھ آئے تھے۔

انگلش کے کچھ فائدے بھی ہیں۔ جونہی کوئی ماڈرن ہونا چاہے، وہ اپنے قدیم دقیانوسی نام کے انگریزی مخفف کے ساتھ کوئی ماڈرن سا تخلص لگا کر ایڈوانس ہو سکتا ہے۔ مولا داد سے ایم ڈی اختر (خود ہمارے ایک دوست کا نام عارف انیس ہے جنہیں ہم پیار سے Rf19 لکھتے ہیں اور وہ بڑا خوش ہوتا ہے) اگر آپ آس پاس جائزہ لیں تو کئی ماڈرن لوگوں کے ناموں سے جب آپ انگلش کا پردہ اٹھائیں گے تو نیچے سے ان کے دقیانوسی نام ننگے ہو جائیں گے اس لئے جو بات آپ اپنی زبان میں کریں تو ڈنڈے سوٹے چل جائیں، وہی انگلش میں کریں تو کوئی برا نہ مانے گا بلکہ آپ مہذب گنے جائیں گے اور آپ کو مطلوبہ مقاصد بھی حاصل ہو جائیں گے۔

اظہار محبت کا معاملہ ہو یا ڈاکٹر کو علامات مرض بتانے کا، انگریزی ہر جگہ آپ کی مدد کرے گی۔ Rape (ریپ) کے لفظ کو ہی لے لیں۔ آپ اسے خواتین و حضرات کی محفل میں بلا دھڑک استعمال کریں، کوئی آپ کو نہیں ٹوکے گا لیکن اگر آپ نے غلطی سے بھی اس کا ترجمہ کر دیا تو کئی حضرات کی آنکھیں اور خواتین کے کان سرخ ہو جائیں گے۔ اگر کہا جائے کہ فلاں کی لڑکی نے گھر سے بھاگ کر آشنا سے شادی کر لی تو سب تھو تھو کریں گے لیکن اگر کہا جائے گا کہ ان کی لڑکی نے کورٹ میرج کر لی تو ان کی ذرا بھی بے عزتی نہ ہو گی بلکہ لوگ لڑکی کی معاملہ فہمی اور سمجھ داری کی داد دیں گے۔ گویا انگلش بھی پردے کی طرح ہے جو ہم اپنی زبان پر چڑھا کر من مانی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کسی کو پتا نہیں چلے گا، ان فنکار لڑکیوں کی طرح جو پردہ کرتی بھی ہیں تو بے پردگی کے لئے اور وہ بھی صرف اپنوں کے سامنے--- انگلش اب بین الاقوامی زبان بن چکی ہے لیکن یہ اپنے بولنے والوں کی طرح بے حیا ہے اور بدلحاظ بھی کیونکہ اس میں کسی قسم کے ادب آداب یا حفظ مراتب کی گنجائش نہیں۔ بڑا ہو یا چھوٹا، عام آدمی ہو یا خاص، اردو میں تو آپ یا تم سے تمیز کر لی جائے گی لیکن انگلش میں دونوں کے لئے ہی you استعمال ہو گا۔ انگلش عربی کی طرح جامع بھی ہے کزن (cousin) کے لفظ کی ہی مثال لے لیں۔ اس ایک لفظ میں اردو کے آٹھ دس قسم کے طویل و عریض رشتے آ جاتے ہیں حتیٰ کہ اگر کوئی رشتہ نہ ہو تو پھر بھی یہی لفظ کام آتا ہے اور اب تو ہمارے ملک میں بھی نرسری سے مکمل انگلش میڈیم کا آغاز ہو رہا ہے۔ انگلش تو عرصے سے جاری ہے اب تو شاید اردو بھی انگلش میں پڑھائی جانے لگے۔ ممکن ہے، یوں اردو واقعی قومی زبان کا درجہ حاصل کر لے جو کہ اب تک نہیں کر سکی اور اس بات پہ اب ہنسی تو کیا، رونا بھی نہیں آتا کہ ہماری قومی زبان تو اردو ہے لیکن ترسٹھ سال سے نظام مملکت انگریزی سے چل رہا ہے اور وہ بھی اس ملک میں جہاں درست اردو بولنے والے بھی خال خال پائے جاتے ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا بھی ہے کہ حکومت نے اس قومی منافقت کو ختم کرنے کا سوچا ہے۔ ہم حکومت کو اس پر داد دیتے ہیں اور عوام کے لئے تو دعا ہی کی جا سکتی ہے کہ اب انہیں انگریزی کے ساتھ ہی گزارا کرنا پڑے گا جیسے لوگ بیویوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

☆☆

میڈ اِن....؟؟؟

سید بدر سعید

میں شہر کی معروف مارکیٹ میں کھڑا حیرت کے عالم میں اپنے اِرگرد دیکھ رہا ہوں لوگ جوق در جوق خریداری کرنے آ رہے ہیں۔ اس قدر شور ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ایک طرف ایک بہت بڑی سکرین نظر آ رہی ہے جس پر لکھا ہے ''دل برائے فروخت'' اِسے سمجھ نہیں پا رہا کہ یہ لوگ کس کا دل بیچتے ہیں گائے، بکری کا یا انسان کا؟ مجھے اس قدر حیرت ہوئی کہ میں اندر چلا گیا ہر طرف دل ہی دل سجے ہوئے تھے۔ میں نے دوکاندار سے کہا کہ بھائی! ایک دل دکھانا وہ اس نے اپنے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ سجاتے ہوئے پوچھا کہ جناب! کون سے والا۔ جاپان کا یا چائنہ کا؟

''کیا مطلب' کیا دل پر بھی میڈ اِن چائنہ کی مہر لگ چکی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی جناب---!'' اس نے مسکرا کہا۔ ''یہ جاپان والا ہے اس کی پانچ سال کی گارنٹی ہے اور یہ والا چائنہ کا ہے، یہ جو شوکیس میں لگا ہوا ہے۔ یہ اتنا سستا ہے کہ اس سے بچوں کا چابی والا کھلونا زیادہ مہنگا؟''

اچانک میری نظر ایک کونے میں پڑی' یہاں ایک عجیب سا دل موجود تھا۔ ''یہ والا دکھائیں' اس کی کیا قیمت ہے؟''

''صاحب! یہ نہ لیں' یہ ایک دن سے زیادہ نہیں چلتا۔'' دوکاندار نے کہا۔

''کیوں---'' میں نے استفسار کیا۔

''جناب! یہ پاکستانی ہے---دیکھنے میں خوبصورت لگتا ہے مگر صرف ویلنٹائن ڈے والے دن کے لیئے ہے کیونکہ اس میں کھوٹ بھرا ہوا ہے۔ دھوکہ بازی اور فراڈ کی وجہ سے یہ ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔''

میں بددل ہو کر دوکان سے باہر نکل آیا اور سامنے ایک دوسری دوکان میں داخل ہو گیا۔ یہاں دماغ بکتے تھے میں نے لمبی چوڑی تفصیل پوچھنے کی بجائے جاتے ہی کہا۔

''بھائی! پاکستانی دماغ ہے؟''

''جی' جناب! مگر بلیک میں ملے گا۔'' دوکاندار نے مکارانہ انداز میں کہا۔

''کیوں' اس میں ایسی کیا خوبی ہے؟'' میں نے حیرت کے عالم میں پوچھا۔

''سر! پاکستانی دماغ اندر سے خالی ہے' اس میں صرف بھوسا ہے لہٰذا آپ کے پاس یہ سہولت ہو گی کہ بھوسا نکال کر کسی بھی ملک کا دماغ فٹ کروا سکتے ہیں البتہ اگر میڈ اِن چائنہ دماغ لینا ہو تو وہ ختم ہو چکے ہیں اور میڈ اِن جاپان کے بھی دو چار ہی بچے ہیں---''

میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر باہر آ گیا' اس سے اگلی دوکان میں ایک صاحب آواز لگا رہے تھے کہ ہمارے ہاں میڈ اِن چائنہ سستے رشتے موجود ہیں' اس کے علاوہ میڈان جاپان کے گارنٹی شدہ رشتے بھی کروائے جاتے ہیں البتہ پاکستانی جہیز زدہ رشتے ایڈوانس معذرت چاہتے ہیں۔ اس سے اگلی دوکان پر گردے برائے فروخت کا اعلان ہو رہا تھا میں نے دوکاندار سے پوچھا۔

''بھائی! آپ کے پاس میڈ اِن جاپان اور میڈ اِن چائنہ کے گردوں کی کتنی ورائٹی ہے؟''

ان صاحب نے ہمیں سر سے لے کر پاؤں تک گھورا اور گویا ہوئے۔ ''میڈ اِن جاپان اور میڈ اِن چائنہ گردے فروخت کرنا منع ہے لہٰذا ہم صرف پاکستانی گردے فروخت کرتے ہیں---''

میں آگے بڑھنے لگا تو اس دوکاندار نے بازو سے پکڑ کر روک لیا اور بولا ''صاحب! ایک بار دیکھیں تو سہی۔ یہ محنت کشوں کے گردے ہیں۔''

میں اس پوری مارکیٹ میں گھوما مگر میں جہاں بھی گیا' وہاں میڈ اِن جاپان اور میڈ اِن چائنہ اشیا ہی فروخت ہوتے نظر آئیں۔ البتہ جہاں ناقص اشیا کی بات ہو تو پاکستانی اشیا کا نام سامنے آ جاتا۔ دل، گردے، دماغ اور نہ جانے کیا کیا تھا' جس پر میڈ اِن چائنہ لکھا ہوا تھا---اچانک کسی نے مجھے ٹکر ماری میں ہلکا سا لڑکھڑایا اور ساتھ ہی ہوش کی دنیا میں آ گیا---میں شہر کی معروف مارکیٹ میں کھڑا ہوں جہاں ہر طرف میڈ اِن چائنہ کی الیکٹرونکس اشیا فروخت ہوتی دیکھ کر خیالوں کی دنیا میں کھو گیا تھا۔ میڈ اِن چائنہ ہمارے دماغوں پر ایک آسیب کی طرح بیٹھا ہوا ہے مجھے تو لگتا ہے کہ مستقبل میں مردے کو میڈ اِن چائنہ کا کفن پہنانا باعث برکت سمجھا جائے گا۔ قبر پر نام کی جگہ میڈ اِن چائنہ لکھوایا جائے گا۔ اب بھی وقت ہے' ہمیں سنبھلنا چاہیے ورنہ حالات تو کچھ ایسے لگتے ہیں کہ اگلے دو سال بعد جو بچہ پیدا ہو گا' اس کے ماتھے پر بھی ہم میڈ اِن چائنہ کا لیبل چسپاں کر دیں گے کیونکہ اب ہمارا اپنے ملک کی اشیا پر سے اعتبار ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اہل وطن تو خودکشی کرتے وقت بھی یہ ہی کوشش کرتے ہیں کہ جو زہر خریدا جائے اس پر میڈ اِن جاپان کی مہر لگی ہو' چاہے وہ کسی پٹھان نے گھر بیٹھ کر ہی کیوں نہ لگائی ہو مگر ہو میڈ اِن جاپان کیونکہ میڈ اِن پاکستان والے زہر کے متعلق بھی عام خیال یہی ہے کہ اس سے انسان تو دور' چڑیا بھی نہیں مرتی البتہ اگر پہلوانوں کو کھلا دیا جائے تو وہ ضرور کشتی جیت جاتے ہیں۔

☆☆

بیوی سے پیار کرنا لازم ہے--- یہ بھی مت دیکھو کہ وہ کس کی بیوی ہے 😊 شاہد اطہر

😊 میل ملاقات اِنسانی زندگی کا ایک نہایت اہم پہلو ہے۔ مختلف ملاقاتوں کے اِنسانی ذہن و دِل پر مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں جبکہ سب سے ''سریع الاثر'' ملاقات غالباً محبّ اور محبوبؔ کا آمنا سامنا ہی ہے---

پھول ہی پھول کھل اُٹھے میرے پیمانے میں
آپ کیا آئے بہار آگئی مے خانے میں
وہ آئے بزم میں اِتنا تو میر نے دیکھا
پھر اِس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی
روشنی بن کے محفل میں آپ آ گئے
اَب چراغوں کی کوئی ضرورت نہیں

لیکن قطع نظر اِن سب ملاقاتوں کے ایک ملاقات ایسی بھی ہے کہ جس کی جانب غالباً ابھی تک بھی آپ کا دھیان نہ گیا ہوگا اور صاحبو! اُسی نویکلی ملاقات کا تذکرہ اَب ہم آپ کے روبرو کرنے جا رہے ہیں۔ دو زنخے --- جی ہاں دو زنخے جب باہم ملتے ہیں تو اُن کا ''باہمی دلچسپی کے اُمور پر تبادلہ خیال'' کس طرح کا ہوتا ہے؟--- آیئے ملاحظہ کیجئے---

یہ گوٹے دار لہنگا نکلوں جب ڈالے کے
چھریاں چل جائیں میری متوالی چال پہ

ایک ''آفت جہان'' اپنے تیئں ترنم کے دریا لنڈھاتی' کمر لچکاتی' پراندہ گھماتی ہر قدم پہ اِک نیا فتنہ جگاتی بائی روڈ چلی جا رہی تھی کہ اچانک ویسی ہی ایک ''آئٹم'' یک بارگی پیچھے سے اُس پر حملہ آور ہوئی اور خوب کس کے اُسے لپٹا لیا تو پہلی کا نام نہاد ترنم شاپ ہوا اور بعد از نظم' نثر کا آغاز ہوا۔

''ہائے ہائے ری کم بختی ماری ''قطرینہ'' ری تو---؟''

''ارے تو ہاں' یہ مَیں ہی ہوں۔ میری ''کرینہ!''--- بھلا کوئی اور کیا تجھ سے یوں بے تکلف ہو سکتا ہے۔'' ذرا سانس لے کر مزید کہا۔ ''تیری مرضی کے بغیر---''

کرینہ تنک کر بولی۔ ''ارے تو ہاں' کس کی مجال ہے جو چھنے کی اِس بند کلی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے---''

قطرینہ نے بھی تالی چھاپ کر کہا۔ ''اچھا چل اَب اپنی تعریفوں کا ''ایف ایم'' بند کر اور یہ بول کہ اِتنے دِن سے کہاں دفعان تھی' نظر کیوں نہیں آئی؟''

جواباً کرینہ نے بھی ایک زوردار تالی کھڑکائی اور بولی۔ ''آئے مَیں کراچی گئی تھی--- اری بڑا مزہ آیا۔ میرے کو وہاں لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جیسے ہی مَیں ایک بازار میں گھسی' بس پھر کیا تھا---

بھر گیا منڈیاں نال بازار

''پھر کیا ہوا---؟'' قطرینہ نے ٹھمکا مار کر پہلو بدلا۔

''کرینہ نے تالی چھاپ کر کہا۔ ''مَیں ایک دوکان کے سامنے سے گزری تو پیچھے سے آواز آئی'

بہت خوبصورت ہے میرا صنم--- مَیں نے اڈی مار کر تالی بجائی اور گھور کر اُسے دیکھا تو دوکاندار کا دوست جو اُس کے پاس ہی بیٹھا تھا' ہنس کر بولا کہ خدا ایسے مکھڑے بناتا ہے کم--- مَیں نے پراندے کو گھما کر پیچھے مارا اور چل پڑی۔ ایک بار پھر آواز آئی---

قیامت جگاتے ہیں تیرے قدم۔

مَیں نے گھوم کر دونوں کو غصے سے دیکھا اور جھک کر اپنا سینڈل ٹھیک کرنے لگی۔ یہ دیکھ کر اُن دونوں میں سے پھر ایک بولا---

دھنک ٹوٹ آیا بدن میں جو خم

مَیں غصے سے لال پیلی ہوتی ہوئی اِن کی طرف بڑھی لیکن میرا پیر شلوار کے پائینچے میں پھنسا اور مَیں ایک منٹ کو رُکی تو اُن میں سے پھر ایک بولا---

جہاں چلتے چلتے قدم رُک گئے ہوں
سمجھ لو بہاروں کی منزل وہیں ہے

مَیں پائینچے سے پاؤں پرا کر ان تک پہنچی اور تنک کر پوچھا کہ تمھیں مجھ میں کیا نظر آ گیا ہے؟ جواب میں دوکاندار بولا---

خدا کی قسم' تو جہاں سے حسیں ہے

یہ سن کر مَیں شرمائی تو اُس کا دوست بولا---

کوئی دوسرا تجھ سا ممکن نہیں ہے

مجھے اور زیادہ حیا آئی اور مَیں نے لجا کر پوچھا کہ اِس کا ثبوت کیا ہے؟ دوکاندار بولا---

بنا کر مصوّر نے توڑا قلم

😊 سرِ راہ اگر دو شناسا مل جائیں اور اتفاق سے دونوں بہرے بھی ہوں تو اُن کی گفتگو کا آغاز و انجام کس طرح سے ہوتا ہے' یہ بتائیں گے آپ کو سیّد ضمیر جعفری---

اِس نے کہا' آداب کرتا ہوں' کہو کیا حال ہے
اُس نے کہا' تھیلے میں دو رومال ہیں' اِک تھال ہے
اِس نے کہا' اِنسان میں کچھ ذوق ہمدردی بھی ہے
اُس نے کہا' ہم کیا کریں' کھانسی بھی ہے' سردی بھی ہے
اِس نے کہا' کچھ پیٹ بڑھ آیا ہے پچھلے سال میں
اُس نے کہا' بریگیڈیئر گلزار ہیں چکوال میں
اِس نے کہا' اِس وقت شاید قصد ہے بازار کا
اُس نے کہا' بارہ بجے' دِن ہو مگر اتوار کا
اِس نے کہا' منجھلے چچا کیا اَب ہیں ملتان ہیں
اُس نے کہا' کچھ درد سا رہتا ہے بائیں کان میں
اِس نے کہا' بیمار ہے بیگم گزشتہ رات سے
اُس نے کہا' اچھی کہی' دِل خوش ہوا اِس بات سے
اِس نے کہا' انگلینڈ سے افسر کا تار آیا نہیں
اُس نے کہا' پھر تو کہیں اُن کو بخار آیا نہیں
اِس نے کہا' امشب رسیلا رقص جم خانے میں ہے
اُس نے کہا' طفل جواں' گھر میں ہے یا تھانے میں ہے
اِس نے کہا' کیا آپ کو اپنی جوانی یاد ہے
اُس نے کہا' ہاں یاد ہے اور منہ زبانی یاد ہے

😊 روزہ رکھ کر اپنے جعفری صاحب کس کیفیت سے دو چار ہوئے؟ لگے ہاتھوں یہ روئیداد بھی ہو جائے---

مجھ سے مت کر کچھ گفتار' مَیں روزے سے ہوں
ہو نہ جائے تجھ سے بھی کچھ تکرار' مَیں روزے سے ہوں
ہر کسی سے کرب کا اِظہار' مَیں روزے سے ہوں
دو کسی اخبار کو یہ تار' مَیں روزے سے ہوں
میرا روزہ اِک بڑا احسان ہے لوگوں کے سر
مجھ کو ڈالو موتیوں کے ہار' مَیں روزے سے ہوں
مَیں نے ہر فائل کی ''ڈیچی'' پر یہ مصرع لکھ دیا

کام ہو سکتا نہیں، سرکار! مَیں روزے سے ہوں
اے میری بیوی! میرے رستے سے کچھ کترا کے چل
اے میرے بچو! ذرا ہوشیار، مَیں روزے سے ہوں
شام کو بہر زیارت آ تو سکتا ہوں، مگر
نوٹ کر لیں دوست رشتہ دار، مَیں روزے سے ہوں
تو یہ کہتا ہے بہ لحن تر کوئی تازہ غزل
میں یہ کہتا ہوں کہ برخوردار، مَیں روزے سے ہوں

☺ دُعا بہار کی مانگی تو اِتنے پھول کھلے
کہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے میں

اِس شعر کے مصداق آپ دوستوں، ساتھیوں کے ایس ایم ایس کی الحمدللہ وہ بارش ہوئی تو مجبوراً ہمیں نگاہ اِنتخاب کے پہلے حصے کو خاصا مختصر کرنا پڑا اور لگتا یہی ہے اور قرائن یہی کہہ رہے ہیں کہ کالم کے پہلے حصے کو ہمیں بالائے طاق رکھنا پڑے گا لیکن جب تک گنجائش باقی رہی، یہ سلسلہ اِن شاءاللہ چلتا رہے گا اور صاحبو! اَب آپ کے پُرلطف ایس ایم ایس کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے ایک نہایت ضروری کام ہے جو ہم نے اور آپ نے حل کرنا ہے۔ ایک دُعا ہے جو آپ سب نے بہت ''دردمندی'' سے کرنی ہے اور اِس دُعا کے اختتام پر نہایت سچے دِل سے آمین بھی کہنا ہے۔ اِس دُعا کے لئے ہمیں سب سے پہلے عاصم محمود اور اِس کے فوراً بعد سیّد محمود گیلانی نے کہا ہے اِن دوستوں کا فرداً فرداً کہنا یہ ہے کہ یہ دُعا میرے لئے نہیں بلکہ میری امی کے لئے ہے اور دُعا کچھ یوں ہے۔

''یااللہ میری امی کو جلد از جلد ایک بہت اچھی بہت خوبصورت سی بہو عطا فرما۔''

سب مل کر آمین کہیئے۔

خالد بن حامد المعروف خالد بھائی کا معاملہ بھی بہت عجیب ہے۔ خود آپ جناب تو ڈھیروں ڈھیر خواب دیکھتے ہیں لیکن ''ہما شما'' کے لئے اُنہوں نے ''آرڈیننس'' جاری کر رکھا ہے کہ ''ابھی یہ خواب مت دیکھو'' البتہ مذکورہ ''حکم نامے'' میں یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ اگر کوئی ''حرماں نصیب'' یہ حرکت کر بیٹھے تو وہ کس سزا کا سزاوار ہوگا؟ علاوہ ازیں سب جانتے اور مانتے ہیں کہ غزلے اور دوغزلے لکھنا اپنے خالد بھائی کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے لیکن اِس ''مشقِ سخن'' میں بسا اوقات کچھ دلچسپ صورتحال بھی درپیش آ جاتی ہے ایسا ہی ایک واقعہ خالد بھائی کے ساتھ پیش آیا کہ جسے اگر شاعری کی ''حدود قیود'' میں لایا جائے تو وہ کچھ یوں ہوگا---

دو بجے تھے رات کے ہر سمت تھا گہرا سکوت
اور مَیں فرما رہا تھا شوق سے مشقِ سخن
جاگ اُٹھی بیگم اچانک، چیخ کر اُس نے کہا
''تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن''

☺ خاصی دھکم پیل کے بعد بالآخر اپنے خادم حسین مجاہد اپنے قلمی نام ''کے ایچ مجاہد'' پر متفق ہو گئے ہیں اور اُن کے اِس اتفاق سے ہمیں بھی مکمل اتفاق ہے۔ خادم حسین---اوہ سوری، کے ایچ مجاہد کی پھلجھڑیاں ملاحظہ ہوں۔

☆ بیوی نے لجاتے بل کھاتے ہوئے شوہر سے پوچھا۔
''سنو جی! جب آپ نے میرا گھونگھٹ اُٹھایا تھا تو کیسا محسوس کیا تھا؟''
شوہر بولا۔ ''قسم اللہ کی، مَیں مر جاتا اگر---اگر مجھے آیت الکرسی یاد نہ ہوتی۔

☆ بیوی: مَیں اگر مر گئی تو کیا آپ تاج محل جیسی کوئی یادگار بنائیں گے؟
خاوند: ہاں بالکل، کیوں نہیں بلکہ جان! مَیں نے تو پلاٹ بھی لے کر ڈال رکھا ہے، دیر تو صرف تمہاری طرف سے ہو رہی ہے۔

☆ ......کے ایچ مجاہد، سرگودھا

☺ چاند کے سیماب صفت نوجوان لکھاری سیّد بدر سعید کو چلبلے جملے لکھنے کا ہنر آتا ہے، نہ صرف جملے بلکہ یہ ''البیلا'' تو اچھا مصرع بھی لکھ لیتا ہے---

اِس قدر بھی وفائیں اچھی نہیں
پل پل کی دُعائیں اچھی نہیں
ہتھیلی پہ اور نہ ڈھونڈو ہمیں
بنتی مٹتی ریکھائیں اچھی نہیں

بدر کی دو چار تحریریں پڑھنے کے بعد اچانک ہی ایک دِن ایک تحریر کے ساتھ جب ''بدر بھائی'' کی تصویر بھی شائع ہوئی تو اِس اشاعت نے تو مانو ہمیں اُچھال کے رکھ دیا---ہیں، اِس کم سنی میں یہ تحریری لچھن؟ بے اختیار جی چاہا کہ بدر کی اُنگلی تھام کر بازار لے جائیں اور ''چیز'' دلا کر لائیں لیکن صاحب! بدر تو خود ایک بڑی ''چیز'' ہے---بدر کے منتخب ایس ایم ایس یہ رہے۔

☆ ایک سردار دوسرے سے: یار یہ جوڑے کہاں بنتے ہیں؟''
دوسرا: آسمان پر---!''
پہلا: اوشٹ، یار! مَیں تو درزی کو دے آیا ہوں۔''

☆ سردار: مَیں اور میری گرل فرینڈ شادی کر رہے ہیں۔
دوسرا: (اشتیاق سے) اچھا، کب---؟''
پہلا: میری سات اکتوبر اور اُس کی 13 نومبر کو شادی ہے۔

☆ اِس خوف سے موٹر سائیکل ہی بیچ دی ''فراز''
خود کو نہ بیچنا پڑے پٹرول کے لئے

☆ مجھے اپنی محبوبہ سے ملنے کا بہت شوق تھا
اُسے قریب سے دیکھنے کا بڑا شوق تھا
ایک دِن لکھ دیا خط اُس کو صبر کر کے
دِل میں مارے ارمانوں کی قبر کر کے
بھولی بھالی تھی، سمجھ نہ سکی میرے پیار کو
دے دیا خط اپنے بھائی گلزار کو
مَیں نے دریا کی اِک بڑی موج دیکھی
جب اپنے پیچھے گلزار کی فوج دیکھی
اُن کے مارنے سے جسم سے ساز نکل رہے تھے
منہ سے اگلے پچھلے راز نکل رہے تھے
لوگوں نے کہا، کس پہ عذاب آیا ہے
دِل نے کہا، خط کا جواب آیا ہے

☆ ......سیّد بدر سعید، لاہور

☺ ہماری آپ کی سب کی تحریروں کو کمپیوٹر میں ''ڈال'' کر ''باہر'' نکالنے والے بھی اپنے مصوّرامین ہی تو ہیں۔ چاند کے آفس میں اکثر مصوّرامین سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ مصوّرامین 10 مارچ 2008ء کو بیگم کو پیارے ہوئے ہیں، اِس انکشاف پر بے ساختہ ہی ہمارے لبوں تک وہ سوال آن پہنچا کہ جس کا سامنا ہر نو بیاہتا جوڑا اپنی شادی کے کچھ عرصہ بعد کرتا ہے لیکن ہم نے ''جا چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر'' کے مصداق وہ سوال نہ کیا کہ کہیں ''منڈا شہر لاہور دا'' جھینپ ہی نہ جائے---مصوّرامین کے ''چوز کردہ'' ایس ایم ایس دیکھیے۔

☆ سردار جی اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنا رشتہ دیکھنے گئے۔ لڑکی والوں نے سوچا، دونوں کو تنہا چھوڑ دو تا کہ کچھ بات چیت کر لیں۔ تنہائی پاتے ہی سردار جی گویا ہوئے۔ ''بہن جی! آپ کتنے بہن بھائی ہو؟''
لڑکی بھنا کر بولی۔ ''پہلے تین تھے، اَب چار ہو گئے ہیں۔''

☆ فری، فری، فری---ناشتہ فری، لنچ فری، ڈنر فری۔ یہاں تک کہ چائے بھی فری بس فقط داتا دربار جانے کی دیر ہے---بھاگ بھاگ جاؤ، رج رج کے کھاؤ۔

☆ ......مصوّرامین (اِنچارج کمپوزنگ)
0300-4599803

☺ اٹھارہ سالہ نومی ماشاءاللہ حفظ قرآن کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ میٹرک کے درجے کو پہنچتے ہوئے نومی کو گھومنے پھرنے کے علاوہ sms کی ''آرجار'' بہت بھاتی ہے۔ نومی شریر بھی بے حد ہیں۔ نومی کا

صرف ایک sms ہی آپ کو اِن کی شرارتوں کا لیول بتا دے گا۔ نومی نے بذریعہ sms گلاب کا ایک نہایت تروتازہ پھول بھیجا اور ساتھ ہی یہ گزارش بھی کہ کہ اِس بے مثل پھول کو مرجھانے سے بچانے کے لئے اپنے موبائل کو ہمیشہ پانی کے بھرے ہوئے گلاس میں رکھیں۔

☆ سردار جی روز اپنے کچن میں جاتے، شوگر باکس کھولتے اور بند کر کے رکھ دیتے۔ گھر والوں نے پوچھا تو گویا ہوئے۔ ''ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اپنی شوگر روزانہ چیک کرنی ہے۔''

☆ کیا آپ جانتے ہیں کہ جب گلاس ٹوٹتا ہے تو کیا آواز آتی ہے؟ --- ڈز؟ نہیں --- ٹھاہ؟ نہیں --- ٹھش؟

''ارے نہیں بابا! امی کی آواز آتی ہے --- گدھا کہیں کا! کیا توڑ دیا ہے؟''

☆ ایک چیونٹی کو گڑ کا ایک ٹکڑا ملا۔ وہ اُسے کھانے ہی لگی تھی کہ اُس کی نظر ایک چیونٹے پر پڑی تو وہ گڑ کو چھوڑ کر فوراً چیونٹے کی طرف لپکی --- بتایئے تو بھلا کیوں؟ --- کیونکہ ''گڑ نالوں عشق مٹھا''

☆ بٹ صاحب کی کار کے پیچھے لکھا تھا ''ساون کو آنے دو'' --- پیچھے سے ایک ٹرک آیا اور اُس نے کار کو ''ٹھونک'' دیا۔ ٹرک کے پیچھے لکھا تھا ''آیا ساون جھوم کے''

☆ ......نعمان ممتاز نومی، اعوان ٹاؤن لاہور

☺ دیگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ سیّد محمود گیلانی کا پریٹو بھی بے حد ہیں۔ ایک شام جبکہ ہم آٹے کے ماضی، حال اور مستقبل کا خوب عمیق نظری سے جائزہ لے رہے تھے، محمود نے بذریعہ ایس ایم ایس آٹے کا ایک بھرا ہوا ٹرک بھیجا جس پر جلی حروف میں ''فائن آٹا'' لکھا تھا، ساتھ ہی موصوف نے ہمیں فری ہینڈ بھی دیا کہ جتنے ''توڑے'' اُتار سکتے ہو، اُتار لو۔ پھر نہ کہنا کہ آڑے وقت میں کام نہیں آیا۔ سو صاحبو! محمود کی اِس ''دریادِلی'' کے باعث ہم تو اِک طویل عرصہ تک کے لئے آٹے کی فکر سے آزاد ہیں۔ آپ کو بھی اگر اِس فکر سے چھٹکارہ پانا ہے تو محمود صاحب سے ''بنا'' کر رکھیں اور آٹے کا ''نکوں تک'' ٹرک پائیں --- اَب اِن کے کچھ ایس ایم ایس۔

☆ ٹیچر: بتاؤ تم بڑے ہو یا تمہارے پاپا؟

سٹوڈنٹ: سر! میں بڑا ہوں۔

ٹیچر: وہ کیسے؟

سٹوڈنٹ: سر! میں نے ماما کے ساتھ سونا چھوڑ دیا، پاپا نے نہیں چھوڑا۔

☆ شوہر: اگر میں مر گیا تو کیا تم دوسری شادی کر لوگی؟

بیوی: نہیں میں اپنی بہن کے ساتھ رہ لوں گی --- اور ایسی صورت آپ کیا کریں گے؟

شوہر: میں بھی تمہاری بہن کے ساتھ رہ لوں گا۔

☆ مَیں نے کہا، دِلربا --- اُس نے کہا، بیلنس بھیجو! --- مَیں نے کہا، پیسے نہیں --- اُس نے کہا، کیسے نہیں؟ --- مَیں نے کہا، مہنگائی ہے --- اُس نے کہا کہ جا، آج سے تو میرا بھائی ہے۔

☆ 1995ء کی لڑکی ---

اگر تم مل جاؤ، زمانہ چھوڑ دیں گے ہم

2008ء کی لڑکی ---

اگر تم مل جاؤ، پرانا چھوڑ دیں گے ہم

☆ ......سیّد محمود گیلانی، راولپنڈی

0314-5592635

☺ شعبان کو غالباً شادی کا اِتنا شوق نہ ہوگا جتنا کہ اُنہیں شاعری کا شوق ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک شعر شعبان کی زنبیل میں موجود ہے ---

ٹوٹ کر چاہا جسے وہ لوٹ کر آیا نہیں
میرے دِل کو اُس کے سوا اور کوئی بھایا نہیں
پیار کی سوداگری میں ہم برابر ہی رہے
اُس نے کچھ کھویا نہیں اور ہم نے کچھ پایا نہیں

ہمیں اپنی شاعری سے ''شرابور'' کر کے شعبان کو کشمیر یاترا کی سوجھی اور ہمیں اپنی روانگی کا سگنل دے کر شعبان کشمیر کی گل پوش وادیوں میں جا بیٹھے۔ اِدھر ہم ہیں کہ ہنوز لاہور کے ٹریفکی دھوئیں کی دھونی لے رہے ہیں --- خیر، آپ شعبان کے چھوڑے ہوئے شرلی پٹاخے ملاحظہ کیجئے۔

☆ بیوی: اچھا بتاؤ، کار میں گھماتا ہے، آئس کریم کھلاتا ہے، ریسٹورنٹ لے جاتا ہے --- بولو، بولو؟

خاوند: کون میں ---؟

بیوی: نہیں، ہمارا نیا پڑوسی!

☆ ٹیچر: پپو لڑکیوں میں دِلچسپی نہیں رکھتا --- بتاؤ، اس "Sentence" میں پپو کیا ہے؟

سٹوڈنٹ: سر! پپو پٹھان ہے۔

☆ کنجوسی کا مطلب کیا؟ نہ sms کر، نہ کال ملا۔ پڑھ پڑھ sms ہنستا جا۔ میری کر نہ کوئی پرواہ۔ میرا بیلنس روز مکا، اپنے سیٹ کو تالا لگا۔

☆ ایک مراثی نے چوہدری کی بیٹی کا رشتہ مانگا چوہدری نے مراثی کو خوب مارا، مار کھا کر مراثی اُٹھا اور کپڑے جھاڑتا ہوا بولا۔ ''تو پھر میں انکار ہی سمجھوں؟''

☆ ......سیّد شعبان گیلانی، راولپنڈی

0302-5025393

☺ کتنے دِن ہو گئے، کتنے ہفتے گزر گئے۔ بات مہینوں تک جا پہنچی۔ اَب سال ہونے کو آیا ہے، اَب تو کہا مان لو۔ چلو ضد نہ کرو، بس اَب جلدی سے نہا لو۔''

☆ مجھے اُداس دیکھ کر اُس نے کہا کہ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی دُکھ نہیں دے سکتا۔ پھر ہوا بھی ایسا ہی --- بعد میں جتنے بھی دُکھ ملے، سب اُسی کے دیئے ہوئے تھے۔

☆ ......محمد آصف (چار چکری) بہاولپور

☺ تجریدی آرٹ کی نمائش میں ایک چھوٹا سا لڑکا ایک تصویر کے سامنے رُکا اور اپنی ماں سے بولا۔ ''امی! اِس تصویر میں کیا ہے؟''

''ماں نے بہت غور سے تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ مصوّر اِس میں چرواہے اور گھوڑے کو دکھانا چاہتا ہے۔''

''تو پھر اُس نے دِکھایا کیوں نہیں ---؟'' بچے نے پوچھا۔

☆ ......ایم ایس

☺ دو زخمی باتیں کرتے ہوئے جارہے تھے کہ اچانک ایک گر گیا اور زور زور سے رونے لگا تو دوسرے نے اُسے تسلی دیتے ہوئے۔

''اُٹھ فرزانہ مرد رویا نہیں کرتے۔''

☆ 12 سے 20 سال کی لڑکی فٹ بال کی طرح ہوتی ہے۔ ایک پیچھے 22 ہوتے ہیں اور 21 سے 30 سال کی لڑکی کرکٹ بال کی طرح ہوتی ہے کہ ایک کے ہاتھ آتی ہے تو باقی تالیاں بجاتے ہیں۔

☆ بچہ: امی آج ابو نے بس میں مجھے کہا کہ آنٹی کو بیٹھنے کے لئے اپنی جگہ دے دو۔

ماں: تو پھر تم نے جگہ دی؟

بچہ: نہیں ماما! کیونکہ میں تو خود ابو کی گود میں بیٹھا تھا۔

☆ ......محمد فیضان، ہری پور ہزارہ

0334-9649684

☺ ٹرین میں ایک مچھر ایک چائنیز کے بازو پر بیٹھا تو وہ اُسے پکڑ کر کھا گیا۔ اِسی طرح ایک اور مچھر جب چائنیز کے قریب بیٹھے شیخ صاحب پر بیٹھا تو شیخ نے مچھر کو پکڑ کر چائنیز سے پوچھا، خریدو گے؟

☆ خاوند: اللہ نے تمہیں دو آنکھیں دی ہیں، چاولوں سے پتھر نہیں نکال سکتی ہو؟

بیوی: اللہ نے تمہیں 32 دانت دیئے ہیں، دو چار پتھر چبا نہیں سکتے؟

☆ ایک صاحب اپنی بیوی کو دفنا کر جیسے ہی گھر پہنچے تو بادل بہت زور سے گرجا، بجلی بہت زور سے کڑکی اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلادھار بارش شروع ہوگئی وہ صاحب آسمان کی طرف دیکھ کر بولے---"لگتا ہے پہنچ گئی۔"

☆ یہ دوست بھی بہت عجیب ہوتے ہیں۔ دینے پہ آئیں تو جان دے دیں، لینے پہ آئیں تو ہنسی تک چھین لیں۔ کہنے پہ آئیں تو دل کے خانوں کے تمام راز کہہ دیں، چھپانے پر آئیں تو یہ تک نہ بتائیں کہ خفا کیوں ہیں۔ ناراض ہونے پہ آئیں تو سانس تک نہ لینے دیں، ماننے پر آئیں تو اپنی سانسیں تک وار دیں بس حاصل کلام یہ کہ دوست زندگی میں نہیں ملا کرتے بلکہ زندگی دوستوں میں ملا کرتی ہے۔

☆......ارتقاء

😊 لڑکیوں کے سر سے چادر بے حیائی لے اُڑی
آنکھ کا پردہ ہوائے خودنمائی لے اُڑی
دُختر مشرق کو مغرب آشنائی لے اُڑی
اِس کھلی بے پردگی کا کون ذمہ دار ہے؟

☆

سمیرا اور حمیرا کو کیا تکلیف ہے، فراز
کیوں نہیں بیٹھتیں یہ آخر ٹک کر

☆......ٹونی کھنہ، لاہور

😊 مجھے مٹی کے گھر بنانے کا شوق تھا
اُسے آشیانے گرانے کا شوق تھا
مَیں خود سے روٹھ جاتا ہوں اکثر اِس لئے
مجھے روٹھے ہوئے لوگ منانے کا شوق تھا
اُسے وعدوں کی پاسداری پسند نہ تھی
لیکن مجھے وعدے نبھانے کا شوق تھا
میں مصروف تھا تنہائیوں کی تلاش میں
اُسے لوگوں سے ملنے ملانے کا شوق تھا
وہ بے وفا تھا، اِس میں حیرت کی ہے بات کیا
مجھے بھی بے وفا لوگوں سے دِل لگانے کا شوق تھا

☆......عبداللہ خان جدون، لاہور
0321-4346399

😊 کبھی تو دِل راز اُنہیں پیار آئے گا
جان جائے گی تو اعتبار آئے گا
پھر نہ مانیں گے، جب روٹھ جائیں گے ہم
ایک دِن تو اُنہیں بھی ستائیں گے ہم
ایک دِن تو ہمیں بھی قرار آئے گا
کبھی تو دِل راز اُنہیں پیار آئے گا
ہم ملیں گے اُنہیں، وہ جدھر جائیں گے
کیسے دامن بچا کر گزر جائیں گے
راہ میں جب ہمارا مزار آئے گا
کبھی تو دِل راز اُنہیں پیار آئے گا
جان جائے گی تو اعتبار آئے گا

☆......فوزیہ بٹ، لاہور

😊 خدا کرے کہ آپ کی خوشیاں پٹرول کی قیمتوں کی طرح بڑھتی رہیں اور غموں کی سپلائی بجلی کی سپلائی کی طرح بند رہے۔

☆ ایک امیر کبیر لڑکی کو سکول میں کسی غریب خاندان پہ مضمون لکھنے کا کہا گیا۔

مضمون: ایک خاندان بہت غریب تھا، ماں غریب، باپ غریب، بچے بھی سب غریب۔ اُن کی اکارڈ کار بھی سیکنڈ ہینڈ تھی اُن کا غریب ڈرائیور غریب بچوں کو اِسی کار میں سکول چھوڑنے جاتا تھا۔ بچوں کے پاس پرانے این 95 موبائل تھے۔ بچے ہفتے میں صرف تین بار چکن کھاتے تھے۔ گھر میں صرف 4 سیکنڈ ہینڈ اے سی تھے۔ الغرض سارا خاندان بہت مشکل سے عیش کررہا تھا۔

☆......لکی ڈیئر، لاہور 0334-6297414

😊 اگر پٹھان کوئی مشروب بنائے تو اُس کا نام کیا ہوگا---سوچو، اور سوچو---نہیں آرہا کچھ سمجھ؟---چلو چھوڑو، ہم بتائے دیتے ہیں۔ وہ نام ہوگا "خوچہ کولا"

☆ رات کے ڈھائی تین بجے اپنے کسی بے تکلف دوست کو فون کیجئے۔ اُس سے نہایت خوشگوار موڈ میں بات کیجئے۔ اگر وہ خفا ہو تو اُسے بتائیے کہ ابھی ابھی علامہ اقبال میرے خواب میں آئے تھے اور وہ کہہ رہے تھے کہ "میری سوئی قوم کو جگاؤ"

☆ یہ sms صرف آپ کو خوش کرنے کے لئے ہے۔ یہ جب آپ کے پاس آئے گا تو موبائل سکرین روشن ہوگی، وہ لائٹ دیکھ کر آپ خوش ہوں گے کہ چلو، ملک میں کہیں تو لائٹ ہے۔

☆......سیمنول صدف، سرگودھا

😊 **Q. What is the difference between Biology & Sociology?**
A. If the baby looks like his father it's Biology if the baby looks like his neighbor it is Sociology.

☆ خوشخبری: جشنِ آزادی کی خوشی میں تمام جاز، وارد، ٹیلی نور، زونگ، یوفون اور پی ٹی سی ایل نیٹ ورک مس کالز فری!

☆ وہ بے وفا نہ تھا، یونہی بدنام ہوگیا محسن
ہزاروں چاہنے والے تھے، کس کس سے وفا کرتا

☆ ہم سے بات کرو اور جیتو تین انعامات---
(۱) بہت سا پیار (۲) عمر بھر کی دوستی (۳) مستقل سکونت ہمارے دِل میں۔

☆......پرنس کشمیری

😊 ساحل کی گیلی ریت پر مَیں نے اُس سے پوچھا، تیرا مشغلہ کیا ہے؟ اُس نے پلکیں جھکا کر مسکرا کر ساحل کی گیلی ریت پر میرا نام لکھا اور مٹا دیا۔

☆ اندھیرے ہیں راستے دیا لے کے جانا
میرے آنسوؤں کی ضیا لے کے جانا
تمہیں حادثوں سے بچا لے گی ہمیشہ
سنو! گھر سے ماں کی دُعا لے کے جانا

☆......فہیم صدیقی 0300-8303131

😊 اپنی زبان کی تیزی اُس ماں پر مت آزماؤ کہ جس نے تمہیں بولنا سکھایا (حضرت علیؓ)

☆......ہارون حسرت جالندھری

😊 ایک مراثی غلطی سے روزہ رکھ بیٹھا۔ دِن کے بارہ بجے اُس نے اپنے بیٹے سے کہا۔
"دیکھو، سورج ڈوبا کہ نہیں؟"
"نہیں، ابا!"
تین بجے پھر پوچھا۔ "ڈوبا---؟"
"نہیں---"
چار بجے سوال کیا۔ "ڈوبا---؟"
"نہیں بابا!"
مراثی بولا۔ "اے اج مینوں لے کے ای ڈوبے گا۔"

☆......توصیف احمد، میانوالی 0333-9835840

😊 پاکستانی عوام کی خوشیاں!
☆ بجلی جانے کے بعد بجلی کے آنے کی خوشی۔
☆ طویل ترین قطار میں لگ کر "کبھی کبھی" آٹا ملنے کی خوشی۔
☆ سارا دِن غائب رہ کر رات گیارہ بجے گیس کے آنے کی خوشی۔
☆ بازار سے شاپنگ کر کے بم بلاسٹ سے بچ کر "زندہ" گھر واپس آنے کی خوشی۔

☆ پوسٹ مین اُس بت کا خط لاتا نہیں
اور جو لاتا ہے، پڑھا جاتا نہیں
عاشقی سے کیوں ہم استعفٰی نہ دیں
ہوٹلوں کا بل دیا جاتا نہیں
رات دِن فرمائشیں زیور کی ہیں
ہم سے اَب عاشق رہا جاتا نہیں

☆......جیوا بلوچ 0334-2510895

😊سردار جی: (ریسیور اُٹھا کر) ہاں بھئی' کون بول رہا ہے؟
دوسری طرف سے: میں بول رہا ہوں۔
سردار جی: اوئے' یہ تو کمال ہی ہو گیا اُدھر سے بھی میں ہی بول رہا ہوں۔

☆تیرے چہرے پہ اُداسی آنکھوں میں نمی ہے
نیشنل نمک استعمال کر' بچے! تجھ میں آیوڈین کی کمی ہے

☆ایک لڑکا ایک لڑکی کو کھڑکی سے اشارہ کر کے کہتا ہے---
جھلک دِکھلا جا' جھلک دِکھلا جا
لڑکی چپل اُتار کر کہتی ہے---
ایک بار آ جا' آ جا' آ جا' آ جا

☆......سمیع ناظم نیازی 0313-7141320

😊پلیز' ایک پل کے لئے اپنی آنکھیں بند کر کے کھول لیں---شکریہ' اندھیرا ہے نا؟ بالکل اِسی طرح ہماری زندگی ہے آپ کے بنا---"

☆ایک آدمی: سر! میری بیوی کھو گئی ہے۔
پوسٹ ماسٹر: بھئی' یہ پوسٹ آفس ہے' تم گمشدگی کی رپورٹ پولیس میں کرو۔
آدمی: بس جی' کیا کروں۔ خوشی کے مارے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا۔

☆......وسیم حسن بابر' سکرنڈ نواب شاہ
0301-3810750

😊عصمت ضیا المعروف آپی بلکہ جگت آپی کہ جنہیں وہ بھی آپی کہتی ہیں جو "لکھت" کے میدان میں ابھی "میوں میوں" چلنا سیکھ رہے ہیں اور وہ بھی جو کہ اِس میدان میں سرپٹ دوڑتے ہیں اور اُن کے قدم ذرا نہیں ڈولتے (عاجز کو پہلی قسم میں شمار کیا جائے) آپی اِس قدر میٹھا بولتی ہیں کہ مدِمقابل اِسی دھڑکے میں مبتلا رہتا ہے کہ اِس قدر مٹھاس سے کہیں اُسے شوگر ہی نہ ہو جائے۔ درشت لہجے میں بات کرنا غالباً آپی کے بس کی بات ہی نہیں۔ اِس لحاظ سے پڑوسن کو مزہ چکھانے کا اگر مرحلہ درپیش ہو جائے تو آپی صاحبہ کیا کریں گی؟ ہم اکثر یہی سوچتے ہیں--- خیر' اِس سوچ بچار کو ایک طرف رکھتے ہوئے ایس ایم ایس کے سلسلے میں "جگت آپی" کا انتخاب دیکھتے ہیں۔

☆ایک بچہ کھیلتے ہوئے اچانک گر گیا اور زور زور سے رونے لگا۔ ماں بھاگ کر اُس کے پاس آئی اور بچے کو پیار کرتے ہوئے بولی' میں صدقے جاؤں--- بچہ یہ سن کر فوراً چپ ہو گیا اور معصومیت سے بولا کہ ماما! میں نے بھی صدقے جانا ہے۔"

☆ایک بچے کی یادداشت بہت کمزور تھی علاج کے لئے ڈاکٹر صاحب کو بلایا گیا۔ جب ڈاکٹر صاحب دوا دے کر چلے گئے تو کچھ ہی دیر بعد گھر کی کال بیل بجی پوچھا گیا' کون ہے؟--- ملازم نے جواب دیا کہ ڈاکٹر صاحب اپنا بیگ بھول گئے ہیں۔

☆ایک ٹھیکیدار کسی محکمے میں اپنا نام نکلوانے کے لئے افسر کو ایک کار پیش کر رہا تھا افسر نے متانت سے کہا۔ "بھئی' یہ تو رشوت ہو گی اور میرا ضمیر اِس کی اجازت نہیں دیتا۔"
"لیکن سنئے تو---" ٹھیکیدار نے لجاجت سے کہا۔ "میں یہ کار آپ کو مفت میں تو نہیں دے رہا ہوں۔ آپ مجھے اِس کار عوض دس روپے دے دیجئے۔ پھر تو یہ رشوت نہیں رہے گی نا' پھر تو یہ خرید و فروخت کا ایک سیدھا سادہ معاملہ ہے۔"
افسر نے چند لمحے غور کیا اور بولا۔ "ایسی صورت میں تو میں تین کاریں خریدوں گا---"

☆......عصمت ضیا

😊قاری داؤد صاحب نے نگاہِ انتخاب میں اِک نئی روایت کو جنم دیا ہے۔ ایک شام جبکہ ہم اپنی ایک نجی محفل میں شریک تھے' قاری صاحب کی فون کال موصول ہوئی اور خوب ٹائٹ قسم کی ٹھیٹھ پنجابی میں قاری صاحب نے ہمیں شرفِ کلام بخشا۔ ارشاد ہوا کہ میں ابھی ابھی نگاہِ انتخاب پڑھ رہا تھا تو سوچا' آپ کو فون کروں کیونکہ مجھے اچانک ہی ایک دلچسپ واقعہ یاد گیا ہے جو کہ تب پیش آیا تھا جبکہ میری نئی نئی شادی ہوئی تھی--- ہوا یوں کہ شادی کے کچھ دِن بعد ہی میری اہلیہ کو اپنی اماں جان کی یاد نے ستایا' نتیجتاً اُنہوں نے مجھے ستایا اور بضد ہو گئیں کہ چلیں' میری امی سے بات کروائیں۔ میں اُلفت کی پہلی پاسداری کی خاطر زوجہ محترمہ کو پی سی او لے گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ نیٹ ورک نہایت مصروف ہے۔ فون آپریٹر جو کہ میرا ایک بے تکلف واقف کار تھا' اُس نے اِس صورتحال پر ازراہِ مذاق کہا۔
"کال کیویں ملے' راوی وچ پانی ایناں چڑھیا اے"
کیا ہوا؟ سیدھی سادی اہلیہ نے پوچھا تو میں نے بھی آپریٹر کی ہی بات دُہرا دی اور ہم بنا مزید بات کئے ہی واپس آ گئے--- کچھ دِن بعد میری ساس صاحبہ سے میری اہلیہ کی بات ہوئی تو ساس صاحبہ نے شکایتاً پوچھا کہ تو نے اِتنے دِن بات کیوں نہیں کی؟ ہماری زوجہ صاحبہ نے وہی جملہ دُہرا دیا۔
"بے بے! گل کِداں ہوندی' راوی وچ پانی ایناں چڑھیا سی---"

☆......قاری محمد داؤد' ٹوبہ ٹیک سنگھ
0301-7281791

😊ایف اے پاس نجم الحسن' شیخ ہونے کے باوجود حلقہ احباب میں شیخوں کے چٹکلے بلا کسی رد و کد کے سناتے ہیں۔ شیخ صاحب منگنی یافتہ ہیں اور عنقریب اِن شاءاللہ موصوف کے باجے بجنے والے ہیں۔ نجم کو چونکہ شاعری سے بھی شغف ہے لہٰذا موصوف نے شادی کے انتظار میں گزرتے لمحات کو شاعری میں کچھ یوں باندھا ہے---
کاٹے نہیں کٹتے دِن انتظار میں
دِل بے قرار ہے بجنی کے پیار میں
نجم کی اِس کیفیت پر ہم یہی کہیں گے کہ "اِس طرح تو ہوتا ہے اِس طرح کے کاموں میں" اور یہ بھی کہ نجم! ایک بار پھر سوچ لیں تو بہتر ہے۔ بہرکیف نجم کے ایس ایم ایس ملاحظہ کیجئے۔

☆وہ رات گئے گھر آیا تو بیوی نے اُسے دروازے پر ہی جا لیا۔ "اگر تم نے شراب نوشی ترک نہ کی تو دیکھ لینا ایک دِن میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔" بیوی نے چلا کر کہا۔
"وعدے ہی وعدے---" شوہر بھی جھلا کر بولا۔ "میری زندگی میں کم بخت صرف وعدے ہی لکھے ہیں۔"

☆ایک نوجوان کو اپنے سامنے ہچکچاہٹ کے عالم میں کھڑے دیکھ کر وہ صاحب بولے۔ "میں سمجھ گیا کہ تم کیا چاہتے ہو--- اگر تم میری بیٹی سے شادی کے خواہشمند ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"
نوجوان نے سٹپٹا کر کہا۔ "نہیں' جناب! یہ بات نہیں--- میں تو آپ سے سو روپے اُدھار لینے آیا ہوں۔"
یہ سنتے ہی وہ صاحب بولے۔ "اُدھار میں تمہیں کیسے دے سکتا ہوں جبکہ میں تمہیں جانتا تک نہیں؟"

☆ایک مکھی کی طبیعت خراب تھی وہ ڈاکٹر کے پاس گئی اور بولی۔
"کیا بتاؤں' ڈاکٹر صاحب! شیخ صاحب چائے پی رہے تھے' میں غلطی سے اُن کی پیالی میں جا گری۔ بس کیا بتاؤں' شیخ صاحب نے چوس چوس کر بُرا حال کر دیا ہے---"

☆......نجم الحسن شیخ' لاہور 0322-8070552

😊ڈاکٹر عامر کا تعلق بولان میڈیکل کالج کوئٹہ سے ہے۔ اپنے اِن مجوزہ ڈاکٹر بھائی کا معاملہ بہت دلچسپ رہا' پہلے تو عامر پوچھا کئے کہ کیا میں بھی نگاہِ انتخاب میں

شرکت کر سکتا ہوں؟ ہم نے فی الفور "این او سی" جاری کیا۔ جواباً عامر نے تعارف Send کیا اس عزم کے ساتھ کہ میں مستقل ایس ایم ایس Send کرتا رہوں گا۔ اس کے ساتھ ہی عامر لمبی تان کر سو گئے۔ پھر جاگے تو ایک عدد مس کال روانہ کر دی، پھر دو دن کے وقفے کے فقط ایک ایس ایم ایس کر دیا۔ اس تمام صورتحال پر بے ساختہ ہی ہمیں وہ چٹکلہ یاد آیا کہ جس میں ایک صاحب نے ایک بڑے نامور شاعر سے سوال کیا کہ قبلہ آپ شعر کیسے کہتے ہیں؟ جواباً شاعر بولے کہ بھئی شعر کہنا کوئی آسان کام تو ہے نہیں۔ ہم پہلے کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہیں، پھر لیٹ جاتے ہیں۔ اِدھر سے اُدھر کروٹیں بدلتے ہیں تب کہیں جا کر کوئی شعر موزوں ہوتا ہے--- یہ سن کر سوال کنندہ جو کہ اُن شاعر صاحب کے بے تکلف دوست بھی تھے، بے ساختہ بولے کہ حضرت! آپ شعر کہتے نہیں بلکہ آپ تو شعر "جنتے" ہیں۔

☆......ڈاکٹر عامر، بولان میڈیکل کالج کوئٹہ
0332-7829612

☺ یادش بخیر! منظور احمد اقبال کے نام نامی سے قارئین چاند بخوبی واقف ہیں۔ عرصہ چار سال کی طویل "رخصت" گزار کر نیز اپنے نام میں کچھ ردوبدل یعنی محمد منظور اقبال کی تبدیلی کے ساتھ "پھر حسین شام وہی، پھر میرا کام وہی" کے مصداق منظور ایک بار پھر چاند کے لئے سرگرم ہو گئے ہیں۔ ویلکم بیک، منظور!--- دیکھیے موصوف کی شوخیاں۔

☆ اگر دماغ کا ٹیسٹ مقصود ہو تو کسی گائے کے سامنے چلے جائیں اگر وہ دور چلی جائے تو سمجھ لیں کہ "خالی" ہے اور پاس چلی آئے تو سمجھ لیں کہ "بھوسا" وافر ہے۔

☆ کتنے عزیز ہو تم، یہ بتائیں کیسے
اپنی سادگی تمہیں دکھائیں کیسے
دوستی آپ کی انمول ہے ہمارے لئے
محض ایک ایس ایم ایس سے سمجھائیں کیسے

☆......محمد منظور اقبال، اوکاڑہ 0322-6954174

☺ چاند کے شوخ و شنگ قبیلے میں ایک اور شوخ طبع فرد کا اضافہ، اسرار کاظمی!--- اسرار کا کہنا ہے کہ میں حسِ مزاح رکھنے والے کسی دوست سے دوستی کا خواہاں ہوں۔ اسرار! آپ جہاں آ پہنچے ہیں، یہاں تو ایک سے بڑھ کر ایک شوخ بیان موجود ہے یوں ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ تمام کا تمام شوخ قبیلہ آپ کا ہوا۔ اسرار کاظمی لیسکو (واپڈا) میں بحیثیت L.D.C کام کرتے ہیں لو بھئی، ساتھیو! اَب ہم اسرار سے "ٹوبی فرینک" بہ اصرار پوچھ سکتے ہیں کہ "زندگی ملتی ہے ایک بار دوستی ہوتی ہے ایک بار، پیار ہوتا ہے ایک بار، اقرار ہوتا ہے ایک بار، جب سے کچھ ہوتا ہے ایک بار، تو اسرار ہمیں بتائیں کہ پھر یہ لائٹ کیوں جاتی ہے بار بار؟"---

اپنے اسرار بھائی ماشاءاللہ بے حد باصلاحیت ہیں۔ شمر تخلص کے تحت نعت، قصیدہ اور نوحہ اسرار بخوبی کہہ لیتے ہیں اور کچھ کچھ مزاحیہ کلام پر بھی دسترس رکھتے ہیں---

بھیجا تھا جو سندیسہ، کہاں دے کے آ گیا
رُخ پہ ہونقی کا دُھواں لے کے آ گیا
جی چاہتا ہے کروں تیری عقل پہ ماتم
پڑھنے گیا نماز، اذاں دے کے آ گیا
او عقل کے اندھے! لے کچھ ہوش کے ناخن
29 ایف شمع پلازہ؟ یہ کہاں لے کے آ گیا
تو ٹھہر ذرا دیکھوں، کہاں ہے چاند کا آفس
آنا تھا یہیں مجھ کو جہاں لے کے آ گیا

اپنے ایس ایم ایس کی بابت اسرار نے ہمیں مخاطب کر کے جو کچھ کہا، وہ بلاکم و کاست اسرار کی ہی الفاظ میں ملاحظہ کیجیے--- "عزیز دوست! آپ کو send کردہ 90% سے زیادہ ایس ایم ایس میرے اپنے ہی تخلیق کردہ ہوتے ہیں۔ جدید I.T کا کمال ہے کہ اکثر میری ہی send کردہ۔ ایس ایم ایس تھوڑی ہی دیر میں کچھ تبدیلی کے ساتھ مجھے مل جاتا ہے۔ میں بھیجتا ہوں کسی اور کو، مجھے بھیجتا کوئی اور ہے"--- سو ساتھیو! انہی کلمات کے ساتھ اس قدر گوناگوں صلاحیتوں کا مالک ایک بہت پیارا انسان ہم آپ کے حوالے کر رہے ہیں۔ اسے بہت سا پیار دیجیے گا اور ہمیشہ اپنے دِل میں رکھیے گا--- اسرار کے send کردہ ایس ایم ایس یہ رہے۔

☆ سردار جی: رات کو جب میں سوتا ہوں تو خواب میں بندر فٹ بال کھیلتے نظر آتے ہیں۔
ڈاکٹر: نو پرابلم--- یہ لو میڈیسن، رات کو سونے سے پہلے کھا لینا۔
سردار: کل سے کھاؤں گا، آج رات تو میچ کا فائنل ہے۔

☆ بیوی بمقابلہ سالی!
بیوی، ڈیوٹی۔ سالی بیوٹی--- بیوی، سیاپہ۔ سالی، پٹاکہ--- بیوی، فول۔ سالی، پھول--- بیوی، ٹوٹی پھوٹی۔ سالی، ٹوٹی فروٹی--- بیوی، خضاب۔ سالی، شباب--- بیوی، سٹ پٹی۔ سالی، چٹ پٹی--- بیوی، عذاب۔ سالی گلاب--- بیوی، خود پسند۔ سالی، دِل پسند--- بیوی، اُف یہ بیویاں۔ سالی، ہائے یہ شوخیاں۔

☆ دوست بالکل غبارے کی مانند ہوتے ہیں، ایک بار ہاتھ سے چھوٹ جائیں تو پھر واپس نہیں آتے۔ اس لئے میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کی ہوا نکال کر اپنے پاس ہی رکھ لوں۔

☆ سائنس کی جدید تحقیق کے مطابق نسوار کھانے سے نظر تیز ہوتی ہے--- ثبوت؟ ثبوت یہ ہے کہ پشاور میں چاند ایک دِن پہلے نظر آ جاتا ہے۔

☆ کہتا ہے دِل کہ مجھ کو کیا آنکھ نے خراب
کہتی ہے آنکھ مجھ کو تو دِل نے ڈبو دیا
آتی نہیں سمجھ میں، ہے اصل بات کیا
ہم کو تو تیر دونوں نے مل کر ڈبو دیا

☆......اسرار کاظمی، لاہور 0313-4416240

☺ طبیعت چینی شاعری کی طرف مائل ہونے پر ایک شانم عاصم گویا ہوئے کہ آج کچھ چینی شاعری ہو جائے---

چانگ شوشوئی
ٹنگ پونگ چنگ پوپو
شونگ چنگ چی، ٹوئی ٹوئی اوئی اوئی

ہم نے اِس "سحر انگیز" قطعہ کا (یا یہ جو بھی ہے) مطلب پوچھا تو ارشاد ہوا کہ یہ ایک سربستہ راز ہے۔ عرض کیا کہ بھئی چکوران چاند بھی تو اِس کے معنی جاننا چاہیں گے؟ جواب آیا کہ جسے زیادہ بے قراری ہوگی، فون کر کے ما بدولت سے پوچھ لے گا--- سو، صاحبو! آپ پر تجسس کا حملہ ہو تو عاصم کو فی الفور پکڑیے جبکہ یہاں آپ ملاحظہ کیجیے عاصم کے مزید چٹکلے۔

☆ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ یہ بنگلے یہ گاڑیاں یہ لڑکیاں سب کچھ چھوڑ کر کہیں دور چلا جاؤں لیکن--- لیکن پھر سوچتا ہوں کہ پہلے یہ سب کچھ ملے تو سہی۔

☆ کسی نے سردار جی کو بتایا کہ آپ کی غیر موجودگی میں آپ کا ایک دوست آپ کے گھر میں موجود ہے۔ سردار جی غصے میں بھرے پستول لہراتے ہوئے گھر کی طرف بھاگے پھر کچھ ہی دیر بعد ہنستے ہوئے واپس آ گئے، پوچھنے پر ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے بولے۔
"اوئے یارا! وہ میرا دوست نہیں، کوئی اور ہے۔"

☆ سردار جی کی بیوی پریشانی کے عالم میں اپنی ساس سے بولی۔
"ویکھ لئے بے بے! سردار اجے تیک نئیں آیا، ضرور کسے "اونتر جانی" کول بیٹھا ہووے گا۔"
بے بے غصے سے بولی۔ "توں کدی میرے پتر بارے چنگا نہ سوچیں--- اے وی تے ہو سکدا اے کہ کسی ٹرک تھلے آ گیا ہووے۔"

☆......عاصم محمود (پریشان 420) فیصل آباد
0314-9500420

مکس پلیٹ

☆ شاہد اطہر

7 دِن لاہور میں

کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے، ہم کہتے ہیں کہ جب اِسلام آبادی کی شامت آتی ہے تو وہ لاہور کی طرف بھاگتا ہے--- حال ہی میں ہم نے 7 دِن لاہور میں گزارے جن کا احوال ہم سنانے جا رہے ہیں۔ لاہور ہم اکثر جاتے رہتے ہیں مگر یہ دورہ ذرا مختلف تھا۔ پہلے ہم اپنے آفس کے کام سے جایا کرتے تھے اور ہوٹل میں قیام ہوتا تھا۔ برانچ کی کار ہمیں لیئے پھرتی تھی، ہوٹل میں ہی اپنی عادت کے مطابق ہلکا پھلکا کھا پی لیا کرتے تھے لیکن اِس مرتبہ یہ قطعی نجی دورہ تھا۔

ہوا کچھ یوں کہ ہمارے سالے صاحب سیّد اعجاز شاہ سعودی عرب میں اپنی زندگی کے بائیس سنہری سال ضائع کر کے اَب واپس لاہور واپس آ گئے تھے یا یوں کہہ لیں کہ "جتھے دی کھوتی اوتھے اِی آن کھلوتی"---سعودی عرب میں اِن کے ہوٹل تھے۔ ظاہر ہے، پھر اور تو کوئی کام کر نہیں سکتے لہٰذا اُنہوں نے طے کیا کہ لاہور میں کھانے پینے کا کاروبار شروع کیا جائے۔ موصوف کو ایک سنگین غلط فہمی بھی ہے کہ وہ ہمیں قابل کاروباری سمجھ بوجھ رکھنے والا آدمی سمجھتے ہیں۔ ایک دِن اُن کا فون آیا۔

"سلام، بھائی جان---!"

"وعلیکم السلام---!"

"کیا آپ کچھ دِن کے لئے لاہور آ سکتے ہیں؟"

"کیوں بھئی، خیریت تو ہے نا؟"

"دراصل مَیں یہاں کھانے پینے کا کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ آ جائیں تو جگہ وغیرہ آپ کے مشورے سے طے کر لوں گا اور ہاں مینو بھی۔"

"ٹھیک ہے، ہم اتوار کو آ جائیں گے لیکن تم مینو رکھنا کیا چاہتے ہو تا کہ اُسی حساب سے علاقے کا تعین کیا جا سکے؟"

"مجھے زیادہ کمال تو عربی کھانوں پر حاصل ہے اور پھر لاہور میں عربی کھانے ہیں بھی نہیں۔"

"بہتر ہے تم واپس سعودی عرب ہی چلے جاؤ کیونکہ لاہور میں عربی کھانا اُتنا ہی چلے گا جتنا میرپور خاص میں اٹالین فوڈ!"

"پھر مجھے کیا مینو رکھنا چاہئے؟"

"اِس کا فیصلہ تو باقاعدہ سروے کر کے کرنا پڑے گا---بس جو کچھ لاہور میں چلتا ہے اُس کی بہتر کوالٹی پیش کرنے کی ضرورت ہے۔"

"ایک بات بتائیں، مثلاً اِسلام آباد میں لوگ ناشتے میں باہر سے کیا کھانا پسند کرتے ہیں؟"

"اِسلام آباد والے ناشتہ باہر سے کرتے ہی نہیں، صرف اتوار کے روز چند لوگ باہر سے ناشتہ کرنے کی بد پرہیزی کرتے ہیں اور لاہور کا کیا حال ہے؟"

"لاہور میں چند لوگ گھر پر ناشتہ کرنے کی بد پرہیزی کر لیتے ہیں ورنہ ہفتے کے ساتوں دِن "لاہوری بادشاہ" باہر سے ہی ناشتہ کرتے ہیں۔"

قصہ مختصر، ہم ایک ہفتے کے لئے لاہور آ موجود ہوئے۔ بذریعہ نان سٹاپ ریل کار سے سفر کیا جو خاصا خوشگوار رہا۔ مفت کی کولڈ ڈرنک اور لنچ بکس بھی پیش کیا گیا جو شاید صرف اِس لیے اچھا لگا کہ مفت کا تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکلے۔ برادرِ نسبتی عرف شاہ جی ندارد، فون کیا تو بولے۔

"او---آپ پہنچ گئے؟"

"لیکن تم نہیں پہنچے؟"

"مَیں سمجھا ٹرین ایک گھنٹہ تو لیٹ ہوگی۔"

"کیا ریلوے انکوائری سے پوچھا تھا؟"

"آپ وہیں کھڑے رہیں مَیں آ رہا ہوں۔"

"رہنے دو، بھائی! ہم خود ہی آ جائیں گے۔"

"رکشے میں آیئے گا، ٹیکسی والا اتنے پیسے مانگے گا جو ٹرین کے

ٹکٹ سے زیادہ ہوگا۔"
"مشورے کا شکریہ ہم آ جائیں گے۔"
فون بند ہوتے ہی ہم نے محسوس کیا کہ پندرہ بیس لوگوں نے ہمیں گھیرے میں لے رکھا ہے۔ سب نے بیک زبان ہو کر ہمیں اپنی اپنی سواری میں بیٹھنے کی آفر کی۔ اسٹیشن سے ہمیں تقریباً 10 کلومیٹر دور جانا تھا جس کے ٹیکسی والے نے چار سو روپے طلب کیئے۔ رکشہ واقعی سستا تھا جو صرف دو سو روپے میں منزلِ مقصود پر چھوڑنے کو تیار تھا۔ ہم نے اپنی کاروباری صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے سو روپے کی آفر کی' سارا مجمع فوراً ہی چھٹ گیا۔ ہم کچھ دور پیدل چلے۔ ایک رکشہ کھڑا تھا اور ڈرائیور صاحب موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے' ہم نے پوچھنا چاہا تو ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ ٹھہرو۔ موبائل سے فارغ ہوئے تو گویا ہوئے۔
"کہاں جانا ہے؟"
ہم نے جگہ بتائی تو بولے۔
"بیٹھ جایئے۔"
ہم بیٹھتے ہوئے بولے۔ "بہت شکریہ مگر کرایہ کیا ہوگا؟"
"جو دِل میں آئے' دے دینا۔"
"نہ بھائی! پہلے طے کرلو' بعد کی بحث ہمیں پسند نہیں۔"
"اَسّی روپے ٹھیک ہیں؟"
"بالکل ٹھیک ہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی ٹھیک ہیں' چلو۔"
اُس نے رکشہ اسٹارٹ کیا اور "فلائنگ گیئر" لگا دیا۔ اِسلام آباد کے برعکس لاہور کی سڑکیں تباہ حال ہیں اور اِس قدر جھٹکے لگنا شروع ہوئے کہ بیان سے باہر ہے۔ ہم نے رکشہ روکنے کا کہا اور بولے۔
"اگر تم رکشہ آہستہ نہیں چلا سکتے تو ہمیں یہیں اُتار دو۔"
"کیا ہوا' صاحب! لوگ تو ہمیں کہتے ہیں کہ اور تیز چلاؤ۔"
"بھائی! وہ عادی ہوں گے۔ ہم تو اِس تیز رفتاری جس کا کنٹرول بھی دوسرے کے ہاتھ میں ہو' برداشت نہیں کر سکتے اور پھر یہ جھٹکے' ہمارے تو سارے اسپیئر پارٹس ہی ہل گئے ہیں۔"
"ٹھیک ہے جناب! مَیں آپ کو آہستہ لے جاتا ہوں۔"
رکشہ چلا' رفتار کم ہوگئی لیکن جھٹکے کم نہ ہوئے۔ اِس میں اُس کا قصور نہیں تھا کیونکہ رکشے نے بہرحال سڑک پر ہی چلنا تھا--- گھر تک پہنچتے پہنچتے دو باتیں واضح ہوگئیں۔ پہلی بات کہ لاہوری اِتنا کھاتے کیوں ہیں' دوسرے لاہور میں زچگیاں اتنے آرام و آسانی سے کیسے ہو جاتی ہیں اور دونوں باتوں کا سہرا رکشے پر ہے۔ جاننا چاہتے ہیں کیوں؟ رکشے میں اتنے جھٹکے لگتے ہیں کہ سارا کھایا پیا فوراً ہضم ہو جاتا ہے اور لاہوریئے مزید کھانے پر مجبور ہوتے۔ دوئم حاملہ خواتین کو رکشے میں ہسپتال یا میٹرنٹی ہوم لے جایا جاتا ہے اور یہی جھٹکے ہچکولے اُن کی مشکل آسان کر دیتے ہیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ کوئی بچہ زچہ وارڈ میں دُنیا میں آنے سے انکاری ہو تو حاملہ تو لاہوری رکشے میں دو کلومیٹر کا چکر لگوا دیں' خوشخبری بغیر بڑے آپریشن کے اطمینان سے موصول ہو جائے گی--- خیر' صاحب رکشے نے ہمیں منزلِ مقصود پر پہنچا دیا۔ ہم نے شکریہ کے ساتھ اَسّی کی جگہ اُسے سو روپے دیئے۔ رکشے والے نے جوابی شکریہ کے ساتھ اپنا موبائل نمبر دیتے ہوئے کہا۔
"جب بھی میری ضرورت ہو' مجھے فون کر دیجئے گا۔ مَیں سمجھ گیا ہوں کہ آپ کو کیسے لانا لے جانا ہے۔"
"یہ بڑا احسان کیا' دوست!"
"لیکن خیال رہے کہ مَیں جہاں ہوں گا' وہاں سے یہاں تک آنے کا کرایہ بھی لوں گا۔"
"مجھے منظور ہے۔ موت کے کنویں کی سرکس سے تمہیں زیادہ پیسے دینے میں مجھے اعتراض نہیں--- اپنا نام تو بتا دو؟"
"جی' میرا نام رفیق ہے۔"
"اچھا' بھائی رفیق! جب ضرورت ہوگی' مَیں تمہیں تکلیف دوں گا۔"
رکشہ چلا گیا اور ہم گھر میں داخل ہو گئے۔ سالے صاحب کے انداز میں کوئی پشیمانی نہیں تھی' خوش اخلاقی سے پوچھا۔
"سفر کیسا گزرا؟"
"بہت عمدہ' خاص طور پر رکشے کا سفر بڑا دِلکش تھا۔ ہمارا سارا کھایا پیا ہضم ہو چکا ہے' اب جلدی سے کھانا لگوا دو۔"
کھانا فوراً پروس دیا گیا۔ ہمیں لگا کہ ہم غلطی سے کسی شادی والے گھر میں آ گئے ہیں۔ دسترخوان میں ہر وہ شے تھی جو ہم نہیں کھاتے۔ یعنی بڑے گوشت کے سیخ کباب' نہاری' شامی کباب' گوبھی قیمہ' بونگ پائے وغیرہ وغیرہ۔ میزبان اِس طرح کھا رہے تھے جیسے شادی میں ہی آئے ہوں۔ بھابی (جو عمر میں ہم سے چھوٹی لیکن حجم میں ہم سے چار گنا زیادہ ہیں) حیرت سے پوچھنے لگیں۔
"شاہد بھائی! کیا ہوا' کھا کیوں نہیں رہے؟"
"بھئی' اتنی ثقیل چیزیں ہم کھانے کے عادی نہیں۔"
"جبھی تو سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں۔"
"آپ ایسے گوبھی کے پھول سے کانٹا بہتر ہے۔"

''ارے، کھالیں، کچھ نہیں ہوتا۔''
''لاہوریوں کو کچھ نہ ہوتا ہوگا مگر ہم اتنے بھاری بھرکم کھانوں کے عادی نہیں۔''
''چکن روسٹ منگوا دوں، دو منٹ میں آ جائے گا۔''
''نہیں بھئی، کوئی سبزی دال نہیں ہے گھر میں؟''
اُن کی بیٹی، یعنی ہماری بھتیجی پھٹ سے بولی۔ ''سبزی دال ہم میں سے کوئی کھاتا ہی نہیں۔''
''جبھی ماشاءاللہ اپنی عمر سے ڈبل معلوم ہوتی ہو۔''
بھابی مہمان نوازی میں بولیں۔ ''مچھلی فرائی منگوا دوں؟''
''بھئی، ہم باہر کی چیزیں بالکل پسند نہیں کرتے۔ بقول ہمارے گھر کی دال مرغی برابر ہوتی ہے--- آپ یوں کریں کہ ہمیں انڈا آملیٹ بنا دیں۔''
''کیا آپ بیمار ہیں؟''
''جی نہیں بلکہ سمجھتے ہیں کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے۔''
الغرض ہم نے اُسی فارمولے پر عمل کیا جس میں کہا گیا ہے کہ کھاؤ من بھاتا البتہ لاہوریوں کی خوش خوراکی دیکھتے رہے اور اِسی نتیجے پر پہنچے کہ لاہور میں کھانے پینے کا کاروبار بلاشبہ سب سے عمدہ کاروبار ہے۔
اگلے دِن صبح ہی صبح برادرِ نسبتی کو لیا اور یہ دیکھنے نکل پڑے کہ لاہور میں ناشتہ کیا چلتا ہے۔ مارکیٹ پہنچے تو ہر دوکان پر رش نظر آیا اور ایک ہی شے نظر آئی ''چنے'' --- لگتا ہے، آدھا لاہور چنے کا ناشتہ کرتا ہے ہمراہ نان کے۔ ہم نے سالا صاحب سے پوچھا۔
''کیا لاہور میں صرف چنے کا ناشتہ ہوتا ہے؟''
''جی نہیں، کچھ لوگ انڈا چنے بھی کھاتے ہیں۔''
''اور بقیہ---؟''
''وہ مرغ چنے یا کوفتہ چنے تناول کرتے ہیں۔''
''او--- یہ تو چنے ہی ہوئے، نا! اِس کے علاوہ؟''
''چکڑ چھولے---!''
کچھ متفرقات، مثلاً حلوہ پوری، بونگ، سری پائے کے علاوہ ہمیں ہر طرف چنے ہی چنے نظر آئے۔ ہم نے شاہ جی سے پوچھا۔
''تم کون سا آئیٹم شروع کرنا چاہو گے؟''
''کوئی نیا--- مثلاً پراٹھا انڈا، آملیٹ چائے وغیرہ---''
''پٹ جاؤ گے۔''
''پھر مَیں کیا لگاؤں؟''
''چنے---!''

نمکین قطعات

آخری خواہش

دَمِ رُخصت کہا اِک آدمی نے اپنی زوجہ سے
بلانا سامنے والوں کو لازم میرے مرنے پر
کہا بیوی نے، کیوں، تو آدمی بولا، سنا یہ ہے
لپٹ کے مردے سے روتی ہیں اُن کی عورتیں اکثر

دس لاکھ

اِس پڑھائی میں بھلا رکھا ہے کیا
سیکھ لے گانے بجانے کا تو فن
تجھ کو بھی دس لاکھ شاید مل ہی جائیں
بن سکے تو بن میاں، مہدی حسن!

بھروسہ کیا

کہا بیمار بیوی نے، مرے مرنے پہ کیا ہوگا
کہا شوہر نے، پاگل میرے ہو جانے کا ہے خدشہ
سنا اُس نے، بولی، دوسری شادی نہ کر لینا
وہ بولا، کچھ بھی کر سکتا ہے، پاگل کا بھروسہ کیا

مُفت خورہ

سبھی کو علم ہے، سگریٹ نوشی ہے بُری عادت
مَیں اِس عادت سے چھٹکارے کا پکا عزم کرتا ہوں
جو تم نے جیب میں ٹھونسے ہوئے ہیں اپنی، دو پیکٹ
بس اِک پیکٹ کرو تم ختم، اِک میں ختم کرتا ہوں

رنگ ٹیون

کہا بیوی نے، مَیں محفوظ کر لیتی ہمیشہ کو
اگر تم کو خدا اچھا سا ایس ایم ایس بنا دیتا
میاں کہنے لگا، اے کاش! اِک رنگ ٹیون تم ہوتیں
مَیں ہر چھٹی کے دِن آسانی سے اِس کو بدل لیتا

فصاحت و بلاغت

میرے لیڈر کا بیاں کیا شوخ ہے
جیسے آری سی کوئی دِل پر چلے
کیا بلاغت اِس کی ہے تقریر میں
پہلے ڈنڈے، بعد میں پتھر چلے

✿ مرزا عاصی اختر

''وہ کیوں---؟''

''دیکھو بھائی! گھاس کھانے والے گھوڑے کے سامنے پھلوں کا ڈھیر لگا دو تو وہ کھائے گا گھاس ہی۔ اب لاہوریوں نے چنے ہی کھانے ہیں ناشتے میں تو وہ چنے ہی کھائیں گے۔ اب اگر تم کوالٹی اچھی پیش کر دو تو تمہارے ناشتہ کا کاروبار سمجھو چل نکلا۔''

''ٹھیک ہے۔ چلیں' اب مختلف جگہوں سے چنے کھاتے ہیں تاکہ مجھے ذائقے کا اندازہ ہو جائے۔''

ہم نے قریباً دس مقامات سے چنے چکھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک ذائقہ' فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ بہترین کون تھا۔ شاہ جی نے ارشاد کیا کہ مَیں سب سے بہتر چنے بنا سکتا ہوں۔ طے پایا کہ وہ خود چنے بنائیں گے۔ اُنہوں نے چنے بنائے' اب ہمیں فیصلہ کرنا آسان لگا کیونکہ جتنے چنے کھائے تھے' اُن میں سب سے بدذائقہ یہی چنے تھے---خوشدلی سے بولے۔

''مَیں دراصل سعودی عرب میں رہا ہوں' نا! اِس لئے عربی ذائقہ بن گیا ہے۔''

''بھائی! یا تو لاہور کو سعودی عرب لے جاؤ یا پھر لاہور میں سے سعودی عرب نکال دو۔''

''میرے ذہن میں ایک اور طریقہ آیا ہے۔ لاہور میں ہول سیل میں بنے بنائے چنے ملتے ہیں' اکثر دوکاندار وہیں سے لاکر بیچتے ہیں۔ اِس میں محنت بھی نہیں کرنا پڑتی اور منافع بھی مناسب ملتا ہے بلکہ بڑا آڈر ہو تو وہ خود ڈلیوری بھی دیتے ہیں۔''

''کام وہی بہتر ہوتا ہے جو اپنے ہاتھ سے کیا جائے۔ فرض کیا اُن کی ڈلیوری وین راستے میں خراب ہو گئی تو کیا اُس دِن دوکان بند رکھو گے؟''

''اُس کے کئی طریقے ہیں۔ مَیں خود لے آؤں گا یا پھر خود ہی بنا لوں گا۔''

''بہتر ہے' اُسی سے لے آنا' اِس میں کاروبار تباہ ہونے کا کم رسک ہے---کوفتوں' مرغ' انڈوں کا کیا کرو گے؟''

''سب کچھ ریڈی میڈ ملتا ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے' ناشتے کا مسئلہ تو حل ہوا۔ اب گھر چلتے ہیں' دوپہر کو دوسرے سروے پر نکلیں گے کہ دوپہر میں کیا لگایا جائے۔''

دوپہر کو پھر سروے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ جدھر جائیں' لاہوری بادشاہوں کو کھاتے ہی دیکھا۔ جہاں بڑی بڑی کھانوں کی دوکانوں میں رش تھا' وہاں ہر چھوٹے بڑے ٹھیلے پر بھی رش تھا۔ ایک مرتبہ پھر لوگوں کی اکثریت کو چنے کھاتے دیکھا۔ ہم نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا جو لاہور میں تانگوں کا خاتمہ کر دیا گیا ہے وگرنہ گھوڑے بیچارے تو بھوکے ہی مر جاتے--- کہتے ہیں کہ لاہور میں اِنسان بھوکے نہیں مرتے کیونکہ وہاں داتا دربار ہے جہاں چوبیں گھنٹے لنگر چلتا رہتا ہے۔ یہاں ایک لطیفہ بھی یاد آ گیا' آپ بھی سن لیں۔ ایک صاحب نے اخبار میں اشتہار دیا کہ ایک ملازم کی ضرورت ہے جسے رہنے کے لئے گھر' موٹر کار اور تین ٹائم کا کھانا ملے گا مگر تنخواہ کوئی نہ ملے گی۔ ایک سیانا سویرے سویرے ہی وہاں پہنچ گیا اور مالک سے پوچھا۔

''حضور! آپ نے رہنے کو گھر' تین ٹائم کا کھانا اور موٹر کار آفر کی ہے۔ بس یہ بتا دیں کہ مجھے کرنا کیا ہوگا؟''

مالک مسکرا کر بولا۔ ''کچھ بھی نہیں۔ یہ میرا بڑا سا بنگلہ ہے' یہاں کے سرونٹ کوارٹر میں رہو' کار میں تین مرتبہ داتا دربار کے چکر لگاؤ۔ وہاں سے کھانا لاؤ' خود بھی کھاؤ اور مجھے بھی کھلاؤ۔''

خیر' صاحب! بات ہو رہی تھی لاہور میں دوپہر کے کھانوں کی۔ کہیں دال چاول چل رہے تھے تو کہیں حلیم نان۔ کہیں بریانی اُڑائی جا رہی تھی' فرائی فش' پائے' قورمہ (خیال رہے لاہور میں قورمہ بکرے کے گوشت کے سالن کو کہتے ہیں۔ یہ کراچی کی طرح نہیں بلکہ اصل قورمے کی فقط فوٹو کاپی ہی ہے) ماش کی دال' پالک گوشت' کٹا کٹ' اسٹیم روسٹ اور حد تو یہ ہے کہ ظالم لاہوری دوپہر میں بھی نہاری کھا لیتے ہیں جبکہ نہاری فقط نہار منہ' یعنی صبح صادق کھانے کی شے ہے۔ کراچی میں بھی نہاری رات کے وقت کھائی جاتی ہے' خواہ وہ صابری کی یا زاہد کی نہاری ہی کیوں نہ ہو البتہ اہل زبان رمضان میں تھوڑی شرم رکھ لیتے ہیں کہ سحری میں نہاری کھائی جاتی ہے--- دوپہری سروے میں' ہمیں شدت سے احساس ہوا کہ لاہور میں بریانی کی ہتک عزت کی جاتی ہے' اِستحصال کیا جا رہا ہے۔ جو اعلیٰ بریانیاں کراچی میں بنام بمبئی بریانی یا سندھی بریانی ملتی ہیں' وہ بریانی ہوتی ہے لیکن لاہور میں بریانی کے نام سے جو کچھ ملتا ہے' وہ دو رنگ کے چاول' پلاؤ' سالن والے چاول' چکن چاول تو کہلا سکتے ہیں' بریانی ہر گز نہیں۔ ہم نے شاہ جی سے کہا۔

''بھئی' دوپہر کا آئیٹم بریانی رکھ لو۔''

''وہ کیوں---؟''

''اِس لیئے کہ تم جیسی بھی بریانی بناؤ گے' چل جائے گی کیونکہ لاہوریوں کو پتہ ہی نہیں کہ بریانی ہوتی کیا ہے۔''

''ایسی بات بھی نہیں۔ چلیں گھر چلتے ہیں مَیں آپ کو اپنی بریانی کا نمونہ پیش کرتا ہوں۔''

گھر واپس جاتے ہوئے ہم نے تین چار جگہوں سے بریانی چکھی تا کہ شاہ جی کی بریانی سے مقابلہ کیا جا سکے۔ خیال رہے' یہ فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ آئیٹم ایک ہی ہوگا۔ چنوں کے تجربہ کے بعد ہم شاہ جی کی بریانی کا حشر دیکھنے کے منتظر تھے۔ ڈنر میں بریانی تیار تھی۔ حسن اتفاق کچھ مہمان بھی آ گئے' سب کو بریانی پیش کی گئی۔ ہر شخص بشمول ہمارے' منہ سے بے ساختہ نکلا کہ لاجواب' شاندار! شاہ جی پھول کے کپا ہو گئے اور ہم دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ایسی عمدہ بریانی تو کراچی میں بھی نہیں ملتی۔ ایک اطمینان بھی ہوا کہ چلو' ایک شے تو ایسی ہے جو شرطیہ چلنے والی ہے۔

اگلے دو دِن شاہ جی مختلف پراپرٹی ڈیلروں کے ہمراہ مختلف اسپاٹ دیکھتے رہے۔ جو دوکان دیکھتے' وہ اُنہیں پسند آ جاتی۔ پھر ہمیں لے جا کر دِکھاتے اور ہم کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتے۔ بہر حال' اُنہیں ایک دوکان پسند آئی۔ فوری طور پر پانچ ہزار بطور ٹوکن دے دیا گیا۔ چند گھنٹوں بعد بہت ہی مناسب جگہ دِکھائی دی۔ شاہ جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' اُسے دس ہزار ٹوکن تھما دیا۔ ہمارے استفسار پر بولے۔

''اچھا ہوا' نا! جو پہلی دوکان کو صرف ٹوکن دیا تھا۔ اگر ایڈوانس بھی دے دیا ہوتا تو زیادہ نقصان ہوتا۔''

''یہی وہ کاروباری سوجھ بوجھ ہے جو تم سعودی عرب سے سیکھ کر آئے ہو؟''

''نہیں' سعودی عرب سے یہ سیکھا ہے کہ اگر تھوڑے نقصان کی وجہ سے بڑے نقصان سے بچا جا سکتا ہو تو چھوٹا نقصان نقصان نہیں ہوتا۔''

''ہمارے خیال میں تو یہ ریالوں کی گرمی ہے۔ اِس طرح کے چند اور کاروباری گر دِکھائے تو آفاقہ ہو جائے گا۔''

''اُسے چھوڑیں' یہ بتائیں کہ جگہ کیسی ہے؟''

''زبردست ہے--- کچھ حیرت بھی ہے کہ اتنی مناسب دوکان اتنی آسانی سے کیسے مل گئی۔''

''اِس بینر کی وجہ سے جس پر لکھا ہے کہ دوکان کرایہ کے لئے خالی ہے۔ بس مالک سے رابطہ کیا اور ٹوکن دے دیا۔''

''یار! اڑوس پڑوس سے پوچھ تاچھ بھی کر لی ہوتی؟''

''اِس کی کیا ضرورت تھی' جب مالک سے ڈائریکٹ بات ہوئی--- کل شام اُس کو ایڈوانس وغیرہ دے کر چابی لے لوں گا۔''

''ویری فاسٹ--- کہتے ہیں کہ دیوار سے بھی مشورہ کر لینا چاہئے۔''

''آپ سے کر تو رہا ہوں۔''

اگلے دِن مالک دوکان سے ہماری بھی ملاقات ہوئی۔ معقول آدمی تھا' رقم ادا کر دی گئی۔ اگریمنٹ بھی ہو گیا اور چابیاں مل گئیں۔ دوکان ہمیں اندر سے دِکھانے گئے تو راستے سے رنگ کرنے والوں کو ساتھ لیا اور اگلے چند گھنٹوں میں رنگ و روغن ہونا شروع ہو گیا۔ گھر پہنچے تو مینو کارڈ مرتب ہونے لگا کہ صبح کو چنے' دوپہر کو بریانی اور شام کو باربی کیو لگایا جائے گا۔ باتوں باتوں میں بولے۔

''بھائی جان! ذرا ہیرا منڈی چلنا ہے۔''

اپنے حقیقی سالے سے ایسی عمدہ پیشکش کی ہمیں اُمید نہیں تھی لیکن سن رکھا تھا کہ وہاں بزنس رات میں ہوتا ہے۔ ہم اپنی مسرت کو چھپاتے ہوئے بولے۔

''مگر کیوں---؟''

''آپ چلیں تو سہی' ایک آڈر بک کرنا ہے۔''

''کیا یہ بھی کاروبار کا حصہ ہے؟''

''بالکل' اِس کے بغیر تو کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔''

ہر کھمبے میں تو

جیسے تو بھی پتھر دِل ہے
کھمبا بھی بے جان کھڑا ہے
جیسے تیرے اندر بجلی
ایسے اُس کے اُوپر بجلی
جیسے ہر سو تیرا چہرہ
ایسے ہر سو کھمبا
تیرا قد اور گول یہ چہرہ
تیری نقل اُتارے کھمبا
جیسے تیری ناگن زلفیں
اُس کی کالی تاریں
جیسے تیرا زخم ہے گہرا
ایسے اُس کا کھڈا
جیسے تجھ کو حاصل کرنا
کتنا ہے دُشوار
ایسے اُس کے اُوپر چڑھنا
کتنا ہے دُشوار
جیسے اَشد ضرورت تیری
ایسے ہی ہے کھمبا
تو بھی آخر جاں لیتی ہے
اِس بجلی کا بل بھی
چھوڑ دے یہ افسانے سارے
جلدی آ کے مل
گن ڈالے ہیں
مَیں نے سارے
اِس دھرتی کے کھمبے
ہر کھمبے میں تیرا چہرہ
ہر کھمبے میں تو---!

✿ نواب ڈاکٹر امبر شہزاد' لاہور
موبائل: 0300-9419749

"ٹھیک ہے بھئی' چلو---"

ہمیں حیرت تھی کہ یہ سالے صاحب کس چکر میں ہیں۔ ہیرا منڈی پہنچ کر ہمیں بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ اُس وقت کوئی منڈی تو نظر آئی۔ عام سا بازار تھا' بعد میں ہمیں اپنی سوچ پر افسوس بھی ہوا کیونکہ سالے صاحب وہاں' ہمیں اسٹیل کے چولہے بنانے کی دوکان میں لے گئے۔ اپنی پسند کے مطابق ڈیزائن وغیرہ دے کر آڈر بک کیا' اِس چکر میں کئی گھنٹے وہیں بیت گئے۔ رات ہوا چاہتی تھی جب ہماری واپسی ہو رہی تھی کہ ایک کرولا کار "ہیروں" سے بھری ہوئی وہاں داخل ہوئی پر ہمارا واپسی کا گیئر لگ چکا تھا۔

اگلے دِن شاہ جی ایک اور کوڑی لے آئے کہہ اُنہوں نے ایک بریانی بنانے والی کمپنی سے معاہدہ کرلیا کہ جس قدر بریانی درکار ہوگی' وہ فراہم کرے گا اور وہ بھی اسپاٹ پر۔ ہم سے پوچھا۔

"بھائی جان! کیسا کام دِکھایا ہے۔"

"یار! چنے تم کسی سے لوگے' بریانی تم کسی سے لوگے' اِس طرح تو کاروبار نہیں ہوتے؟ یوں تو تم اُن کی اشیاء فروخت کروگے جس میں منافع بھی کم اور ہر دَم محتاجی بھی؟"

"آپ فکر نہ کریں' مجھے بائیس سالہ تجربہ ہے ہوٹل چلانے کا' یہ تو معمولی بات ہے۔ میں کنٹرول کرلوں گا۔"

"اب شام کو بھی کوئی ریڈی میڈ آئیٹم شروع کرلو' پھر تمہیں خود کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔"

"اِس کا انتظام میں نے پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔ شام کو تو بار بی کیو لگانا ہے' نا! ایک کاریگر سے بات کرلی ہے' صرف پندرہ ہزار ماہانہ لے گا اور الف سے لے تک سب کچھ خود کرے گا' بس اُس کو دو ٹائم کھانا اور سگریٹ کے دو پیکٹ روزانہ دینے پڑیں گے۔"

"بھئی' سچ پوچھو تو ہمیں یہ آئیڈیا کچھ بھایا نہیں۔ اِنسان کو کام وہی کرنا چاہئے جو وہ خود کرسکتا ہو' آگے تمہاری مرضی!"

"مجھے بائیس سالہ تجربہ ہے' آپ فکر نہ کریں۔"

"تم ہر کام اپنی مرضی سے کیئے جارہے ہو' پھر ہمیں کس لیئے بلایا تھا؟"

"ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں' نا!"

"ایک تو تم ہوئے' دوسرا کون ہے' کم از کم ہم تو دوسرے نظر نہیں آرہے؟"

"اچھا چھوڑیں' آج رات بار بی کیو والا گھر پر آکر چکن بار بی کیو بنائے گا۔ ذرا اِس کا ٹیسٹ ہوجائے گا' نا!"

"ٹھیک ہے' بھئی!"

شام کو وہ بندہ آیا' عمدہ بار بی کیو بنایا اور بہت ہی عمدہ پودینے کی چٹنی بنائی۔ ہمارے منہ سے نکل گیا۔

"یار! چٹنی بہت عمدہ ہے' ہمیں بھی سکھاؤ' کیسے بنتی ہے۔"

فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ چمٹا ایک جانب پھینکا اور پھنکارا۔

"اگر مجھ سے کام لینا ہے تو ترکیبیں (ریسپی) نہیں پوچھنی ورنہ کوئی اور بندوبست کرلیں۔"

"ارے بھائی! تم تو یونہی خفا ہوگئے۔ چلو' نہ بتاؤ مگر باقی کے تکے تو بناؤ۔"

"ٹھیک ہے۔ بس میری پہلی اور آخری شرط یہی ہے کہ مجھ سے ریسپی نہیں پوچھنی۔"

ہم اُس سے مزید کیا اُلجھتے مگر اتنا ضرور محسوس کیا کہ موصوف شاہ جی کو ٹف ٹائم دیں گے---خیر' صاحب! آئیٹم اُس نے عمدہ بنائے اور جاتے جاتے شاہ جی سے پانچ ہزار بطور ایڈوانس تنخواہ بھی لے گئے۔ شاہ جی نے بھی ایڈوانس دینے میں دیر نہ لگائی کہ اچھا کاریگر مشکل سے ہاتھ لگتا ہے۔

اگلے دِن بھی خوب رونق میلہ لگا رہا۔ وہ کام ہوتے رہے جو اِس قسم کے کاروبار کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ جن میں برتنوں' فرنیچر کا آڈر وغیرہ شامل تھے۔ شاہ جی کی مصروفیات کے باعث ہم نے اُسی موبائل فون والے رکشے سے رابطہ کیا اور پھر وہ ظالم ہمیں لیئے پھرتا رہا۔ پہلی بار ہمیں احساس ہوا کہ ہماری ہڈیاں کمزور ہوچکی ہیں کہ انگ انگ دُکھنے لگا البتہ رات کو نیند بہتر آنے لگی' وہیں یہ عقدہ بھی کھلا کہ نیند کی گولی سے لاہور کا رکشہ بہتر ہے مگر افسوس! کہ اِسلام آباد میں رکشے کی ممانعت ہے۔

دو گھنٹے لاہوری رکشے میں سفر کرلیں' پھر جم جانے کی حاجت نہیں ہتی۔ رکشے والے کے مزے یوں بھی آئے تھے کہ ہم خوراک کا سروے کررہے تھے اور وہ اپنی ماہرانہ رائے دینے کے لئے اپنی من پسند کھانوں کی جگہوں پر لیئے پھرتا۔ ایسے میں وہ ہمیں "کوزی حلیم" والے کے پاس لے گیا۔ رش کا یہ عالم تھا کہ دس منٹ کھڑے رہ کر انتظار کرنا پڑا کیونکہ وہاں ہر وقت دو سو لوگ حلیم کھا رہے ہوتے ہیں۔ گائے کے گوشت کی حلیم بیس روپے پلیٹ اور چکن حلیم صرف تیس روپے میں۔ سونے پر سہاگا حلیم پر ڈالنے کے لوازمات یعنی ادرک' لیموں' تلا پیاز' ہری مرچ اور مسالہ قطعی مفت اور جس قدر چاہیں' استعمال کریں۔ بات یہاں ختم نہیں ہوتی' ہر پلیٹ میں ایک سفید سا تیل بنام اصلی گھی کا ایک چمچہ بگھار کے

طور پر بھی ڈالا جاتا ہے۔ ہمیں تادم تحریر سمجھ نہیں آیا کہ وہ کماتا کیسے ہوگا کیونکہ اُس حلیم میں کم از کم دال تو محسوس ہو رہی تھی اور دالوں کی قیمتوں سے سب ہی واقف ہیں۔

گھر جا کر شاہ جی سے حلیم کا ذکر کیا۔ اگلے چند گھنٹوں میں اُنہوں نے خوشخبری سنا دی کہ حلیم والے سے بات کر آئے ہیں اور روزانہ کی دو دیگ حلیم اُن کو مل جایا کرے گی۔ بائیس سال کا ''تجربہ'' واقعی رنگ دِکھا رہا تھا۔ شاہ جی میں ہم نے لاہوری طرزِ عمل کی واضح جھلک دیکھی جس میں ہر کام میں کہا جاتا ہے کہ ''ہو جائے گا'' --- کوئی بات کر لیں' سامنے والا یہی کہے گا کہ ''ہو جائے گا'' مثلاً دوکان میں گیس نہیں لگی ہوئی' لگ جائے گی --- اسٹاف نہیں ہے' مل جائے گا --- پرنٹنگ کا کام باقی ہے' ہو جائے گا --- فلاں کام' ہو جائے گا --- فلاں بات' ہو جائے گی --- ہر جملے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''فلاں بندہ میرا جاننے والا ہے' فلاں بندہ میرا دوست ہے --- چھٹے دِن شاہ جی صبح سے غائب تھے' ساتویں دِن ہم نے واپس چلے جانا تھا۔ رات دیر سے واپس لوٹے اور دیر تلک باتیں ہوئیں۔ ہم نے پوچھا۔

''تمام دِن کہاں غائب رہے؟''

''وہ چنے سپلائی کرنے والے کا مسئلہ آ گیا تھا۔ کمینہ اپنی بات سے پھر گیا ہے۔ کہتا ہے کہ چنے سپلائی کروں گا مگر ''تری'' خود بنانا پڑے گی۔ اچھا ہوا جو ابھی پتہ چل گیا' افتتاح کے بعد ایسا ہوتا تو بڑا مسئلہ ہو جاتا' پھر مَیں نے سوچا کہ کمائے وہ اور محنت میں کروں --- لہٰذا فی الحال ناشتہ لگانے کا پروگرام منسوخ!''

''ٹھیک ہے بھئی' سوچ سمجھ کر کام کرنا چاہیے۔ ویسے بھی رات دیر سے آتے تو صبح ناشتہ لگانا مشکل ہوتا ہے' دوپہر کو بریانی ہی ٹھیک ہے۔''

''بریانی والے بھی پاگل ہیں۔ کہتے ہیں کہ پہلے چار لاکھ ناقابلِ واپسی جمع کرواؤ' صرف ہمارا نام حاصل کرنے کے لئے' پھر بریانی ملے گی۔ اگر کاروبار نہ چلا تو چار لاکھ گئے --- اچھا ہوا پہلے ہی پتہ چل گیا' بعد میں پتہ چلتا تو بہت نقصان ہوتا۔''

''تو کیا دوپہر کو صرف حلیم لگاؤ گے؟''

''حلیم کو چھوڑیں' اب وہ کہہ رہا ہے کہ اپنا پورا کرنا مشکل ہے' آپ کو کیسے سپلائی کریں --- اچھا ہوا پہلے ہی پتہ چل گیا ---''

''ورنہ بڑا نقصان ہوتا --- چلو ساری توجہ باربی کیو پر ہی دے دینا' ناشتے لنچ کو بعد میں دیکھا جائے گا۔''

''کاریگر نے ابھی سے نخرے دِکھانے شروع کر دیئے ہیں' اب رہائش بھی مانگ رہا ہے۔''

''اچھا ہوا پہلے ہی پتہ چل گیا ورنہ بہت نقصان ہوتا --- بہرحال' اچھی دوکان مل گئی ہے' پھر سے کوشش کرو۔''

''ہاں کوشش کر رہا ہوں کہ کوئی اچھی دوکان مل جائے۔ اُس دوکان پر تو مقدمہ نکل آیا ہے' اسٹے آرڈر ہے۔ دوکان اِس وقت تک نہیں کھل سکتی جب تک مقدمے کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ مَیں تو اپنے پیسے بھی واپس لے آیا ہوں۔''

''اچھا ہوا جو پہلے ہی پتہ چل گیا --- چند ہزار کا نقصان بقول تمہارے' نقصان نہیں ہوتا بلکہ بڑے نقصان سے بچا لیتا ہے۔''

صبح ہی ہم نے رکشے والے کو فون لگایا اور شاہ جی کو سوتا چھوڑ کر اسٹیشن کی راہ لی۔ گھر پہنچ کر شاہ جی کو بتانے کے لئے فون لگایا کہ ہم خیریت سے پہنچ گئے ہیں تو وہ بولے۔

''آپ پھر کب آ سکتے ہیں' مَیں نے فیصلہ کیا ہے کہ اجناس کے ہول سیل کا کاروبار کروں' بہت منافع ہے اِس میں۔ آپ کو بھی شامل کروں گا۔''

''بھئی' ہمیں معاف ہی رکھو' خدا حافظ!''

اچھا ہوا پہلے ہی پتہ چل گیا۔

☆☆☆

جادوئی کمالات سیکھیے

☆ٹی وی کا سٹار خواتین کا پرستار ایم عادل گلزار سے جادوئی کمالات سیکھ کر بہت سے لوگ نامی گرامی کنجوسوں کو جھانسہ دے کر اپنا گزر بسر کر رہے ہیں۔ 2 ہی' شارا نجھا' آم ریکا اور انگ لینڈ سمیت دُنیا بھر کے لوگوں کو ایک لمحے میں بیوقوف بنائیں اور ہو جائیں کروڑ پتی اور ناکامی کی صورت میں رفو چکر --- کامیاب گیرے بازوں کی تصاویر بمعہ تعارف ٹی وی' اخبارات اور تھانوں میں نمایاں کر کے آویزاں کی جانے کی گارنٹی 420% فیصد --- ہم سکھاتے ہیں جعلی شناختی کارڈ بنانا' PIA کا جعلی ٹکٹ' ریل ٹکٹ کی قیمت میں' جعلی ویزہ' مال دار لڑکی پٹا کر اِس کے باپ کا مال بٹورنا' نوٹوں والا تھیلا غائب کرنا' اپنے علم سے دوسرے بندے کو رام کرنا' حسد کی تیلی جلا کر ارمانوں کو آگ لگانا اور اِس کے علاوہ اَن گنت کرتب سیکھنے کے لئے غیر رجسٹرڈ سم نمبر پر ابھی 5 روپے میں مفت کال کریں یا دل میں خواہش کریں' ہمارا نمائندہ آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔

بے وقوف اور امیر خاندان کی خواتین کو گھر جا کر ہی ہم اپنا کام دکھا آتے ہیں اوہ --- سوری' سکھا آتے ہیں۔

خصوصی پیکیج: دور سے آنے والوں کو چند منٹوں سے تتر بتر کرنے کا معقول انتظام موجود ہے۔

تمام چھوٹے بڑے کورسز کی فیس آپ کی جیب میں موجود رقم پر منحصر ہے۔ آیئے اور دیکھئے' ہم آپ کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

پتہ: میجک بوائے گروپ' پاگل پورہ شیدائیاں دی گلی' فراڈ آباد

محمد عادل گلزار' فیصل آباد

بھولا تے عوامی

نئے پڑھنے والوں کو بھولا اور عوامی سے تھوڑا سا متعارف کروا دیں۔ بھولا ایک خوددار‘ ذہین اور باضمیر اِنسان ہے جبکہ عوامی اُس کا اُلٹ ہے۔ بدقسمتی سے عوام میں عوامی ہی زیادہ ہیں--- بہرحال‘ دونوں ایک دوجے کو برداشت بھی کرتے رہتے ہیں‘ اِسی وجہ سے اُن کی دوستی برقرار ہے۔ دونوں ہر موضوع پر گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ آپ بھی سن لیں‘ شاید آپ کو اپنے ہی معاشرے کی عکاسی ملے۔ آج یہ دونوں ریل کار سے پنڈی سے لاہور جارہے ہیں۔

بھولا: یار‘ عوامی! تم بھی کمال کی چیز ہو‘ اتنی آسانی سے ٹکٹ کیسے لے لیا؟

عوامی: قائداعظم کی مہربانی ہے‘ یار!

بھولا: ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ ملک قائداعظم نے بنایا تھا‘ چلا بھی وہی رہے ہیں۔

عوامی: اِسی لئے میں گاتا ہوں کہ ”اے قائداعظم! تیرا احسان ہے احسان“--- بس جیب میں براؤن‘ نیلے‘ ہرے قائداعظم ہوں تو پھر پیارے وطن میں کوئی مسئلہ نہیں۔

بھولا: شکر ہے‘ یار! ڈبہ تو صاف ستھرا ہے۔

عوامی: یہ بھی قائداعظم کی وجہ سے ہے--- بھئی‘ اِس کا ٹکٹ چار سو روپے ہے۔ ایک سوبیس اکانومی کلاس میں دیکھو تو پتہ چلے گا کہ وہاں اِنسان نہیں‘ جانور گھسیڑے جاتے ہیں اِسی لئے میرا فارمولا ہے کہ جیسے بھی ہو‘ مال بناؤ اور عیش کرو۔ پتہ نہیں اکانومی کلاس میں لوگ سفر کیسے کر لیتے ہیں۔

بھولا: خود ہی تو کہتے ہو کہ جانوروں کی طرح--- لعنت اِس ریلوے انتظامیہ پر بھی ہے۔ اکانومی کلاسوں میں تو پانی کی سہولت بھی مکمل طور پر نہیں‘ پنکھے لگے ہیں مگر چلتے نہیں۔ پتہ ہے‘ کیوں نہیں چلتے؟

عوامی: شاید بجلی کی لوڈشیڈنگ وجہ ہو۔

بھولا: جی نہیں‘ جتنی پاور کے جنریٹر لگے ہیں‘ وہ صرف اَپر کلاس کے AC چلانے میں صرف ہو جاتے ہیں اور جو UPS لگے ہیں‘ اُن کی بیٹریاں ناکارہ ہیں اور یہ سب انتظامی بدفعالیوں کا نتیجہ ہے۔ بے غیرت اسٹاف اگر اپنی روٹی حلال کر کے کھائیں تو ریلوے کے آدھے مسائل ویسے ہی حل ہو جائیں۔

عوامی: سانوں کی‘ ہم نے تو چار سو والا ٹکٹ خریدا ہے۔ ہم تو آرام سے جائیں گے‘ نا! ویسے ریلوے کے باقی آدھے مسائل کیسے حل ہو سکتے ہیں؟

بھولا: ریلوے کو مکمل بند کر کے--- ”نہ رہے گا بانس‘ نہ بجے گی بانسری۔“

عوامی: چھوڑ‘ یار! ٹرین کو‘ یہ تو چل پڑی ہے‘ کوئی اور بات کرو۔

بھولا: ضرور کرو۔

عوامی: کچھ فلمی دُنیا کا بتاؤ۔ میرا کیسی اداکارہ ہے؟

بھولا: وہ تو مجھے معلوم نہیں ہے البتہ انگریزی بہت اچھی بولتی ہے۔ معلوم ہے ایک اِنٹرویو میں اِنٹرویو لینے والے نے میرا کو کہا۔ "Happy Birthday to you" تو میرا نے جواب میں کہا "Same to you"

عوامی: ہا‘ ہا‘ ہا--- اِس میں غلط کیا ہے؟

بھولا: کچھ نہیں‘ بس اِنٹرویو لینے والے کی اُس دِن سالگرہ نہیں تھی۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی‘ نا! جیسے تم کسی کے والد کے مرنے پر افسوس کرو اور وہ جواب میں کہے کہ تمہارے باپ کے مرنے کا بھی افسوس ہے جبکہ تمہارے والد زندہ ہوں۔

عوامی: انگریزی میں "Same to you" کا مطلب ہے کہ وہ واقعہ جو بھی آپ کے ساتھ پیش آیا اور آپ کے جو جذبات تھے‘ اِس وقت میرے بھی یہی جذبات ہیں۔

بھولا: پاگل‘ تم بھی میرا ہی ہو---!

عوامی: آج کل انڈین فلمیں ہمارے یہاں بہت لگ رہی ہیں‘ میرے خیال میں یہ بہت اچھا ہو رہا ہے‘ اِس طرح ہمارے سینما ہال پھر سے چل نکلیں گے۔

بھولا: اور ہمارا قیمتی زرِمبادلہ (فارن ایکسچینج) بھارت منتقل ہونا شروع ہو جائے گا--- یار! یہ ہندو بڑا سیانا ہوتا ہے۔ کشمیر کو پسِ پشت ڈال کر تجارت پر زور دے رہے ہیں اور ہمارے حکمران اُن کے جال میں پھنستے ہی چلے جارہے ہیں۔

عوامی: چھڈو جی‘ ہن موجاں اِی موجاں--- انڈین فلمیں‘ ایشوریہ بڑے پردے پر۔ پہلے تو ہم شبنم کی ہچکیاں ہی سنتے سنتے بوڑھے ہوئے جا رہے تھے۔ ویسے تمہیں کون سی اداکارہ--- میرا مطلب ہے‘ پاکستانی اداکارہ پسند ہے؟

بھولا: صرف دو‘ یعنی پہلے مسرت شاہین اور آج کل نرگس!

عوامی: وہ کیوں---؟

بھولا: دونوں منافق نہیں ہیں‘ نا! اُن کے پاس جو ”کچھ“ ہے‘ وہ دِکھانے میں عار محسوس نہیں کرتیں۔ مثلاً مسرت شاہین تو اتنی شرمیلی ہیں کہ اپنا چہرہ دِکھاتے بھی شرماتی تھیں‘ صرف بیک دِکھایا کرتی تھیں اور نرگس نے وہ کچھ دِکھایا کہ دوسو روپے والا ٹکٹ ہزار روپے میں فروخت ہونے لگا۔

عوامی: ہا'ہا'ہا---اِس کا مطلب ہے کہ تم اسٹیج ڈراموں میں ہزار کا ٹکٹ لے کر نرگس کا دیدار کرتے رہے ہو؟

بھولا: نہ' بھائی! نہ' پہلی بات تو دیدار' نرگس کی بہن ہے پر اُس کے پاس دِکھانے کو کچھ ہے ہی نہیں' پھر یہ سب کچھ پینتیس روپے کی CD پر دستیاب ہے۔

عوامی: سنا ہے' اَب میرا' ریشم' ریما اور ثناء شادی کا سوچ رہی ہیں؟

بھولا: ہیروئن کی جب مارکیٹ نہ رہے تو پھر وہ شادی ہی کرتی ہے یا پھر بحالتِ مجبوری شادی کا اقرار کر لیتی ہے---صائمہ کو دیکھو' کتنی معصوم ہے۔ اُسے کئی سالوں بعد پتہ چلا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اکثر اوقات تو اِن ہیروئنوں کو بچے کی پیدائش کے بعد بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ شادی شدہ ہے---اِس پر مجھے ایک قصہ یاد آ گیا۔ میرا ایک دوست اپنی ایک دوست کو لے کر حکیم جی کے پاس گیا اور حکیم جی سے کہا کہ اِن محترمہ کے پیشاب میں بہت جلن ہے۔ حکیم جی نے غور سے لڑکی کو دیکھا اور پوچھا کہ کیا آپ شادی شدہ ہیں؟ لڑکی فٹ سے بولی کہ جی نہیں۔ حکیم صاحب نے دوسرا سوال کیا کہ کیا آپ کنواری ہیں۔ لڑکی نے عجیب سا منہ بنایا اور بولی کہ آپ کو بتایا تو ہے کہ مَیں غیر شادی شدہ ہوں۔ حکیم صاحب مسکرائے اور کہا کہ بی بی! مجھے علاج کرنا ہے' غیر شادی شدہ ہونا الگ بات ہے اور کنواری ہونا الگ بات ہے۔ اب کے لڑکی شرمائی' حکیم جی نے کوئی اور سوال نہ کیا اور دوا دے دی۔ میرا وہی دوست بتاتا ہے کہ اُس لڑکی نے بعد میں ''شوبز'' میں بڑا نام کمایا۔

عوامی: ہا'ہا'ہا---بڑے مزے کی بات ہے۔

بھولا: لو ایک اور مزے کی بات سن لو لیکن سمجھنا خود' مجھ سے سوال مت کرنا۔ ایک معصوم بچے کے پڑوس میں ایک شوبز کی زبردست عورت رہتی تھی۔ بچہ اُس کے شان و شوکت دیکھ کر بڑا متاثر ہوتا تھا۔ ایک دِن بچے نے اُس سے پوچھ ہی لیا کہ آنٹی! کیا آپ کا کوئی بہت بڑا بزنس ہے؟ آنٹی مسکرائی اور جواب دیا کہ نہیں' بچے! بس چھوٹا سا ''ہول سیل'' کا بزنس ہے۔

عوامی: ہا'ہا'ہا---سمجھ نہیں آیا۔

بھولا: چلو' اچھا ہی ہوا جو سمجھ نہیں آیا وگرنہ کل تم بھی آنٹی کے پاس منڈلا رہے ہوتے۔

عوامی: اب ایسی بھی بات نہیں' ویسے کم از کم اُس بچے کا پتہ تو بتا دو جو اتنا ذہین ہے۔

بھولا: اُسے چھوڑو---ویسے عوامی بھائی! آج کل کے بچے کچھ زیادہ ہی فاسٹ ہیں' شاید فاسٹ فوڈ وجہ ہو گی۔

عوامی: جی نہیں' یہ ڈبے کے دودھ کے کمالات ہیں۔ ہمیں تو اب دودھ بھی ماں سے نہیں' بھینس سے بخشوانا پڑے گا۔

بھولا: اور یہ بھینس امریکن سنڈی والی کھاد سے تیار شدہ چارہ کھاتی ہے' شاید اِسی وجہ سے ہماری نئی نسل رج کے بے شرم ہو رہی ہے۔

عوامی: بھولے! تم نے تو اُس شعر جیسی بات کر دی---

نگس کو باغ میں جانے نہ دیجو
ناحق خون پروانے کا ہو گا

یعنی نہ مجھے تمہاری بات سمجھ میں آئی' نہ ہی آج تک اِس شعر کا مطلب سمجھ میں آیا ہے۔

بھولا: واللہ' شعر لاجواب ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ نگس یعنی' شہد کی مکھی کو باغ میں جانے نہ دیجئے' وگرنہ پروانے کا خون ہو جائے گا۔ یعنی شہد کی مکھی جب باغ میں جائے گی تو پھولوں سے رس چوسے گی اور اپنا شہد محفوظ رکھنے کے لئے موم کا چھتا بنائے گی۔ بعد میں اِس موم سے موم بتی بنے گی' موم بتی جلے گی تو پروانہ آئے گا اور جل مرے گا۔

عوامی: توبہ ہے' یار! شاعر اتنی دور کی کیسے سوچ لیتے ہیں؟ مجھے تو پنجابی

فتنہ کے فتنے

- دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ واقعی دور سے وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی---بدر سعید
- ☆ وہ اب بھی خوبصورت ہے' صرف آپ کی نظر مزید پھر ''دور'' دیکھنے میں مصروف ہے۔
- عورت کے لئے راز سے زیادہ بوجھل چیز دُنیا میں کوئی اور نہیں---پرنس کشمیری
- ☆ ہے' نا! جھوٹے پرنس اور جھوٹے مرد!
- لڑکیاں ہرگز بُری نہیں ہوتیں' صرف اِن کی عادتیں بُری ہوتی ہیں---ٹارزن 421
- ☆ تو آپ کون سا آسمان سے اُترے ہیں؟ آخر آئینے میں اپنا ہی چہرہ نظر آتا۔ چکورو! آؤ مل کر چاند سے سارے فتنے ختم کر دیں---نامعلوم
- ☆ تمام فتنے مردوں سے ہی جنم لیتے ہیں' پہلے اپنی اصلاح تو کریں۔
- مَیں بیوی سے بالکل نہیں ڈرتا کیونکہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی---ٹارزن 421
- ☆ ٹارزن جی! جیسی آپ کی صحت ہے (تنکا پہلوان جیسی) آپ کو شادی اور بیوی دونوں سے ڈرنا چاہئے۔
- مَیں بہت کم بولتی ہوں' اِس نے تین گھنٹے بعد مجھے قائل کر ہی لیا---بدر سعید
- ☆ آپ جیسا جاہل' اَن پڑھ تین گھنٹوں میں قائل ہوا' آپ تو ڈھیلے عاشق کو بھی پیچھے چھوڑ گئے؟
- گدھے کو ہر طرف ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے جبکہ محبوبہ کو ہر طرف بیلنس ہی بیلنس---ٹارزن 421
- ☆ اِسی لئے آپ کو ہرا بھرا مظفر آباد پسند آیا' واقعی آپ کو ''ہرا ہی ہرا'' پسند آیا۔
- مَیں بیگم سے نہیں ڈرتا---یہ کہنے کا حکم بھی بیگم نے دیا تھا---بدر سعید
- ☆ لوگ چھپے رستم نکلتے ہیں' آپ تو چھپے ہوئے زن مرید نکلے۔

حرا اعوان المعروف فتنہ' مظفر آباد

فلموں کے شاعر پسند ہیں، سیدھی سیدھی بات کرتے ہیں۔ مثلاً---

میری ویل دی قمیص اَج پاٹ گئی اے

یا پھر---

اَج کٹ کے چھی پا میرا اَنگ اَنگ ہلا

یا پھر---

مینوں نوٹ وکھا میرا موڈ بنے

یہ ہے حقیقی شاعری، بھلا یہ کیا ''مکھی کو باغ میں جانے نہ دیجو''--- کتنی غیر حقیقی فرمائش ہے۔ بھلا شہد کی مکھی کو کیونکر روکا جائے، پھر شہد کیا شاعر کے ابا جان بنائیں گے؟

بھولا: عوامی! تمہارا ذوق واقعی بہت عمدہ ہے اِسی لیے عمدہ شاعری دفن ہوتی جارہی ہے اور ''ویل دی قمیص'' والی شاعری پروان چڑھ رہی ہے۔

عوامی: یار، بھولے! یہ بھی تو سوچو کہ آج کل کے بھڑ کیلے ڈانس اِس قسم کی شاعری پر ہی ہو سکتے ہیں، نہ اب غالب کی شاعری پر بریک ڈانس تو ہونے سے رہے۔

بھولا: ایک مرتبہ مشہور شاعر جوش ملیح آبادی سے کسی نے پوچھا کہ یہ ناچ کیا ہوتا ہے؟ تو اُنہوں نے جواب دیا کہ رقص اعضا کی شاعری ہوتی ہے۔ خیال رہے، نہ اُنہوں نے ناچ کا لفظ استعمال کیا، نہ ڈانس کا کیونکہ اصل شے رقص ہے اور رقص ایک فن ہے۔ جسے تم ڈانس کہتے ہو، وہ بیہودگی ہے۔ حیف ہے اپنے جسم کی نمائش کو بھی لوگ ڈانس کہتے ہیں۔

عوامی: یار، بھولے! آج کل زمانہ فاسٹ ہے۔ پہلے ہیروئن جتنی دیر میں انگڑائی لیتی تھی، اب اتنی دیر میں وہ چھ جوڑے تبدیل کر لیتی ہے۔

بھولا: اور اِسے تم فن کہتے ہو؟

عوامی: فن کو گولی مارو، رانجھا تو راضی ہو جاتا ہے، نا! اب اسٹیج ڈرامے میں نرگس کے ڈانس کو دیکھو، ایک ٹکٹ میں کئی مزے۔ میزبان بھی خوش، عوام بھی خوش۔

بھولا: تمہیں تو ثقافت کا وزیر لگا دینا چاہئے--- ویسے نرگس اینڈ کمپنی نے ڈرامہ تو ختم ہی کر دیا ہے۔ بس پہلے جو مجرا لاہور کی ہیرا منڈی میں ہوا کرتا تھا، اب اسٹیج پر سرِعام ہو رہا ہے۔ پورا معاشرہ تباہ ہو رہا ہے۔

عوامی: ہر بات پر کہہ دینا کہ معاشرہ تباہ ہو رہا ہے، ٹھیک نہیں۔ بھئی، معاشرے کو کہو کہ نہ جائے اسٹیج شو دیکھنے، کوئی اِن کو زبردستی کہتا ہے کہ پیسے اور وقت خرچ کرو اور ڈرامہ دیکھو؟

بھولا: اوبھائی! پاکستان میں ٹینشن کے علاوہ ہے ہی کیا؟ لوگوں کو تفریح تو چاہئے۔ پہلے بھی ڈرامے ہوتے تھے۔ سہیل احمد، ببو برال، امان اللہ کے ڈرامے بھی تو خوب چلا کرتے تھے۔ اب تو ''نرگس اینڈ کمپنی'' نے جسم کی نمائش کر کر کے بیڑا غرق کر دیا ہے۔ مجھے تو کبھی سمجھ نہیں آیا کہ چھاتی دِکھانا یا چھاتی ہلانا یا پشت لہرانا کہاں کا فن ہے اور اِس میں مزاح کا کون سا پہلو ہے؟

عوامی: ہوسکتا ہے کہ یہ ساری ہیروئنیں دمے کی بیماری میں مبتلا ہوں اِس لئے زور زور سے سانس لیتی ہوں۔ اب تمہاری نظریں ہی گندی ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں؟--- اچھا دفع کرو اِن باتوں کو، یہ بتاؤ اِس خبر کا کیا مقصد ہے کہ ''برطانیہ کے سابقہ وزیراعظم ٹونی بلیئر ٹرین میں بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہوئے پکڑے گئے؟''

بھولا: یہ گورے بڑے شیطان ہیں، یہ واقعہ جان بوجھ کر کیا گیا ہے تاکہ دُنیا کو دِکھایا جا سکے کہ اِن کے یہاں کتنا انصاف ہے۔ اگر یہی واقعہ کسی پاکستانی سابقہ وزیراعظم کے ساتھ پیش آتا تو جانتے ہو کیا بیان آتا کہ پاکستانی وزیراعظم بغیر ٹکٹ اِس لئے سفر کر رہے تھے کیونکہ اُنہوں نے ٹرین خرید لی تھی--- ویسے یاد کرو کہ اِس قسم کی پبلسٹی ہمارے سابقہ وزیراعظم نواز شریف نے بھی کی تھی جب انہوں نے موٹروے بنائی تو سب سے پہلے اپنا چالان کروایا اور جرم تھا تیز رفتاری اور پھر باقاعدہ پچاس روپے جرمانہ دے کر ''رہا'' ہوئے تھے۔

عوامی: پھر تو پاکستان میں زیادہ انصاف ہوا، نا! کیونکہ ہمارا وزیراعظم تو حاضر سروس تھا۔

بھولا: رہنے دو، بھائی! وطنِ عزیز میں جتنا انصاف ہے، وہ تو بچہ بچہ جانتا ہے۔ وہ تم نے سنا ہو گا کہ ''دُلہن وہی جو پیا من چاہے۔'' یہاں انصاف بھی وہی جو حکمران چاہے۔

عوامی: یار، بھولے! یہ ہمارے جج بحال کیوں نہیں ہو رہے؟

بھولا: یار! تم بڑے سادے ہو۔ اگر بحال بھی ہوئے تو ویسے ہی بحال ہوں گے جیسے حکمران چاہے گا۔ پتہ ہے، ہمارے ملک میں سب سے کمزور شے کون سی ہے جسے توڑنا بچوں کا کھیل ہے؟

عوامی: اخلاق یا وعدہ---!

بھولا: نہیں، پاگل! آئین ہے۔

عوامی: مجھے تو اِن باتوں سے فرق نہیں پڑتا، میرا باپ بھی یہی سب دیکھتے ہوئے مر گیا اور میں بھی ایک دِن مر جاؤں گا، پھر میری اولاد بھی یہی سب کچھ دیکھے گی مگر تمہارا کیا بنے گا، کالیا؟

بھولا: میں وہی کروں گا جو ایک سیانے بادشاہ نے کیا تھا۔ قصہ یوں ہے کہ ایک تھا بادشاہ، بڑا رحمدل انصاف پسند تھا اور اِس کا ایک قابل وزیراعظم تھا۔ ایک دِن شاہی نجومی بڑا پریشان سا آیا اور بادشاہ سے کہا حضور! ایک بھیانک خبر ہے۔ آپ کی سلطنت میں کالی بارش ہونے والی

ہے۔ اِس بارش کا جو بھی پانی پیئے گا، وہ پاگل، بے حس اور بے غیرت ہو جائے گا۔ حضور عوام کے مقبول عام بادشاہ ہیں سو کوئی تدبیر کرلیں--- پریشان بادشاہ نے وزیر اعظم سے مشورہ کیا تو وزیر اعظم نے کہا کہ حضور! جاہلوں نے یہاں بھی کالا باغ ڈیم نہیں بننے دیا لہٰذا پانی کے ذخائر ہیں ہی نہیں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں بادشاہ سلامت اور اپنے لئے پانی کا ذخیرہ کرلوں تا کہ کم از کم ہم دونوں ٹھیک رہ کر عوام کی راہنمائی کرسکیں اور ایسا ہی ہوا۔ خیر، صاحب! کالی بارش ہوئی اور تمام عوام نے وہ پانی پی لیا اور ویسے ہی ہو گئے جیسا نجومی نے کہا تھا۔ چند روز میں نیا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ چونکہ ساری عوام پاگل اور بے ضمیر ہو چکی تھی لہٰذا اُنہوں نے بادشاہ اور وزیر اعظم کو "پاگل پاگل" کہنا شروع کر دیا۔ رحمدل بادشاہ کے پاس 582B نہیں تھی جو اپنے خلاف بولنے والوں کا منہ بند کرسکتا۔ اُس نے پریشان ہو کر وزیر اعظم سے مشورہ کیا۔ وزیر اعظم نے مشورہ دیا کہ ہم دونوں کو بھی کالی بارش کا پانی پی لینا چاہئے اور ایسا ہی کیا گیا۔ وہ دونوں بھی پاگل اور بے ضمیر ہو گئے۔ عوام نے پھر سے نعرے لگانے شروع کر دیئے کہ "بادشاہ زندہ باد، وزیر اعظم زندہ باد" --- پس میں بھی سوچ رہا ہوں کہ اِس ملک میں زندہ رہنے کے لئے یا تو میں بھی یہ پانی پی لوں جو تم نے پی رکھا ہے یا پھر خودکشی کرلوں۔

عوامی: جو گندہ پانی ہم عوام پیتے ہیں، تم بھی وہی پی لو۔ پھر خودکشی کی ضرورت نہیں ویسے ہی اللہ کو پیارے ہو جاؤ گے۔ تمہیں تو منرل واٹر نے بچا رکھا ہے--- یاد آیا، سنا ہے کہ ہماری کچھ ہیروئین آب دست بھی منرل واٹر سے کرتی ہیں۔

بھولا: ایک تو ہر بات میں تمہیں ہیروئن یاد آ جاتی ہے۔ یہ وہی پڑھی لکھی ہیروئن ہیں جنہیں انگریزی کا بہت شوق ہے۔ حال ہی میں ہماری ایک صفِ اوّل کی ہیروئن نے ایک کالج بنایا جس کا نام ہے۔

"Girls College for Boys"

عوامی: ہا، ہا، ہا--- اُس نے یہ کالج اپنے گھر پر ہی کھولا ہوگا اور کلاس رات میں ہوتی ہوں گی۔

بھولا: ویسے وہ بیچاریاں بھی کیا کریں، فلموں میں کام ہے نہیں، اب کالج ہی چلائیں گی، خرچے تو پورے کرنے ہیں نا، بقول میرے---

ایک ہمیں عدلیہ کی رُسوائی مار گئی
دوسری یہ آنکھ کی بینائی مار گئی
تیسری حالات کی انگڑائی مار گئی
باقی کچھ بچا تو مہنگائی مار گئی

عوامی: واہ، واہ کیا بے کار شعر ہے۔ یار! غالب کی طرح بہادر بنو وہ کہتے ہیں کہ---

مشکلیں مجھ پہ اتنی پڑیں کہ آسان ہو گئیں

بھولا: اوُ بھائی! غالب کو تو پنشن ملتی تھی، اُن کو آٹا ڈھائی آنے من ملتا تھا، ولائتی شراب تین روپے بوتل مل جاتی تھی۔ پٹرول کا مسئلہ تھا ہی نہیں کہ ایک ہارس پاور کا تانگہ لیئے پھرتے تھے۔ غالب آج کل کے دور میں ہوتے تو آب پارہ چوک میں خودکشی کی ناکام کوشش میں اندر ہوتے۔

عوامی: یار، بھولے! پرانے زمانے کی سواریوں کے بارے میں کچھ اور بتاؤ؟

بھولا: واللہ، کیا زمانہ تھا۔ اُس زمانے کی سب سے بڑی سواری جسے آج کل بلٹ پروف BMW یا مرسیڈیز ہوتی ہے، پہلے وہ ہاتھی کی سواری تھی جس کا باقاعدہ ڈرائیور بھی ہوتا تھا۔ چونکہ اُس کا پٹرول یعنی کھانا پینا سب افورڈ نہیں کر سکتے تھے اِس لئے فقط امراء ہی اُسے استعمال کرتے تھے۔ آج کل کی عام کار کا مقابلہ اُس وقت گھوڑے کرتے تھے، بس کا کام تانگہ کرتا تھا، موٹر سائیکل کی جگہ بیل گاڑی نے لے رکھی تھی--- سوری، غلط کہہ گیا، گدھے نے لے رکھی تھی۔ پھر انگریز نے سائیکل ایجاد کر کے

الیکشن ملیکشن

ممبر بن کر اُس نے ایسا روپ نکالا ہے
باہر سے بھی کالا ہے وہ، اندر سے بھی کالا ہے
جو جو تو نے گند کیا ہے، سارا میرے سامنے ہے
زیادہ حاجی نہ بن، پیارے! میرا دیکھا بھالا ہے

☆

چھوٹی سی ایک میری عرض ہے آپ سے
مجھ کو تو آپ کے ہی ووٹوں کی لوڑ ہے
ہنستے ہوئے یہ بولا ووٹر غریب سا
مجھ کو بھی آج کل ہی نوٹوں کی لوڑ ہے

☆

کوئی آنکھ دِکھا کے ووٹ مانگے
کوئی سر جھکا کے ووٹ مانگے
کوئی منت، کوئی حیلے اور وسیلے سے
کوئی نوٹ دِکھا کے ووٹ مانگے

محمد کامران شہزاد محلہ معصوم آباد ضلع بھکر
موبائل: 0333-6846299

اِنسان کو جانور بنا دیا۔ میَں تمہیں پالکی کے بارے میں بتانا بھول گیا۔ سائیکل ایک مین پاور سے چلتی ہے' پالکی دو یا زیادہ تر چار مین پاور سے چلتی ہے جس کی موجودہ شکل جنازہ ہے۔ جنازہ پر ایک کرسی رکھ دو تو وہ پالکی بن جاتی تھی اور مین پاور اُسے اُٹھائے پھرتی تھی جنہیں اُس زمانے میں کہار کہا جاتا تھا۔ پالکی عام طور پر خواتین کی ٹرانسپورٹ ہوتی تھی۔

عوامی: بھولے بھائی! کچھ ججوں کی بحالی کے بارے میں بھی تو بتاؤ' آخر یہ مسئلہ کیا ہے؟

بھولا: یار! تم گھوم پھر کر ججوں پر کیوں آ جاتے ہو؟

عوامی: کیونکہ آج کل پوری قوم کا مسئلہ یہی ہے۔

بھولا: قوم کا وہی مسئلہ ہوتا ہے جو اُس کی سمجھ میں نہ آئے۔ تمہاری باتیں نشر ہونے تک نہ جانے اِس معاملے کا کیا سے کیا ہو چکا ہوگا۔ بہرکیف' میَں تمہیں کچھ اِس طرح سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ میَں خود گرفت میں نہ آ سکوں--- وہی ہزاروں سال پہلے کا فارمولا چل رہا ہے کہ "جس کی لاٹھی اُس کے جج او--- معاف کرنا' اُس کی بھینس" اور یہ فارمولا ہمیشہ سے مسلمانوں پر لاگو ہوا ہے' کافر تو انصاف بھی کر دیتے ہیں--- ایک تھے عباس خلیفہ! جب وہ صاحب بادشاہ بنے تو سب سے پہلے اُس عورت پر نظر پڑی جس پر وہ بچپن سے فریفتہ تھے اور کہ وہ حسین ترین عورت اُس کے والد محترم کی کنیز تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی من پسند عورت کو اپنے حرم میں کیسے شامل کریں۔ اُنہوں نے چیف جسٹس جو اُس وقت قاضی کہلاتے تھے' کو طلب کیا۔ چیف جسٹس نے اُنہیں بتایا کہ جو عورت اُن کے والد کے مستعمل رہی ہو' اُسے وہ اپنے حرم میں آئین کے مطابق شامل نہیں کر سکتے۔ بادشاہ کو جلال آ گیا اور اُس نے میان میں سے تلوار نکال لی۔ محافظوں نے چیف جسٹس کو پکڑ لیا تاکہ بادشاہ آسانی سے اُس کی گردن مار لے۔ بادشاہ نے ایک مرتبہ پھر چیف جسٹس سے پوچھا۔

"بتاؤ میَں اپنے باپ کی کنیز کو اپنے حرم میں شامل کر سکتا ہوں یا نہیں؟"

چیف جسٹس نے برملا کہا۔ "حضور! نظریہ ضرورت کے تحت آپ ایسا کر سکتے ہیں۔"

بادشاہ تلوار واپس میان میں رکھتے ہوئے بولا۔ "تو پھر جاؤ اور اسی نظریہ ضرورت کے مطابق عدالت میں جا کر فتویٰ جاری کر دو۔"

اور ایسا ہی ہوا اور پھر آج تک ایسا ہی ہوتا آ رہا ہے--- یار! کوئی اور بات کرو' یہ جج کے قصے سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔

عوامی: چلو جج کی بات چھوڑ' یہ تو بتا دو کہ یہ "نظریہ ضرورت" کیا ہے؟

بھولا: بتا تو دیا' یار! اب اور کیا بتاؤں آسان لفظوں میں جو بات قانون اور آئین کے مطابق نہ کی جا سکے' اُسے اِس نظریہ ضرورت کے مطابق کر ڈالو۔ تمہارے پاس موبائل نہیں ہے' کسی سے بھی موبائل چھین لو البتہ چھیننا "نظریہ ضرورت" کے مطابق۔ کسی کی جائیداد پر قبضہ کر لو' کسی کی کار لے اُڑو' ناجائز تجاویزات بنا لو' ہر کسی کا حق مار دو' ہر ناجائز کام کر ڈالو۔ حد تو یہ ہے تمہارے پاس محبوبہ نہیں' دوسرے کی محبوبہ اغواء کر لو۔ کروڑوں کے قرضے معاف کروا لو' بجلی گیس چوری کرو۔ نظریۂ ضرورت زندہ باد' پاکستان پائندہ باد!

عوامی: سیاست دانوں نے عوام کو جج کے پیچھے لگا رکھا ہے اور اصل مسئلہ' آٹے کی طرف توجہ ہی نہیں دے رہے۔

بھولا: اِس ملک کے سیاست دانوں بلکہ نام نہاد دانشوروں کو ختم کر دو تو یہ ملک شاید مکمل تباہ ہونے سے بچ جائے۔

عوامی: یار! تم تو غصے میں آ جاتے ہو' مجھے لگتا ہے کہ جیسے سوال کر کے میَں نے تمہاری دُم پر پیر رکھ دیا ہو؟--- یار! ذرا لائٹ موڈ میں بات کرو۔ چلو' کچھ میڈیا اور ٹی وی چینلز کے بارے میں کچھ بتاؤ' کہتے ہیں کہ مملکت کے یہ چوتھے ستون ہوتے ہیں۔

بھولا: لو کر لو جی' گل۔ پہلے تین ستون کون سے قائم ہیں؟ میڈیا تو ایک الگ مصیبت ہے۔ پہلے ہی قوم ڈیپریشن کا شکار ہے' مجھ جیسے لوگ تو اخبار پڑھتے ہی باتھ روم میں ہیں' ہیجانی خبریں پڑھ کر اِنسان آسانی سے فراغت حاصل کر لیتا ہے۔

عوامی: کچھ چینلز کے بارے میں بتاؤ؟

بھولا: کیا خاک بتاؤں' یار! میڈیا کی آزادی نے عجیب ہی رنگ اپنا لیا ہے۔ اتنے چینلز ہو گئے ہیں کہ سب کے بارے میں کچھ بتانا مشکل ہے۔ چلو میَں تمہیں چند ایک کے بارے میں کچھ بتا دیتا ہوں' فیصلہ تم خود کر لینا کہ یہ سب کیسا ہو رہا ہے۔ پہلے جیو ٹی وی کا سنو۔ خبریں پھر خبریں' پھر وہی خبریں' پھر دھڑم سے بریکنگ نیوز۔ اب خدا کی مار اِس بریکنگ نیوز پر' پہلے کبھی بریکنگ نیوز کوئی بڑی خبر ہوا کرتی تھی اور عوام کے کان کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ مثلاً بریکنگ نیوز ہوتی تھی کہ اِنسان چاند پر اُتر گیا' پاکستان میں فوج نے پھر قبضہ کر لیا' بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا اور آج کل' دھڑام' دھڑام بریکنگ نیوز--- ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ ملتان میں ایک عورت سڑک پر بیٹھی ہے اور بچوں کے گلے میں تختی لگا رکھی ہے کہ بچے برائے فروخت۔ چلیے' ہم اپنے نمائندہ خصوصی سے موقع پر بات کرتے ہیں۔ پھر بریکنگ نیوز--- ایک سوزکی وین نے سائیکل سوار کو ٹکر مار دی--- پھر بریکنگ نیوز کا سلسلہ MQM اور PPP میں

رابطہ' MQM کے ارکان ناراض۔ MQM کے ارکان مسکرائے' MQM کے ارکان سنجیدہ ہو گئے۔ MQM نے کہا کہ PPP والے سنجیدہ نہیں' MQM نے رابطوں کی بحالی کا اعلان کر دیا' MQM نے حزبِ اختلاف میں بیٹھنے کا اعلان کر دیا۔ MQM نے کہا ہمیں وزارتوں کا لالچ نہیں' MQM نے PPP سے غیر مشروط تعاون جاری رکھنے کا اعلان کر دیا' MQM سے PPP کا رابطہ--- MQM نے حکومت میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا' MQM نے حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ عوام کی بھلائی کے لئے کر لیا' ایم کیو ایم کے PPP سے کامیاب مذاکرات۔ MQM نے تیرہ وزیروں اور ایک مشیر کا اعلان کر دیا' کل MQM کے تیرہ وزیر اور ایک مشیر حلف اُٹھائیں گے' MQM کے 13 وزیروں اور ایک مشیر نے حلف اُٹھا لیا۔ MQM کے کارکن خوشی سے ناچ رہے ہیں' دھڑام دھڑام---اور یہ سب بریکنگ' پھر بریکنگ' پھر بریکنگ نیوز پر آئے چلا جا رہا ہے' آئے چلا جا رہا ہے۔ ہر تھوڑی بعد اقبال بانو کا گانا ''ہم دیکھیں گے'' چلا دیا جاتا ہے۔ پتہ نہیں کون دیکھے گا مگر دیکھنے والے عاجز آ گئے ہیں۔ دوسرے پروگراموں میں حامد میر کیپٹل ٹاک لے کر مہمانوں کو وہ بولنے پر مجبور کرتے دِکھائی دیتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں۔ کامران خان ٹیلی فون لگا لگا کر ماہرین کی رائے لیتے رہتے ہیں۔ اِن ماہرین سے عوام عاجز آ گئے ہیں کیونکہ اِن لوگوں کی باتیں سب کتابی ہوتی ہیں جبکہ ہو وہی رہا ہے ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' ---ڈاکٹر شاہد مسعود آتے ہیں میرے مطابق اُن کے مطابق لیکن یہ سب کچھ ہوتا ہے غیر مطابق۔ وہی نمونے جو ہر چینل پر بیٹھے ہوتے ہیں' اِس پروگرام میں بھی اپنی قابلیت جھاڑ رہے ہوتے ہیں۔ پھر ''پچاس منٹ' آمنے سامنے'' اور پتہ نہیں کیا کیا۔ اِن سارے پروگرام میں اشتہارات کی بھرمار ہوتی ہے' لوگ ریموٹ کا استعمال بے دریغ کرتے ہیں مگر حاصل کچھ نہیں ہوتا' دوسرے چینلز پر بھی وہی کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہی چہرے' وہی باتیں' وہی اشتہار' وہی تازہ ترین' وہی تازہ ترین---اَب آؤ آج ٹی وی کی جانب۔ وہاں بریکنگ نیوز کو ''آج اور ابھی'' کہا جاتا ہے۔ لاہور کے محلے میں گیس سلنڈر پھٹ گیا (آج اور ابھی) نہر میں ایک بچہ ڈوب گیا (آج اور ابھی) ریل کے نیچے آ کر عورت نے خودکشی کر لی (آج اور ابھی) (آج اور ابھی) MQM, MQM, MQM---آج کے نیوز ڈائریکٹر طلعت حسین' پرویز مشرف سے زیادہ خود T.V پر نظر آتے ہیں۔ اپنے پروگرام ''لائیو وِد طلعت'' (جو کہ لائیو پروگرام نہیں ہے) میں وہی باتیں' وہی لوگ' وہی اشتہار۔ اِن کے بھی خاص ستارے شیخ رشید' حنیف عباسی' ریٹائرڈ جسٹس اپنی قابلیت جھاڑتے رہتے ہیں۔ رات کو ''بولتا پاکستان'' پروگرام نصرت جاوید اور مشتاق منہاس پیش کرتے ہیں۔ اِس پروگرام میں نصرف جاوید شاید پاکستان ہیں کیونکہ وہی بول رہے ہوتے ہیں۔ کالر سے اِس طرح بات کرتے ہیں جیسے وہ اُن کی بھینس چرا کر لے گیا ہو۔ پھر آج ٹی وی میں اختراع بہت ہے۔ ایک لڑکے سلیم کو بیگم نوازش علی بنا کر اور اُس کے منہ سے ولگر جملے کہلوا کر صحافت کی خدمت ہو رہی ہے۔ ویسے اشتہارات مل رہے ہیں' پروگرام چل رہے ہیں۔ آزادئ صحافت کے نام پر۔ ARY چینل بھی کسی سے کم نہیں۔ فائزہ داؤد چیں چیں کرتی اتنی زور لگا کر بولتی ہیں کہ اُن کے میک اَپ کے خراب ہونے کا خدشہ ہو جاتا ہے۔ کاشف عباسی آف دی ریکارڈ میں ساری باتیں آن دی ریکارڈ کرتے ہیں۔ اِس پروگرام میں بھی اداکار وہی ہوتے ہیں بلکہ اُن کے کپڑے بھی وہی ہوتے ہیں جو ابھی دوسرے چینلز پر دِکھائی دے رہے تھے' بس سوال کرنے والے بندے بدل جاتے ہیں--- یہی سب کچھ پی جے میر کہتے ہیں' جاوید کہتے ہیں' عباس کہے ہیں۔ وہی سب کچھ سنائی دِکھائی دیتا ہے جو پہلے اُسی دِن دوسرے چینلز پر کئی بار دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ پی ٹی وی پیچھے کیوں رہ جائے' اِس نے بھی سب کچھ وہی شروع کر رکھا ہے جو پرائیویٹ چینلز کر رہے ہیں۔ بس تھوڑا سا فرق ہے۔ ماہرین میں اکثریت اِن کی ہوتی ہے جنہوں نے سابقہ حکومت یا صدر صاحب کا نمک کھا رکھا ہے۔ چینل ''پانچ'' کے نام کا چینلز بھی وہی کر رہا ہے۔ ''سماء'' نام کا چینل بھی ہر دَم وہی کچھ دِکھا رہا ہے جو ستر بار دوسرے چینلز پر دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ حق ٹی وی' پنجاب ٹی وی' انڈس ٹی وی' ڈان ٹی وی' بزنس پلس' CNBC' دِن ٹی وی۔ بس وہی بات ہے کہ ''ہر شاخ پہ اُلو بیٹھا ہے' تقدیرِ گلستان کیسی ہو'' --- پھر ایکسپریس ٹی وی اُن کے پاس تو تازہ ترین میں آنے کے لئے بہت سی وگنیں ہیں' بس کسی نہر کا پشتہ ٹوٹ جائے' یہ ایسے کوریج کریں گے جیسے تیسری عالمی جنگ چھڑ گئی ہو۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ تمام تقریباً تمام کے تمام چینلز اُن کے ہی ہیں جو اخبارات نکالتے ہیں۔ اِسے کہتے ہیں کہ ''ایک ٹکٹ میں دو مزے'' ---آزادئ صحافت کے بارے میں سنتے سنتے کان پک گئے ہیں لیکن خدارا' کوئی ضابطہ اخلاق' کوئی حدود و قیود بھی ہونا چاہئیں۔ اب یہ بھی نہیں کہ ایک بچے کے ختنے ہو رہے ہیں اور پچاس چینلز اِس کو لائیو بریکنگ نیوز کے طور پر پیش کر رہے ہو لیکن میری باتوں کو سمجھے گا کون' سوچے گا کون؟

☆☆

احمد فراز کے اصلی اشعار اور نقلی حسن کے تذکرے

حافظ مظفر محسن
0300-9449527

مئیں صبح سویرے لوڈشیڈنگ کے زیر سایہ شیو کرکے منہ دھو کر دفتر روانہ ہوا۔ گیلے بال اور سونے پر سہاگہ ہمارے علاقہ پر ترقیاتی کام نازل ہوئے دوسرا سال ہے۔ گیلے بالوں میں مٹی نے کیا رنگ جمایا ہوگا' آپ خود جانتے ہیں۔ نہ سمجھ آئے تو تجربہ کرکے دیکھ لیں۔ مجھے دفتر پہنچ جانے کی جلدی تھی۔ ایک تو حاضری لگانے والے کا خوف' دوسرا بہت سا کام جو میں پچھلے کئی دنوں سے ''کل کر لوں گا'' کے چکر میں جمع کرتا آ رہا تھا۔ تیسرا منہ پر جمی مٹی جو ''ترقیاتی کام'' کی وجہ سے ''کیچڑ'' کی طرح منہ پر چپکی ہوئی تھی--- نہ حاضری' نہ کام۔ سیدھا واش روم کی طرف بھاگا---تو ''مس جی'' واش روم سے نکل رہی تھیں۔ ''توبہ' یااللہ خیر!---مس جی' آپ بغیر میک اپ کے باہر آ گئی ہیں---'' مس جی کے منہ سے ''ہائے'' نکلا اور وہ پھر بھاگم بھاگ ''واش روم'' گھس گئیں۔ میں خوف کے مارے وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے مس جی کو پہلی بار بغیر میک اپ کے دیکھا تھا' کاش ایسا نہ ہوتا۔ ہر آدمی کا ایک امیج آپ کے دل و دماغ میں بنا ہوتا ہے' وہ چکنا چور ہو جائے تو قیامت ڈھا دیتا ہے۔ عبداللہ ارشد طویل عرصہ سے مس جی کے عشق میں مبتلا تھا اور ہم نے سن رکھا ہے کہ ہمارے دفتر میں تیس سال پہلے منیر بہادر اور سارا سید بھی کام کرتی تھیں۔ دونوں میں عشق کا دور چل رہا تھا' گویا دونوں عاشقی کی چکی میں پس رہے تھے۔ قسمت کی بدقسمتی کہ ایک دن جس شام منیر بہادر کے گھر والوں نے رشتہ مانگنے جانا تھا' منیر بہادر نے سارا سید کو میک اپ کے بغیر دیکھ لیا۔ ادھر منیر بہادر کے گھر والے رشتہ دیکھنے گھر سے نکلے' ادھر منیر بہادر ائیرپورٹ کی طرف چل نکلا۔ اگلے دن گھر والوں کو منیر بہادر کا فون آیا کہ میں نے سچائی جان لی ہے' اپنے کیے پر پشیمان ہوں۔ میں اس وقت انگلستان کی حدود میں داخل ہو چکا ہوں۔ میرے لئے دعا کیجئے گا' انشاء اللہ کبھی واپس نہ آؤں گا۔ شکریہ---!''

میں نے اسی لمحے عہد کر لیا کہ میں تاریخ تازہ نہیں ہونے دوں گا۔ ''مس جی'' باہر نکلیں تو میں اَدب سے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ گھبرا گئیں۔ میں نے کہا۔

''مس جی! ہمارے سامنے تو آپ ایک دفعہ بغیر میک اپ آ گئیں۔ خدا کے لئے' عبداللہ ارشد کے سامنے کبھی میک اپ کے بغیر مت آیئے گا---''

مس جی دوبارہ واش روم سے باہر نکلیں اور جب میں نے اپنا منہ شیشے میں دیکھا تو گھبراہٹ ہوئی۔ میں نے جلدی جلدی منہ دھویا اور سوچنے لگا کہ اگر میری منگیتر مجھے اس حلیے میں دیکھ لے تو کیا ہو؟---وہی ہو جو منیر بہادر نے سارا سید سے کیا تھا یعنی صاف جواب اور میرے گھر والے ''میرے دوست'' سب کو پھر سے میرا رشتہ تلاش کرنے کی فکر لاحق ہوئی اور شاید اس وقت دوبارہ رشتہ ملتا جب میں مشہور سیاسی شخصیت شیخ رشید آف لال حویلی کی طرح توبہ تائب کے درجہ پر فائز ہو چکا ہوں--- بات ہو رہی تھی میک اپ زدہ خواتین کی اور اصلی نقلی چہروں کی۔ اس سلسلہ میں ہم سیاستدانوں کے اصلی نقلی چہروں' ان کے بیانات' پھر اپنے ہی بیانات کی تردید اور پھر سے پہلے والے بیان کی خود ہی تصدیق کر دینا۔ یہ ایک ایسا غیر سنجیدہ موضوع ہے جس پر بڑی تفصیلی بحث ہو سکتی ہے جو گھنٹوں جاری رہ کر سنجیدہ شکل اختیار کر سکتی ہے اور انجام--- یاد رکھیں ایسی بحثوں کا کبھی کوئی انجام نہیں ہوتا۔

اکثر پاکستانی مردوں کو کوئی نہ کوئی موضوع چاہئے کہ جس پر وہ تفصیلی بحث کر سکیں۔ بے نتیجہ بحث---خواتین کو تو بحث کے لئے کبھی بھی موضوع کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ ادرک کی اقسام پر کئی کئی گھنٹے بحث کر سکتی ہیں اور آخر میں بات ادرکی رنگ کے سوٹ پر جا کر ختم ہو جائے گی۔ آج کل ادبی حلقوں میں اک نیا موضوع ہے اور اس پر بحث بھی شروع ہو چکی ہے۔ احمد فراز کے اصلی اشعار اک دوست جو ادبی دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں' انہوں نے اس موضوع پر کتاب چھاپنے کا اعلان کیا تو حیرت ہوئی کہ اس میدان میں دو نمبری شروع ہو گئی؟ صبح اک اردو کی تیسرے درجے کی ویب سائٹ کھولی تو وہاں بھی ادب و شاعری کے شعبہ میں اک عنوان موجود تھا---''احمد فراز کا اصلی کلام''---عجیب مشکل میں ڈال دیا ان لوگوں نے۔ کیا چائینہ کے کھلونوں کی طرح بڑے شعراء کا دو نمبر کلام بھی ادبی حلقوں میں دستیاب ہو گا؟ ٹونٹی ٹونٹی کرکٹ ٹورنامنٹ کی طرح دو نمبر مشاعرے بھی ہوا کریں گے---اک ویب سائٹ پر ''فراز کی اوریجنل غزل'' پڑھی اچھی لگی' ملاحظہ کریں---

پھرے گا تو بھی یونہی کو بکو ہماری طرح
دریدہ دامن و آشفتہ مو ہماری طرح
کبھی تو سنگ سے پھوٹے گی انجو غم کی
کبھی تو ٹوٹ کے روئے گا تو ہماری طرح
وہ لاکھ دشمن جاں ہو مگر خدا نہ کرے
کہ اس کا حال بھی ہو' ہو بہو ہماری طرح

غور کیا تو پتہ چلا کہ واقعی فراز کا اصلی کلام ہے۔ فراز کے کلام پر مبنی بہت سے سینکڑوں نہیں ہزاروں SMS مارکیٹ میں موجود ہیں جن میں پہلے مصرعہ میں اور کبھی دوسری لائن میں فراز کا نام فٹ کر دیا جاتا ہے۔ اس میں مزاحیہ SMS بھی ہیں اور کچھ بہت زیادہ سنجیدہ SMS---

فراز حور لگی تھی جو گھر سے وہ نکلی
وہ اس کے ساتھ کھڑا ہے' لنگور ہو جیسے

اک اور ایسا ہی چائینہ سے تیار SMS ملاحظہ کریں---

وہ پہلی بار جو رسوا ہوا تو میں نے فراز
کہا' ملے گی تجھے روز روز رسوائی

ابھی تک چائینہ میڈ SMS چلانے والوں کی غالب' میر تقی میر اور ایسی ہی دوسرے بڑے بڑے بلکہ بہت بڑے شعراء پر نظر نہیں پڑی۔ اللہ کرے' اردو شاعری کے یہ کوہ گراں ان لوگوں کی دسترس سے دور ہی رہیں کہ بے وزن شاعری کے اس دور میں ان بھاری بھر کم شخصیات کے ساتھ یہ زیادتی اچھی نہیں لگتی---احمد فراز کے حوالے سے ظالموں نے SMS کو کیا کیا رنگ دیا کس کس انداز میں پیش کیا احمد فراز مرحوم سے معذرت کے ساتھ ملاحظہ کریں---

کل میں نے اسے خوب ہنسایا جب فراز
ظالم جاتے ہوئے مجھے مسٹر بین کہہ گیا

خالی خالی شہر میں خالی خالی دن
آج احمد فراز کچھ کہنے کے موڈ میں نہیں

بڑے ظالم ہیں اس شہر کے لوگ اے فراز
سم بدل کے کہتے ہیں بتاؤ تو کون ہوں

اٹھا جو میرا جنازہ تو وہ چیخ کے بولے فراز
ٹھہر جاؤ' ابھی وڈی پھوپھی نے آنا ہے

اک شعر جو احمد فراز نے آخری مرتبہ ہسپتال میں کہا' بقول مارکیٹ میں SMS جاری کرنے والوں کے ملاحظہ ہو---

روز پھرتی ہو ان سفید کپڑوں میں فراز
کدی کالا جوڑا پا ساڈی فرمائش تے
منہ میٹھا کرنا ہے تو میرے پاس آ' فراز
مئیں تجھے اخروٹ اور کشمش کھلاؤں گا

☆☆

☆ کے۔ایم خالد

خفیہ ایجنسی

فخر الدین کو بچپن سے ہی اُدب سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ بڑے فخر سے اپنا سلسلہ نصب لکھنو کے شعراء سے جوڑتے مگر جب بھی انہوں نے اپنی اماں سے شجرہ بنوانے کی کوشش کی، نہ جانے کون سی غلطی ہو جاتی ان کے شجرے کے ڈانڈے ''لکھنو بینڈ باجے'' سے جا ملتے--- لکھنو دور کا مڑا تڑا پائجامہ، ایک کڑھا ہوا کرتہ اور چند غزلیں اور نظمیں ان کو وراثت میں ملی تھیں جوان کو زبانی یاد ہو چکی تھیں۔ جب مشاعرے میں فخر الدین لکھنو دور کے کرتہ اور چوڑی دار پائجامہ کی سلوٹیں دور کر کے پہنتے تو لکھنو کے بانکے معلوم ہوتے۔ لوگ ان سے ان کے والد کی نظم صرف اس وجہ سے سن لیتے کہ وہ لکھنو کے ایک عظیم شاعر کی نظم ہے۔ وہ جب سٹیج پر چڑھ کر للکارا مارتے کہ---

تانگے کے آگے گھوڑا
گھوڑے کے پیچھے تانگہ
سرپٹ بھاگ گھوڑے
ورنہ چابک دوں گا

تو سننے والے ''واہ واہ'' کے ڈونگرے برساتے اور فخر الدین کا فخر سے سینہ چوڑا ہو جاتا۔ فخر الدین نے اپنی حتی الوسع کوشش کی کہ وہ شاعری کے میدان میں اپنے باپ سے آگے نکل جائیں مگر باوجود کوشش کے وہ ایک بھی شعر کا اضافہ نہ کر سکے۔ ان کی خواہش تھی کہ عزت اور دولت جلد ان کے قدم چوم لے مگر ان کی یہ خواہش دل کی کسک بن کر رہ گئی۔ شاعری کو اپنے ہاتھ سے جاتا دیکھ کر انہوں نے نثر کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ شروع میں انہوں نے بچوں کے لئے کہانیاں لکھیں۔ وہ بڑوں کے لئے لکھنا چاہتے تھے مگر ان کو کوئی چھاپنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ بچوں کی کہانیوں کی فوٹو کاپی کرواتے اور کبھی کبھار خود بچوں کو سناتے اور بعض اوقات ان میں فوٹو کاپیاں تقسیم کر دیتے اور یوں ان کا ادب سموسوں، پکوڑوں میں پل رہا تھا۔

فخر الدین سوا چار فٹ کے کڑیل جوان تھے۔ بچپن میں پولیو کی وجہ سے ایک ٹانگ میں ہلکا سا لنگ تھا۔ بڑے بخار میں کوتاہی کی وجہ سے چیچک ان کے چہرے پر اپنی ''بہار'' چھوڑ گئی تھی۔ ان کی صحت ان کو آندھی میں گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے دنیا جہان کے ''لاڈ پیار'' ان کے حصے میں آئے تھے اور اسی لاڈ پیار نے انہیں پھلنے پھولنے نہیں دیا۔ اعلیٰ تعلیم میٹرک تک پہنچانے میں اس قدر ان کے اساتذہ کا کردار نہیں تھا جتنا اس میں حصہ گورنمنٹ نے ڈالا۔ پانچویں میں پہنچے تو حکومت نے اعلان کر دیا کہ اِس سال بچوں کو بغیر امتحان اگلی کلاسوں میں بھیج دیا جائے۔ آٹھویں میں بھی بغیر امتحان تُکا لگ گیا اور میٹرک میں ایف گریڈ کی سند کو انہوں نے موصول ہوتے ہی انہوں نے پلاسٹک کور کروا لیا تاکہ ان کی واحد ڈگری خراب نہ ہو جائے۔ انہوں نے کالج میں داخلے کی کوشش کی مگر جہاں بھی گئے ایف گریڈ کے آڑے آ گیا اور یوں انہوں نے اعلیٰ تعلیم کی خواہش کو دل میں ہی دبا دیا--- باپ نے جلد اپنا بوجھ بھی فخر الدین پر لاد کر مٹی کی چادر اوڑھ لی۔ فخر الدین کی ماں جلد اپنے ''چاند'' کے چہرے پر سہرا سجانا چاہتی تھی۔ وچولن نے ان کے ''رخ روشن'' کو دیکھ کر ان کی اماں سے کہا۔

''بچہ کرتا کیا ہے؟''

اماں نے کہا۔ ''نہیں، ابھی ہم نے شادی نہیں کرنی۔ ابھی نوکری

نہیں لگا برخوردار۔''

''بہن! چھوکری مل جائے تو اس کے بھاگ بھی اس کے ساتھ جاگ جائیں گے۔'' وچولن نے کہا۔

''مگر بہن! ایسے اس کے ساتھ کون شادی کرئے گا؟ ہے تو لاکھوں میں ایک مگر---'' اس کی اماں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں ہے تو واقعی لاکھوں میں ایک---'' وچولن نے معنی خیز نظروں سے فخر الدین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر بات چلاؤ کہیں۔'' اماں نے خیالی دنیا میں اپنے برخوردار کے سر پر سجے سہرے دیکھے۔

اور پھر ان کے درمیان ''بر'' کا ''ریٹ'' طے ہو گیا۔

جب وچولن نے انہیں کامیابی کی خوشخبری سنائی تو ماں، بیٹے کو اپنی ساعت پر یقین ہی نہ آیا۔ شادی سے چند دن قبل وچولن نے فخر الدین کو شادی کے دن سسرال کے گھر میں کامیابی کے چند گر بتائے۔ اس نے کہا۔

''بس بارات والا دن خیر، خیریت سے گزر جائے، بس پھر ستے خیراں ہیں۔''

سسرال میں فخر الدین کا سہرے کو چہرے سے نہ اٹھانا شرمیلے پن اور مشرقی روایات کی پاسداری قرار دیا گیا۔ سالیوں نے بار بار اصرار کیا۔

''ذرا روشن تو کروا دیں، نظر نہیں لگے گی۔''

انہوں نے اپنی پاٹ دار آواز کا سہارا لیا۔ ''نہیں، یہ ہماری خاندانی روایات ہیں، شادی کے دن نظر لگ جاتی ہے۔''

وچولن نے کہا۔ ''اری، سالیوں! درشن کروگی تو منہ میں انگلیاں داب لوگی۔''

وچولن نے چند اور چکنی چپڑی باتیں کیں اور رخصتی سے قبل ہی اپنا مال کھرا کیا اور یہ جا وہ جا۔

فخر الدین کے گھر میں اس کی بیوی کی چیخیں دل دہلا رہی تھیں۔ سبھی محلے دار اور رشتہ دار اس چیخ و پکار کو سن کر اکٹھے ہو گئے تھے۔ فخر الدین سہمے ہوئے بیٹھے تھے، نئی نویلی دلہن چیخ رہی تھی۔

''کوئی میرے گھر فون کر دے، کوئی میرے ابا کو بلا دے--- خدا کی پناہ، اتنا بڑا دھوکہ۔''

''بیٹی! جو ہوا سو ہوا، اب تم اس کی منکوحہ ہو، یہی تمہارا خاوند ہے۔'' ایک بڑی بی نے تسلی دی۔

''اچھا، چلو میں تمام عمر تمہاری غلامی کروں گا، اتنا ذلیل تو نہ کرو۔'' فخر الدین نے روہانسو ہو کر کہا۔

اور نہ جانے وہ کونسا لمحہ تھا کہ نئی نویلی دلہن کا دل فخر الدین اور اس کی اماں کی منت سماجت کو دیکھ کر پسیج گیا جو شرمندہ شرمندہ سے ملتجی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

ولیمے کے دن فخر الدین کو دیکھ کر ان کے سسرال والے غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ اس وچولن کو ڈھونڈ رہے تھے جس نے یہ ''بر'' ان کے پلے باندھ دیا تھا۔ سالیاں منہ میں انگلیاں دابے چہ میگوئیاں کر رہی تھیں کہ ''وچولن ٹھیک ہی کہہ رہی تھی منہ میں انگلیاں داب لوگی---'' اس کے ساس اور سسر شرمندگی سے اپنے رشتہ داروں کا سامنا کرنے سے کترا رہے تھے۔

''بیٹی! میں تو اب بھی کہتی ہوں کہ اس جہنم سے نکل آ۔'' اس کی ماں نے اس کے کان میں کہا۔

مگر فخر الدین کی بیوی نے اپنے خاوند کی منتوں اور ترلوں کا مان رکھ لیا۔ ''اماں! تم نے ہی تو کہا تھا کہ اس گھر سے اب تمہارا جنازہ ہی نکلنا چاہیے۔''

ایف گریڈ کی سند کے ساتھ انہوں نے سرکار کی ''خدمت'' کرنے کی بہت کوشش کی مگر کہیں کسی اور کی سفارش آ گئی اور کہیں ایف گریڈ اور فخر الدین کی اپنی ''شخصیت'' کام دکھا گئی۔ ابا کی وفات کے بعد انہیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا۔ ان کے ادبی دوست نے ان کو مشورہ دیا کہ اچھی کتابیں پڑھو، خود ہی اچھا لکھنا شروع کر دو گے اور فخر الدین دوسرے دن ہی ٹارزن، جنوں اور بھوتوں کی کتابیں اٹھا لایا جن کو دیکھ کر ان کا ایک ادبی دوست ان کے ''ادبی ذوق'' کا معترف ہو گیا۔ ان کے دوست نے ان سے کہا۔

''یہ بھی ٹھیک ہیں مگر لوگوں پر اپنا ادبی رعب ڈالنے کے لئے مفتیا نے، علی پور کا ایلی، راجہ گدھ، اشفاق احمد کے ناول اور زاویہ جیسی کتابیں لا کر رکھو، پڑھو بے شک نہ۔''

اور انہوں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

کتابیں خریدنے کے لئے وہ چند دن پیسے جوڑتے رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے نئی نویلی دلہن بہت کام آئی۔ اس نے میکے کی جمع پونجی فخر الدین کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔ وہ کتابیں خریدنے کے لئے بے تاب تھے اس لئے وہ شہر کی کتابوں کی سب سے بڑی دوکان پر پہنچے۔

''جی---!'' سیل مین نے عینک سے اس کی جانب گھورتے ہوئے کہا۔

اس نے کتابوں کی لمبی چوڑی لسٹ اس کے ہاتھ میں تھما دی ''یہ کتابیں چاہئیں۔''

''اتنے پیسے ہیں؟'' سیل مین نے ان سے استفسار کیا۔

''جی--- جی' وہ میں بیوی--- میرا مطلب ہے لے کر آیا ہوں۔'' انہوں نے ہلکاتے ہوئے کہا۔

''پہلے آپ کو کتابوں کا ٹوٹل نہ بتادو۔'' سیل مین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں ٹٹولتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''پانچ ہزار تین سو پچپن روپے---!'' سیلز مین نے کیلکولیٹر پر انگلیاں مارتے ہوئے کہا۔

''وہ آپ تو تھوک میں کتابیں فروخت کرتے ہیں' پھر اتنا زیادہ بل؟'' فخر الدین نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''تھوک میں ہی فروخت کرتے ہیں' ردی میں نہیں۔ آپ کے پاس کتنے پیسے ہیں؟''

''سات سو چون روپے۔'' انہوں نے جیب کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

رہنے دیں جناب! اتنے میں تو ''مفتیانے'' بھی نہیں آئے گی۔ اس کے وزن کا پتہ ہے؟'' سیل مین نے کتاب ان کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

''ہاں' کافی بھاری ہے'' فخر الدین نے بمشکل اس کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

''او بھائی میرے! میں اس کے ادبی وزن کی بات کر رہا ہوں اور تم اسے ہاتھوں میں تول رہے ہو۔ ایک مشورہ دوں' ردی کی دوکان کھول لو تم جیسے کئی بے ذوق ردی میں قیمتی کتابیں بیچ جاتے ہیں--- ویسے تم نے کتابیں کرنی کیا ہیں؟'' سیل مین نے اسے ایک نیک مشورہ دیا۔

''میں خود ایک شاعر اور ادیب ہوں---'' انہوں نے فخر سے گردن اکڑاتے ہوئے کہا۔ ''بس ذرا ان لوگوں کو بھی پڑھنا چاہتا تھا---'' لسٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے آپ نے مجھے مشورہ خوب دیا کہ ردی کی دوکان مگر ایک بات بتادوں آپ کو میری کتاب ردی کی دوکان سے نہیں ملے۔'' انہوں نے اپنے کالر کو فخریہ انداز میں ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''جی' جی چھپے گی تو ملے گی۔'' سیل مین نے مسکراتے ہوئے ان کی جانب الوادعی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

ردی کی دوکان نے فخر الدین کے لئے ایک پنتھ دو کاج والا کام کیا۔ ان کی دوکان میں ادبی محفلیں بھی جمنے لگیں اور وہ ادب بھی ''سستا'' پڑھنے لگے۔ یوں ردی نے ان کے روزی رزق کا دروازہ بھی کھول دیا۔ ایک دن وہی ''مفتیانے'' جس کے لئے انہوں نے سیل مین سے بے نقط سنی تھیں' ایک جہاز ان کے پاس تیس روپے میں بیچ گیا۔ جب دوکان کی ادبی محفلوں میں وہ اپنی مشہور زمانہ کہانی ٹارزن کی واپسی اور عمرو عیار کوہ قاف میں' سناتے تو ان کے ''ادبی دوست'' دل کھول کر ان کو داد دیتے۔ کچھ دوستوں نے تو انہیں ''جلدی میں'' انگریزی کا شیکسپیئر اور اردو کا اشفاق احمد بھی قرار دے دیا۔ محفل کے اختتام پر ادبی نواز دوستوں کی چائے اور پکوڑوں کے ساتھ تواضع کی جاتی۔ کبھی کبھار پیپسی اور مٹھائی کا دور بھی چلتا۔

''فخر الدین! میرے خیال میں یہ چائے اور بوتل والا کام بھی اب مکا ہی ڈالو۔ چائے دور سے آتے ہوئے ٹھنڈی اور بوتل گرم ہو جاتی ہے۔'' ایک رضا کار سپاہی نے لڈو منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے مگر میری جیب ابھی اجازت نہیں دیتی۔''

''تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟ کریڈٹ کارڈ بنوالو' بعد میں تھوڑے تھوڑے کر کے لوٹا دینا۔ میرا ایک دوست بینک میں ہے' کارڈ بھی جلدی بن جائے گا۔ میں اسے تمہارا موبائل نمبر دے دوں گا' ان کی سروس بہت تیز ہے۔'' ایک اور دوست نے ایک قیمتی مشورہ دیا۔

''ہاں' یار! بات تو تمہاری دل کو لگتی ہے اس سے بات کرو۔'' فخر الدین نے اطمینان کا سانس لیا۔

''دوکان میں رنگ روغن کروالو' میں کسی سے بات کروں۔'' ایک دوست نے عینک درست کرتے' اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں' تمہاری بات بھی ٹھیک ہے۔ ذرا دوکان بھی چمک جائے اور میں چند اور کرسیوں کا بھی بندوبست کرتا ہوں اب میرے ادبی مہربان بڑھتے جا رہے ہیں۔'' انہوں نے اپنے دوست سے کہا۔

''فخر الدین! میں تو کہتا ہوں اگر اللہ نے آپ کو صلاحیت دی ہے تو کھل کر لکھو۔'' ایک دوست نے سڑ سڑ کر کے چائے پیتے ہوئے کہا۔

''کیا لکھوں کوئی چھاپتا ہی نہیں۔ کوئی لوکل اخبار بھی بڑی منتوں کے بعد چھاپتا ہے۔ سبھی یہی کہتے ہیں کہ ابھی محنت کرو۔'' فخر الدین نے رنجیدہ سے لہجے میں کہا۔

''اچھا تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ آج کے ادبی اجلاس کا اختتام کرتے ہیں۔ میرے ایک دوست کالم نگار ہیں' ان سے مشورہ کرتے

ہیں۔ بھئی' جلدی چائے اور مٹھائی ختم کرو۔"

ان کے دوست نے خود ایک رس گلے کو گلے میں اتارتے ہوئے کہا اور بھی ناقدین میں افراتفری مچ گئی۔

فخر الدین نے دوکان سے سائیکل نکالی۔ ہاتھ لگا کر ٹائروں کی ہوا چیک کی اور خود قینچی چلا کر گدی پر بیٹھے اور دوست کو پیچھے بیٹھنے کے لئے آواز دی۔ دوست نے ان کی آواز پر اچک کر کیریئر پر بیٹھنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں سائیکل فخر الدین سے بے قابو ہو گیا مگر جلد ہی انہوں نے سائیکل کو سنبھالا دیا۔ اسی طرح ڈولتے ہوئے وہ اپنے دوست کے دوست کے گھر پہنچے۔ کالم نگار دوست نے ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا چائے وغیرہ سے تواضع کی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے دوست سے پوچھا۔

"ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ میرا دوست فخر الدین ایک ادبی آدمی ہے۔ تقریباً بیس سال سے لکھ رہا ہے مگر کامیابی اور شہرت اس سے کوسوں دور ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ آپ کی طرح لکھے اور راتوں رات مشہور ہو جائے۔" دوست نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔

"آپ کس میدان میں لکھ رہے ہیں؟" کالم نگار نے فخر الدین سے پوچھا۔

"میدان میں تو نہیں' زیادہ تر اپنی دوکان پر ہی لکھتا ہوں۔" فخر الدین نے حیرت سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب ہے' افسانہ لکھ رہے ہیں یا کہانیاں؟" کالم نگار نے نظروں ہی نظروں میں ان کی ذہانت کا جائزہ لیا۔

"اوہ اچھا' شاعری بھی کی ہے؟" انہوں نے سلوکے کی جیب سے ایک ضخیم بوسیدہ سی ڈائری نکالتے ہوئے کہا۔

"شاعری--- بس ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ کیا لکھا ہے؟" کالم نگار نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"زیادہ تر کہانیاں لکھی ہیں۔" ٹارزن کی پندرہ' عمرو عیار کی تقریباً بیس" اس کے علاوہ "رحم دل چور' شہزادی سویرا' مینڈک کی شادی' شہزادی گل بہار" اور---"

"بس' بس میں سمجھ گیا۔" کالم نگار نے فخر الدین کو چپ کراتے ہوئے کہا۔ "بھائی! میرے' کالم نگار بننے کے لئے حکومت اور ایجنسیوں سے پنگے لینے پڑتے ہیں اور یہ بڑے دل گردے کا کام ہے۔

"وہ کیسے؟" فخر الدین نے اپنے دل کی دھڑکن کو بے ترتیب محسوس کیا مگر پھر بھی پوچھ ہی لیا۔

"آپ نے کبھی کالم لکھا ہے؟" کالم نگار نے بغور ان کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں' علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ پر لکھا تھا۔"

"اچھا' تعلیم کتنی ہے؟"

"میٹرک---!" فخر الدین ایف گریڈ کو چھپا گئے۔

"تعلیم تو میٹرک بھی بہت ہے۔ بہت سے ایسی کالم نگار ہیں جن کا اس وقت طوطی بول رہا ہے اور وہ میٹرک بھی نہیں ہیں' لاکھوں کما رہے ہیں---" یہ سن کر فخر الدین کے چہرے پر رونق آ گئی۔ "ویسے آپ نے کون کون سے کالم نگاروں کو پڑھا ہے۔"

"میں تو کالم نگاروں کو روز تولتا ہوں اور میں نے ان کو کلو کے حساب سے پڑھا ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کا مطالعہ اس فیلڈ میں کافی وسیع ہے۔ جو شخص کالم نگاروں کے کام کو نظروں ہی نظروں میں تول لیتا ہو' وہ کالم لکھے گا بھی خوب---" کالم نگار نے ان سے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "اچھا آپ ایسا کریں کہ آج کل اخبارات' چینلز' عوام' حکومت سب جنرل مشرف سے استعفیٰ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ آپ بھی ایک کالم لکھیں' اپنے اس کالم میں ان سے اقتدار چھوڑنے کا مطالبہ کریں۔ اگر انہوں نے اقتدار نہ چھوڑا تو ان کا نہ صرف مواخذہ بلکہ محاسبہ کیا جائے گا۔ ذرا سخت لکھیں تبھی بات بنے گی۔ یاد رہے وہ فوجی ہے کوئی ایجنسی بھی آپ کے کالم پر ردعمل ظاہر کر سکتی ہے۔ دل گردہ تو مضبوط ہے' نا!"

"ہاں' ہاں مضبوط ہے۔" فخر الدین نے گھبراہٹ چھپاتے اور ماتھے پر آئے پسینے کے قطروں کو بازو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر لکھو کالم' اس کی کاپیاں کروا کے تمام قابل ذکر اخبارات میں پوسٹ کر دو اور ایک اہم بات' ان سب کو کالم کی تاریخ اشاعت ایک ہی دو۔ اس سے کالم نگار کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہم بھی چاہتے ہیں ہمارے شہر کے کالم نگار کی اس قدر شہرت ہو جائے کہ غیر ملکی دوروں میں آپ بھی نظر آئیں۔ ٹی وی کے ٹاک شوز میں آپ کے کالم پر بحث کی جائے آپ تخت و تاج کو گرانے والے بھی بنیں اور سیاسی شطرنج کی نئی بساط بچھانے والے بھی بنیں۔" کالم نگار نے الوداعی مصافحہ کے لئے ان کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

جب آخری بچہ بھی سو گیا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ بیوی کے بے ترتیب خراٹے اس کے خیالات کی روانی کو بھگا رہے تھے۔ اس نے کباڑ میں آیا ہوا ایک گرد آلود ٹیبل لیمپ نکالا۔ اس کو پھونکوں سے صاف کیا کاغذ گتے پر اٹکائے' خود کو کرسی پر گرایا۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی کاغذ پر پڑنے

لگی۔ پنسل کو انگلیوں میں پکڑا خیالات کی یلغار کو ایک لائن میں کرنے کے لئے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگے۔ یکایک صدر جنرل صدر مشرف اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ بارعب چہرہ فوجی وردی' کاندھوں اور سینے پر سٹارز کی ایک لمبی قطار۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ فخرالدین نے چہرے سے ذرا نیچے نظر کی تو ان کے ہاتھ میں بید کی چھڑی گردش کر رہی تھی۔ اسے یوں لگا جیسی وہ میز پر اتر آئے ہو۔

''ہوں---میرے خلاف لکھو گے؟'' جنرل نے اسے گھورتے ہوئے کرخت لہجے میں پوچھا۔

اس کا دل دھڑک اُٹھا' زبان پر لکنت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنی ڈھارس بندھوائی۔

''ہاں لکھوں گا میں بنوں گا سولہ کروڑ عوام کی آواز۔'' انہوں نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔

''اچھا تمہاری مرضی۔''

اس نے سر کو جھٹکا' شائد اونگھ آ گئی تھی۔ سردی کے باوجود پسینے میں شرابور تھے۔ مختلف طرح کے خیالات ان کو بہکا رہے تھے۔ ابھی کاغذ اور پنسل بہت فاصلہ تھا۔ انہوں نے دیکھا ایک بے ہنگم سا ہجوم ایک جانب کو نظریں لگائے ہے۔ کوڑے کھاتے شخص کی تصویر کچھ واضح نہیں تھی۔ جنرل ضیاالحق کے دور میں کوڑے کھاتے لوگوں کو انہوں نے کئی بار تماشا دیکھا تھا۔ فخرالدین نے آنکھوں کو سکیڑا تو تصویر واضح ہوئی' کوڑے کھاتے وہ خود تھے۔ وہ لرز گئے' ہاتھ سے پنسل گر پڑی۔ وہ ایک مرتبہ پھر اونگھ گئے تھے۔ وہ اٹھے انہوں نے پانی کے ٹھنڈے چھینٹے منہ پر مارے' صحن میں تازہ ہوا سے پھیپھڑوں کو بھرا اور ایک مرتبہ پھر کرسی پر آ بیٹھے۔ انہوں نے پنسل کاغذ پر ٹکا دی' خیالات اُلجھتے رہے' وہ بالوں میں انگلیاں پھیر کر ان کو سلجھاتے رہے۔ انہوں نے دیکھا جنرل مشرف ان کے سامنے گھٹنے ٹیکے بیٹھا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا وہ فخرالدین سے رحم کی درخواست کر رہے تھے مگر فخرالدین کوئی پروانہ کی انہوں نے تھوڑی ہی دیر میں تین سو چھبیس الفاظ کا کالم لکھ مارا' اس کے باوجود وہ تازہ دم تھے۔ سب منظر غائب ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے کالم میں مواخذہ اور محاسبہ کے تقریباً دو سو ننانوے الفاظ استعمال کئے تھے۔ انہوں نے کالم کا اختتام ان الفاظ میں کیا تھا۔ یہ الفاظ انہوں نے ایک انڈین فلم ''میں ہوں نا'' سے لئے تھے۔

''جنرل مشرف! اگر سولہ کروڑ عوام تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکی تو پھر میں تو ہوں' نا!''

صدر جنرل پرویز مشرف کے خلاف مواخذہ اور محاسبہ کی تحریک زوروں پر تھی۔ حیرت انگیز طور پر چند قومی اخبارات نے اسے بطور مراسلہ اور تین مقامی اخباروں نے نے اسے کالم کے طور پر چھاپ دیا۔ فخرالدین ایک بک سٹال پر چمگادڑ بنے اخبارات کو الٹا سیدھا ہو کر دیکھ رہے تھے' خوشی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ انہوں نے سبھی اخبارات خرید لئے۔ دوکان دار حیرانی سے ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔

ان کی دوکان پر میلے کا سماں تھا اور وہ ہیرو بنے سب کی آؤ بھگت میں مصروف تھے۔ دوکان میں ہر جانب اخبار بکھرے ہوئے تھے۔ چائے بوتل دور چل رہے تھے۔ تعریفوں کے پل باندھے جا رہے تھے۔

''اَب جائے گا فخرالدین کالم نگاروں کی صف میں۔'' ایک مداح نے بوتل کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''میں تو کہتا ہوں کہ پہلا کالم اور اتنا زبردست اور آخری فقرہ اتنا جاندار کہ میں ہوں نا! واہ بھئی واہ' مشرف تجھے تو لازمی ڈھونڈے گا۔'' ایک نحیف سے رضا کار سپاہی نے چائے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے پھونک مارتے ہوئے کہا۔

'اوئے' ماٹھے ماٹھے ان پڑھ لاکھوں کما رہے ہیں' ہمارا فخرالدین تو پھر میٹرک ہے۔'' ایک دوست نے کالم پڑھتے ہوئے کہا۔

''میں تو کہتا ہوں سیدھی جنرل سے ٹکر' پاکستان میں ایسا کالم نگار نہ ہوگا۔''

ایک نیا دوست دوکان میں داخل ہوا اور آتے ہی مدح سرائی شروع کر دی۔ اس کے جواب میں فخرالدین نے جلدی سے اس کو ٹھنڈی بوتل سے چپ کروایا۔

دوکان میں آمدورفت جاری تھی۔ جو ''مستفید'' ہو چکے تھے' وہ اپنے کاروبار پر نکل چکے تھے۔ راستے میں انہوں کوئی بھی نظر آتا' وہ فوراً اس کو فخرالدین کا بتاتے اور ساتھ ہی چائے' پانی کی اضافی خوبی کے بارے میں آگاہ کرتے۔ ایک ایک کر کے ''تبصرہ نگار'' اپنے کاموں پر جا چکے تھی۔ دوکان میں فخرالدین اور نحیف سا رضا کار سپاہی رہ گئے۔ اس نے چائے کی آخری چسکی لیتے ہوئے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''احتیاط کرنا تم نے کالم ایک جنرل کے خلاف لکھا ہے۔ میرا مطلب ہے' کوئی ایجنسی وغیرہ بھی تمہیں اٹھا سکتی ہے۔''

اس کا دل شیدے گٹے والے کی ٹلی کی طرح کھڑک اٹھا' بے ترتیب سا' ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ اس نے اپنے دل کو ڈھارس دی' ابھی کہاں ایجنسی' ابھی تو پہلا کالم ہے۔

''مگر فخرالدین! اتنا سخت نہیں لکھنا چاہئے تھا۔'' اس نے اپنے

آپ سے کہا۔ "آخری فقرہ ایڈیٹر کاٹ دیتا تو بہتر تھا۔"

"پیسے جناب!" چائے والے لڑکے کی آواز نے سکوت توڑا۔ رضا کار بھی مشورہ دے کر جا چکا تھا۔ وہ چونک اٹھا۔ "پیسے جناب! کس سوچ میں ہیں؟" لڑکے کی آواز دوبارہ گونجی۔

"کتنے پیسے؟" فخر الدین نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"تین سو باون روپے۔" لڑکے نے جیب سے پرچی نکالتے ہوئے کہا۔

"اتنے زیادہ؟" انہوں نے اس کے ہاتھ سے پرچی لیتے ہوئے کہا۔

"آپ بھی تو ہر ایک کے لئے چائے، بوتل سموسے، لڈو منگوا لیتے ہو۔"

"اچھا چھوڑو، تمہیں پتہ ہے کہ میرا کالم چھپا ہے ان اخباروں میں۔" فخر الدین نے دوکان میں بکھرے ہوئے اخباروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا، پھر تو آپ بڑے کالم نگار ہوئے نا! مجھے بھی اس خوشی میں بوتل پلائیں۔"

"ایک بوتل تم بھی پی لینا--- سنو یہ اخباریں لے جانا اور جو گاہک چائے پینے آئے، اس کو میرے کالم کے بارے میں ضرور بتانا، میری دوکان کی جانب اشارہ کر کے۔"

فخر الدین نے اس کو پیسے اور اخباریں پکڑاتے ہوئے کہا جو انہوں نے پہلے ہی زیادہ لے رکھی تھیں۔ لڑکا پیسے اور اخباریں لے کر جا چکا تھا۔ انہوں نے دوکان میں بکھری ہوئی اخباروں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ صبح سے نہ جانے کتنی بار وہ ان کو پڑھ چکے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر ایک قومی اخبار کے مراسلے میں وہ فقرہ پڑھا۔

"اگر سولہ کروڑ عوام تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکی تو پھر میں تو ہوں نا۔"

خوشی پر اچانک خوف غالب آ گیا۔ ایجنسی اور خفیہ والے اس کے حواس پر چھانے لگے۔ اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ٹھنڈا سا پسینہ نہ جانے کہاں، کہاں سے بہنا شروع ہو گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے دوکان میں فوجی چل رہے ہوں۔ ان کے بوٹوں کی دھمک اسے دل سے ہوتی ہوئی دماغ میں جاتی محسوس ہو رہی تھی۔ صدر جنرل پرویز مشرف ان کے سامنے کھڑے تھے۔ جنرل نے کرخت نگاہوں سے فخر الدین کی جانب دیکھا۔

"ہوں، تو تم باز نہیں آئے؟"

بید کی چھڑی ان کے ہاتھوں میں گردش کر رہی تھی۔ وہ شرمندہ سے کوئی جواب نہ دے سکے، ان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی پسلیاں پلاسٹر آف پیرس کی ہوں اور ان کا دل ابھی پھڑک کر باہر آ گرے گا۔ کلاک کی گھنٹی سے وہ خیالات کی دنیا سے باہر آئے۔ تین بج چکے تھے۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے جلدی سے شٹر گرانے کی کی کہ لوگوں کو پتہ نہ چلے۔ چند لوگوں نے سرسری نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا مگر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ لوگوں کی نظروں سے بچتے بچاتے گھر کی جانب چل دیئے۔

ان کے پاؤں من من بھر ہو چکے تھے۔ وہ اگر دو قدم آگے کی جانب چلتے تو چار قدم پیچھے کی جانب آتے۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ موسلا دھار بارش میں چل رہے اور رستے کا کیچڑ انہیں آگے بڑھنے سے روک رہا ہو۔ نہ جانے کیسے گھر پہنچے۔ گھر کی دہلیز پر ہی وہ غش کھا کر گر پڑے۔ ان کی بیوی اور بچوں نے انہیں گھسیٹ کر چارپائی پر منتقل کیا۔ وہ بخار میں تپ رہے تھے، منہ سے جھاگ جاری تھی۔

"کیا ہوا؟" ان کی بیوی نے گھبراتے، انہیں جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"اماں! ابا کو لگتا ہے مرگی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ میں جوتا لاتا ہوں، وہ سنگھائیں۔" چھوٹے صاحبزادے نے کمرے کی طرف بھاگتے ہوئے کہا۔

"جوتا نہیں، جلدی سے پانی لا۔"

ایک دوسرے لڑکے نے جلدی سے پانی کا گلاس اپنی اماں کو پکڑایا۔ فخر الدین کی بیوی نے جلدی سے پانی کا گلاس ان کے ہونٹوں سے لگایا جسے انہوں نے غٹا غٹ پی لیا۔

"کیا ہوا؟" ان کی بیوی نے پھر پوچھا۔

قبل اس کہ وہ کوئی جواب دیتے، ان کا دروازہ بری طرح پیٹا گیا۔ بڑے لڑکے اکرم کو دروازے کی طرف جاتا دیکھ کر انہوں نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا۔

"میرا کوئی پوچھے تو کہنا ابا گاؤں گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اکرم نے سر ہلاتے ہوئے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"چچا کہاں ہے؟" آنے والی آواز کو وہ پہچان گئے، یہ چائے والے کی آواز تھی۔

"وہ تو گاؤں گئے۔" ان کے برخوردار نے جھوٹ بولا۔

"مگر ابھی تو آدھ گھنٹہ پہلے دوکان پر تھے۔" لڑکے کی آواز میں حیرانی تھی۔

''بس چلے گئے' کیا کوئی کام تھا تمہیں؟''
''وہ کوئی ایجنسی والے آئے تھے چاچا کا پوچھ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا شائد گھر گئے ہوں' میں تو دیکھنے چلا آیا۔''
''اس کو اندر بلاؤ۔'' فخر الدین نے کراہتے ہوئے اپنے اکرم سے کہا۔
چائے والا لڑکا فخر الدین کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ انہوں نے اس کے بولنے سے پہلے ہی کہا۔ ''کوئی بھی آئے میرا نہ بتانا۔''
''ٹھیک ہے چاچا! مَیں کچھ کہہ دوں گا مگر---''
''اس مگر کو چھوڑو۔''
لڑکا باہر جا چکا تھا فخر الدین پریشانی اور خوف کے عالم میں اپنی بیوی کی جانب دیکھ رہے تھے۔
''کیا ہوا یہ ایجنسی والی کیا بات ہے؟'' اس کی بیوی نے پریشانی سے پوچھا۔
''بات دراصل یہ ہے میں نے جنرل مشرف پر کالم لکھا جو کہ میرے ماڑے مقدر' کافی سارے اخباروں میں چھپ چکا ہے۔ پہلی چوری اور پہلا بیاہ--- اب خفیہ ایجنسی والے مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''
ان کی بیوی یہ بات سن کر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔
''یہ تم نے کیا کیا' وہ تمہیں کہاں چھوڑیں گے۔'' ان کی بیوی کی اپنی آواز کانپ رہی تھی۔
اتنے میں ان کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس پر عجیب سا ٹیلی فون نمبر نمودار ہوا۔
یہ کس کا نمبر ہے؟'' انہوں نے موبائل اکرم کو دکھاتے ہوئے کہا۔
''ابا! نمبر تو عجیب سا ہے۔ میرا دوست کہہ رہا تھا کہ خفیہ والے عموماً جو فون کرتے ہیں' ان کے نمبر موبائل سکرین پر نہیں آتے۔ اگر آئیں تو عجیب سے ہوتے ہیں۔ ابا! اس کو اٹینڈ نہ کرنا۔''
مغرب کا اندھیرا پھیلنے تک فخر الدین کی طبیعت بگڑ چکی تھی۔ بخار تھا کہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے ابھی اندھیرا اور زیادہ پھیلنے کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ دروازے کی بیل بجی۔ ان کا دل جو پہلے ہی ''چھڑاپے'' مار رہا تھا' دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے اشارے اور اکرم کو باہر بھیجا اور کان باہر سے آنے والی آواز پر لگا دیئے۔
''فخر الدین کا گھر یہی ہے؟'' بظاہر تمیز سے پوچھا گیا۔
''جی یہی ہے۔'' اکرم کی آواز آئی۔

شغل+مغل

''مجھ کو کھاتا ہی چلا جاتا ہے سالا میرا
چھین لیتا ہے مرے منہ سے نوالہ میرا''
ریاض احمد قادری

☆صبر کریں بھائی صاحب! یہاں ہر شادی شدہ کے ساتھ یہی صورت حال ہے۔

''خالی کیوں مجھ سے کرایا ہے کرائے کا مکان
روڑ پر سارا سامان ہی نکالا مرا''
(ریاض احمد قادری)

☆آپ نے کتنے ماہ سے کرایہ جو ادا نہیں کیا تھا۔

''وہی جاتا ہوں اور سوچتا ہوں
رائیگاں نہ یہ ہنر جائے کہیں''
(خادم حسین مجاہد)

☆دودھ دہی کی دوکان کھول لیں' نا!

''مجھے جب دیکھتا ہے منہ چھپالیتا ہے وہ ظالم
مگر وہ بے حیا اوروں سے تو پردہ نہیں کرتا''
(پروفیسر ظریف خان)

☆آپ خان جو ہیں--- باقی خود ہی سمجھ جائیں۔

''وہ جو بیوی کو زہر دے رہا ہے
میزائل کو ناکارہ کر رہا ہے''
(امین بابر)

☆میزائل تو ناکارہ ہو جائے گا' ایٹم بم (ساس) تو پیچھے باقی ہے' نا!

''بھیگی آنکھوں سے وہ مجھ کو تکتی ہے
لگتا ہے' وہ بھولی بھالی چنگی نہیں''
(یاداش منصور)

☆محض آپ کی غلط فہمی ہے۔ وہ تو آپ کے ساتھ کھڑے دوسرے لڑکے کو دیکھ رہی ہے۔

''ہر اک شعر تجھ کو سنا کر رہوں گا
تیرے ناز نخرے اٹھا کر رہو گا''
(قدیر رانا)

☆او بھائی! مجھ سے تمہاری بھلا کیا دشمنی ہے کہ اتنی بڑی سزا دینے جا رہے ہو؟

''لوڈشیڈنگ کمال کرتی ہے
سب کا جینا محال کرتی ہے''
(ڈاکٹر جاوید)

☆لوڈشیڈنگ عاشقوں کے لئے تو سنہری مواقع پیدا کرتی ہے' نا!

''پوچھتے کیا ہو مرا حال بعد شادی کے
میرے دُکھ تو میرے چہرے پر نظر آتے ہیں''
(ندیم آرزو)

☆جی' جی آپ کے ماتھے پر بندھی پٹی اور ٹوٹی ٹانگ ہمیں نظر آ رہی ہے۔

''کپڑے میں گھر کے تب نہیں دھوتا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا''
(روح اللہ روح)

☆جب دوسرا (بیوی) ہوتا ہے' اس وقت تو کپڑے برتن جھاڑو تک کر لیتے ہوں گے۔

محمد صابر مغل عبدو پوری

''کہاں ہیں وہ' انہوں نے فون بھی اٹینڈ نہیں کیا؟''

''جی' گاؤں گئے ہیں' شائد کوئی سگنل کی پرابلم ہو۔'' ان کے صاحبزادے نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا۔

''کب تک آجائیں گے؟'' تمیز کا دوبارہ مظاہرہ کیا گیا۔

''چند دنوں تک' کوئی کام ہے تو بتادیں؟''

''نہیں' بس انہی سے ملنا تھا۔''

انہیں موٹر سائیکل کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ اکرم اندر داخل ہوا اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ فخرالدین کے خود پسینے چھوٹ رہے تھے۔

''کون تھے؟'' ان کی آواز بمشکل حلق سے نکلی تھی۔

''پتہ نہیں ابا! صرف آپ کا پوچھ رہے تھے۔'' برخوردار نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خفیہ والے ہوں گے۔ تم نے موٹر سائیکل کا نمبر نوٹ کیا۔'' انہوں نے بستر میں کانپتے ہوئے ایک خیال پیش کیا۔

''میں نے تو نوٹ نہیں کیا مگر انہوں نے ہمارے سارے گھر کا نقشہ بنایا ہے' گیٹ کا رنگ بھی لکھا ہے' سامنے والے دوکاندار کا نام بھی لکھ کر لے گئے ہیں۔'' اکرم بتاتا چلا گیا۔

''بس بھی کر' اَبا کو دیکھ لے۔'' فخرالدین کی بیوی چلاتے ہوئے ان کی جانب دوڑی۔

فخرالدین کے منہ سے جھاگ ایک مرتبہ پھر جاری تھی اور ان کی آنکھیں آسمان کی جانب کھلی ہوئی تھیں۔

رات سات بجے کا عمل تھا' لوڈشیڈنگ نے سارے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اچانک موسم اَبر آلود ہو گیا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے نے لوڈشیڈنگ کی ''کالک'' کو مزید گہرا کر دیا۔ فخرالدین پر غنودگی طاری تھی' بخار تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ان کی بیوی بارہا ان سے ڈاکٹر کے پاس جانے کا کہہ چکی تھی مگر ان کی جانب سے مسلسل انکار جاری تھا۔ چند سیانے بچے ان کو سمجھا چکے تھے۔ ان کی بیوی نے ایک مرتبہ ان کو پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

''فخرو! ہر جانب اندھیرا طاری ہے تمہیں کوئی نہیں پہچانے گا۔

''نہیں' خفیہ والے مجھے اُٹھا کر لے جائیں گے۔''

''اگر تم نے دوا نہ لی تو صبح تک تمہیں موت اٹھا کر لے جائے گی۔''

''اچھا چلتا ہوں مگر احتیاط کرنا۔'' فخرالدین نے چارپائی پر بیٹھے ہی کمبل اوڑھتے ہوئے کہا۔

''لوڈشیڈنگ اور موسم کا اندھیرا تمہاری مدد کرے گا۔ ایسے میں کون ڈیوٹی پر ہو گا' اس وقت تو کتے بھی کہیں دبکے ہوں گے۔'' ان کی بیگم نے برقعہ اوڑھتے ہوئے کہا۔

صحن میں ہی فخرالدین کو اچھی طرح لپیٹ کر سائیکل کے کیریئر پر بٹھایا گیا۔ ان کے چہرے کو اچھی طرح چادر میں لپیٹ کے اس کے پلو ایک چھوٹے لڑکے کے حوالے کر دیئے گئے۔ ان کی بیوی نے ان سے کہا۔ ''نہ تم نے کوئی بات کرنی ہے اور تمہارے منہ سے کوئی کراہ نکلے۔''

''ٹھیک ہے۔'' فخرالدین کے منہ سے شائد آخری کراہ ابھری۔

ان کی بیوی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا' گلی میں جھانکا اور اکرم کو سائیکل آگے لے آنے کا اشارہ کیا۔ لوڈشیڈنگ اور بارش نے گلیاں سنسان کر دی تھیں۔ اکرم سائیکل کو ہینڈل سے پکڑ کر چلا رہا تھا۔ ان کی بیوی اور چھوٹے لڑکے نے فخرالدین کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ گلی میں موجود بارش کے پانی سے بچتے بچاتے چلے جا رہے تھے۔ اچانک اکرم کی سرگوشی نما آواز ابھری۔

''اماں! ہوشیار' کوئی آ رہا ہے۔''

کمبل اور چادر میں فخرالدین کسمسا کر رہ گئے۔ سنسنی سی ان کے رگ و پے میں دوڑ گئی' ان کا دل بُری طرح دھڑک کر پوچھ رہا تھا کہ کون مگر وہ چپ تھے۔ آنے والا قریب آ چکا تھا۔

''کیا بات ہے پتر! اس وقت کہاں جا رہے ہو اور اس کمبل میں کون ہے۔'' ایک ہی سوال میں بہت سے سوال تھے۔

''بس ماسی! ڈاکٹر تک جا رہی تھی۔'' ان کی بیوی کی آواز سنائی دی۔

فخرالدین کے دل کی دھڑکن یک دَم ایک ٹریک آ گئی۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ ماسی برکتے تھی مگر اَب ماسی برکتے سے بچنا بھی کسی ایجنسی سے بچنے کے مصداق تھا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' ماسی نے حیرت سے فخرالدین کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ ماسی! اَبا --- نہیں' نہیں کتا ہے۔'' چھوٹے لڑکے نے چادر پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

''اتنا بڑا کتا --- مگر تمہارے گھر میں تو کتا نہیں ہے؟'' ماسی نے تھوڑی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ چھوٹا سا تھا جب فخرو گاؤں سے لائے تھے تب سے چھت پر بندھا رہتا تھا۔'' ان کی بیوی نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''مگر تمہارے گھر سے کبھی اس کے بھونکنے کی آواز تو نہیں آئی؟''

''بے چارہ گونگا ہے''

''گونگے کتے کا کیا فائدہ؟ اتنا بڑا ہے کھاتا کیا کم ہوگا۔ فائدہ کوئی نہیں، میں تو کہتی ہوں گولی مارو اس نحوست مارے کو مرنے دو۔'' ماسی کتے کی جان کے درپے تھی۔

''مگر ماسی! انسان تو ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ جاندار تو ہے۔''

''اچھا تمہاری مرضی، میری تو اپنی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر سے دوائی لے کر آ رہی ہوں۔ تمہارا کتا ضرور دیکھتی مگر اندھیرا ہے۔ پھر تمہارا کتا گونگا بھی ہے، کہیں کاٹ ہی نہ لے۔ وہ بھی بے آواز، بغیر بتائے۔'' ماسی برکتے نے بارش کے پانی سے بچتے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

لوڈشیڈنگ اور موسم نے ڈاکٹر اللہ دتہ کی دوکان ویران کر دی تھی۔ کلینک میں روشن سوئی گیس کا بلب اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر اللہ دتہ ڈگری میں ہومیو پیتھک تھے مگر تیر تکے انگریزی کے ہی چلاتے تھے۔ سردی سے بچاؤ کے لئے انہوں نے گرم کمبل کو سر تک لپیٹا ہوا تھا۔ اسی گرم کمبل میں پھونکیں مار کر اسے گرم رکھنے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ ان کی نظر میں کمپوڈر نحوست کی علامت تھا اس لئے وہ اس وقت دوکان میں اکیلے تھے۔۔۔ سائیکل کی کھڑ کھڑ کی آواز پر انہوں نے دوکان کے باہر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے نے ان کی نظر کو خالی لوٹا دیا مگر مریض کے خوش کن احساس نے ان کے بدن میں گرمی دوڑا دی۔ انہوں نے سردی سے بجتے ہونٹوں اور کپکپاتے ہونٹوں سے پوچھا۔

''کون ہے؟ اندر آ جاؤ کلینک کھلا ہے۔''

آنے والا سر تا پا کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ایک چھوٹا لڑکا اور عورت تھی جس نے اسے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اس سے پیچھے سائیکل کو کھڑا کر کے ایک بڑا لڑکا داخل ہوا۔ انہوں نے کمبل والے مریض کو ڈاکٹر کے سامنے بٹھا دیا۔

''کیا جل گیا ہے؟'' ڈاکٹر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''آپ نے کیسے اندازہ کیا؟''

''وہ کمبل میں لپیٹا ہوا ہے۔''

''اچھا جو جل جاتے ہیں وہ کمبل میں لپٹے ہوتے ہیں؟'' عورت نے معنی خیز نظروں سے ڈاکٹر کے کمبل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اوہو۔۔۔'' وہ کھسیانا ہو گیا۔ ''میرا مطلب یہ نہیں تھا، میرا مطلب ان کی طبیعت سے تھا۔''

''ڈاکٹر! ہمارے کتے۔۔۔ نہیں، نہیں ا... بخار ہے۔'' چھوٹے لڑکے نے فخر الدین کے منہ سے کمبل اتارتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب کتے۔۔۔ ابے کو؟'' ڈاکٹر نے گردن کمبل سے نکالتے ہوئے حیرانی سے کہا۔

''یہ میرے خاوند ہیں۔ ان کو بخار بہت تیز ہے اور ساتھ دل کی دھڑکن بھی بہت تیز ہے۔''

''کب سے بخار ہے؟'' ڈاکٹر نے تھرمامیٹر ان کے منہ میں رکھتے اور بلڈ پریشر چیک کرنے کیلئے ان کی آستین اوپر کرتے ہوئے کہا۔

''آج دوپہر سے۔''

''اوہو، بخار تو بہت تیز ہے، ان کو پٹیاں کرنا پڑیں گی۔'' ڈاکٹر نے فکرمندی سے کہا۔

''مگر ڈاکٹر صاحب! یہ زخمی تو نہیں ہیں، صرف بخار ہی ہے۔'' ان کی بیگم نے حیرانی اور پریشانی سے کہا۔

''بی بی! میرا مطلب ہے بخار دور کرنے کے لئے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرنا پڑیں گی اور بلڈ پریشر بھی بہت بڑھا ہوا ہے۔ ان کو اپنے کلینک میں داخل نہ کر لیں؟'' ڈاکٹر نے دوائی کے لئے پڑیاں سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

''مگر ڈاکٹر! وہ مجھے اُٹھا کر لے جائیں گے، مَیں گھر جاؤں گا۔'' فخر الدین نے روہانسو ہو کر کہا۔

''کون اُٹھا کر لے جائیں گی؟''

''یہ موت کے فرشتوں کی بات کر رہے ہیں۔'' ان کی بیوی نے جلدی سے کہا۔

''اچھا، اگر یہ گھبرا رہے ہیں تو پھر یہ دوائی لے جائیں مگر ان کو گھر جا کر پٹیاں ضرور کریں۔'' ڈاکٹر اللہ دتہ نے ان کے بازو میں ایک لمبے سے ٹیکے کی سوئی پیوست کرتے ہوئے کہا۔

فخر الدین کو دوبارہ کمبل اور چادر میں لپیٹا گیا۔ خوش قسمتی سے بجلی کا نام و نشان نہیں تھا، بارش رُک چکی تھی اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ یہ قافلہ جس طرح آیا تھا، اسی طرح گھر کی جانب روانہ ہوا۔

دوائی اور ٹھنڈی پٹیوں سے فخر الدین کا بخار تو اتر گیا مگر دل کی دھڑکن کو قرار نہ آ سکا۔ انہوں نے اپنے خیالات کو بھٹکانے کی بہت کوشش کی مگر اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ ذرا سی پلکیں بند کرتے، جنرل پرویز مشرف ان کے سامنے آ موجود ہوتے۔ فوجیوں کے بوٹوں کی دھمک ان کے دل کی دھڑکن کو مزید بے ترتیب کر دیتی۔ خیالات کا ایک ایسا تانتا بندھا تھا جو ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ سارے خیالات اور سپنے ایک سے بڑھ کر برے تھے۔۔۔ لوڈشیڈنگ

خراب موسم کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی طویل ہو چکی تھی۔ انہوں نے احتیاطی تدابیر کے طور پر بلیک آوٹ کا ہنگامی آرڈیننس جاری کر دیا تھا۔ گھر کے سبھی لوگ سردی کی وجہ سے اپنے اپنے لحافوں میں دبکے ہوئے تھے۔ فخرالدین کو جب کچھ زیادہ برا خیال آ جاتا تو لحاف سے منہ باہر نکال لیتے اور جب دل کی دھڑکن معمول پر آ جاتی تو پھر لحاف کے اندر منہ کر لیتے مگر اندر اور باہر سوائے اور سردی کے کوئی فرق نہیں تھا۔

''میں آ جاؤں؟'' پرویز مشرف فوجیوں سمیت ان سے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کر رہے تھی۔ وہ گھبراتے ہوئے دروازہ میں پھنسے چلا رہے تھے۔

''نہیں، نہیں میں وہ فخرالدین نہیں ہوں، میں تو ایک ردی فروش ہوں۔ آپ کو نام کی غلطی لگی ہے۔''

جنرل مشرف ان کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے گھر میں گھس گئے۔ فوجی ان کے پیچھے داخل ہونا شروع ہو گئے۔ ان کے اندر داخل ہونے سے دروازہ بری طرح کھڑک رہا تھا۔ ان کی اپنی ہی گھٹی گھٹی چیخ سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے میں شرابور تھے۔ ان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ انہوں نے اس کو خواب سمجھ کر ابھی سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ صحن کے بجنے والے دروازے نے ان کے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ گھر کے سبھی افراد اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سبھی کے چہروں پر ایک ہی سوالیہ نشان تھا کہ اب کیا ہو گا---انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے گھڑی کا بٹن دبا کر لائٹ آن کر کے ٹائم دیکھا۔ رات کے نو بج رہے تھے، دروازے کو پھر کھٹکھٹایا گیا۔ باہر سے ان کا نام لے پکارا گیا۔ گھر کے سبھی افراد ان کی چارپائی کی پاس آ گئے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو دروازہ کھولے بغیر پوچھنے کا کہا۔ خود وہ کانپتے ہوئے صحن میں لگی کھڑکی کی جانب بڑھ گئے۔ انہوں نے اندھیری میں کھڑکی کی ایک چھوٹی سی درز سے باہر جھانکا، اندھیرے میں ایک جنگلے والی گاڑی نظر آئی۔

''ہوں، قیدیوں والی گاڑی---!'' ان کے ذہن میں میں ایک خیال ابھرا۔

اسٹیرنگ پر لمبی مونچھوں والا کوئی حوالدار محسوس ہو رہا تھا۔ گاڑی کے جلتی سبز اور سرخ ڈائل اس کے چہرے کی کرختگی کو مزید بڑھا رہے تھے۔ اس کی بیوی نے اس کے سمجھائے ہوئے طریقے سے بغیر دروازے کھولے پوچھا۔

''کون---؟''

''فخرالدین صاحب گھر پر ہیں؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

''جی، کیا کام ہے؟'' اس کی بیوی نے بڑے حوصلے سے کہا۔

''ہم صبح دوکان پر بھی آئے تھے مگر ان کی دوکان بند تھی۔ ہم ایجنسی والے ہیں۔ اگر کوئی بڑا بیٹا ہے تو اس کو باہر بھیج دیں۔'' اکرم نے یہ سن کر جلدی سے منہ کے اوپر لحاف کھینچ لیا۔

''اس وقت تو کوئی نہیں ہے، آپ صبح پتہ کر لیں۔'' ان کی بیوی نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، اگر وہ جلدی آ جائیں تو ہمارا بتا ضرور دیجئے گا۔'' انہوں نے گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

دروازے کی طرف آنے والے تعداد میں تین تھے۔ وہ تینوں ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھ گئے۔ گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ ڈرائیور نے گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے گھر پر ایک طائرانہ سی ڈالی۔

'اب مشکل ہی بچوں گا۔ اتنا کونک ایکشن---میرے بے ضرر سے کالم نے کیا کر دیا۔'' فخرالدین نے اپنے بستر پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

''اور کالم لکھو۔ کتنی بار سمجھایا تھا کہ امن بڑی چیز ہے۔ تم نہ سامنے آئے تو وہ میرے معصوم بیٹے کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ یہ معصوم کس گناہ کی سزا بھگتے گا؟'' ان کی بیوی نے اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں کہتا ہوں صبح منہ نہار بھاگ نہ چلیں۔'' انہوں نے ایک تجویز پیش کی۔

''کہاں بھاگو گے؟''

''تمہاری اماں، ابا کے گاؤں چلتے ہیں۔''

''نہیں، نہیں انہیں بڑھاپے میں ذلیل نہیں کروانا چاہتی اور سن لو تمہاری جگہ اپنا بیٹا نہیں دوں گی۔ صبح ہوتے ہی گرفتاری دے دینا۔ میرے لال کو دیکھو، خوف سے کتنا کانپ رہا ہے۔'' ان کی بیوی نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔

وہ رات اس کے لئے قیامت سے کم نہیں تھی۔ وہ سوچتا رہا کہ اس کی گرفتاری کے خلاف جلسے جلوس نکلیں گے۔ اخبارات کے مدیر اور مالکان جنرل مشرف کے خلاف اداریئے لکھیں گے۔ چینلز پر ان کے انٹرویو کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گا اور آخر کا جنرل کو ان کو چھوڑنا پڑے گا مگر فخرا!رین جنرل نہیں چھوڑے گا---یہ آخری بات ان کے دل کے سوال کے جواب میں دماغ نے کہی تھی۔ نہ جانے رات کے کون سے پہر ان کی بیوی کے خراٹے ان کے لوری ثابت ہوئے۔

دن کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے مگر ایجنسی والے اب تک نہ پہنچے تھے۔ فخرالدین کے دل کی دھڑکن تو نہ معمول پر آ سکی تھی مگر خود کو انہوں

نے ذہنی طور پر گرفتار کے لئے تیار کر لیا تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے شیو بنا کر نیا سوٹ اور شادی والی ویسٹ کوٹ پہن لی تھی۔ انہوں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ وہ جنرل مشرف کے پاؤں پڑ جائیں گے اور اس وقت تک ان کے پاؤں نہیں چھوڑیں گے جب تک وہ ان کو معاف نہ کر دیں اور ہاں، انہوں نے اگر ان کو کالم نگاری چھوڑنے کے لئے بیان حلفی دینے کے لئے کہا تو وہ اسی وقت بیان حلفی پر دستخط کر کے ان کے حوالے کر دیں گے۔ اس مقصد کے لئے کچھ عرصہ قبل کرایہ کی دوکان کے لئے گیا بیان حلفی انہوں نے ویسٹ کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا تھا۔۔۔ ان کے بیٹے اکرم کو سوچ اور پریشانی نے بخار میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کی بیوی اپنے بیٹے کی جانب سے بہت فکر مند تھی۔ وہ اپنے میاں کی تیاری دیکھ ضرور رہی تھی، منہ سے کچھ نہ بول رہی تھی۔

''کچھ تو بولو'' فخر الدین نے اپنی بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''میاں! روٹی لے کر آیا کروں تمہارے لئے؟''

''بیگم! نہ جانے کون سی جیل میں لے کر جاتے ہیں۔ کوٹ لکھپت، اڈیالہ، میانوالی یا شاہی قلعے کے کسی ڈیتھ سیل میں رکھیں گے۔۔۔ جو مقدر میں روکھی سوکھی ہوگی، مل جایا کرے گی۔'' فخر الدین کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

''فخرو! زیادہ سے زیادہ کتنی سزا دیں گے؟'' ان کی بیوی نے کہا۔

''میں نے کون سی چوری کی ہے؟ اب مجھے کیا پتہ کالم نگاری کی کتنی سزا ہوتی ہے اور یہ ساری سزا مجھے ''میں ہوں، نا!'' کی وجہ سے ملے گی۔''

فخر الدین نے ویسٹ کوٹ کے نیچے سلوکے کی جیب سے دو ڈائریاں نکالیں۔ ایک ڈائری انہوں نے اپنی بیگم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک عظیم شاعر کی شاعری تمہارے پاس امانت ہے۔ اگر یہ میری ساتھ چلی گئی تو دنیا ایک عظیم شاعر سے محروم ہو جائے گی۔ جابر سلطان اس میں سے بھی بغاوت کی بو سونگھ لیں گے۔''

''اپنے ایک کالم سے تو نبٹ لو، شاعری کا ایٹم بم ساتھ لئے پھر رہے ہو۔'' بیگم نے ڈائری ان کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔

فخر الدین اب ٹیلی فون والی ڈائری کے اوراق الٹ پلٹ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی ڈائری میں اخبارات اور ٹی وی چینلو کے نمبرز سرخ روشنائی سے لکھ رکھے تھے۔ یہ ساری معلومات انہوں نے ردی میں آئے ہوئے اخبارات سے حاصل کیں تھیں۔ انہوں نے ان اخبارات کے دفتر فون کیا۔ جنہوں نے ان کے کالم کو اپنے اخبار میں جگہ دی تھی اور ان کو اپنی گرفتاری کے متعلق بتایا۔ سبھی اخبارات نے ان کی گرفتاری کی کوریج کی حامی بھر لی تھی۔

اکرم ابھی تک بستر میں تھا۔ اس نے بخار سے کانپتے ہوئے کہا۔

''ابا! آپ کا ٹیلی فون ٹیپ ہو رہا ہوگا۔''

''برخوردار اب تو ڈراپ سین ہو رہا ہے۔ اگر ٹیلی فون ٹیپ بھی ہو رہا ہے تو اس سے کیا؟'' انہوں نے ایک مرتبہ پھر ایک ٹیلی ویژن چینل کو نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

نجی ٹی وی چینل نے اس شرط پر کوریج کی حامی بھری کہ آپ کسی دوسرے چینل کو فون نہیں کریں گے۔۔۔ اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے ڈھونڈ، ڈھونڈ کر اپنی ادبی بیٹھک کے دوستوں کو فون کرنے شروع کر دیئے۔ انہوں نے اپنے دوستوں کو ان چائے، پیپسی، لڈو اور فروٹ کیک کے واسطے دیئے جو ماضی کا حصہ بن چکے تھے۔ اخبارات، چینل اور دوستوں کو انہوں نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے سے منع کیا۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ صرف اس وقت باہر آئیں گے جب ایجنسی والے آئیں گے۔

تقریباً ساڑھے بارہ بجے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ ان کا دل شیدے گٹے والے کی ٹلی کی طرح کھڑک اٹھا۔ وہ اختیار بستر پر لیٹ گئے۔ ان کا ہاتھ سینے پر تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی سے کہا۔

''پوچھو کون ہے؟''

ان کی بیوی نے دروازہ کھولے بغیر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''چاچی! میں چائے والا ہوں، چاچا کہاں ہے؟''

انہوں نے اپنی بیوی سے دروازہ کھولنے کا کہا۔ دروازہ کھلنے کی دیر تھی کہ چائے والے لڑکے کے سمیت اخبارات کے نمائندے، چینل کا کیمرہ مین، ان کے دوست احباب ان کے ساتھ بہت سے محلے دار اور چھوٹے بڑے بچے تھے۔ ان کے دوستوں کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار تھے۔ انہوں نے آتے ہی اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ چینل نے ان کی فلم بنانی شروع کر دی۔ اخبارات کے کیمرہ مین ان کی تصاویر بنا رہے تھے۔ ان کے یار دوست ان کے ساتھ فلم بنا رہے تھے تصویریں بنا رہے تھے۔ اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر ان کے دل کو ڈھارس ہوئی دل کی دھڑکن کچھ نارمل ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے اس سوچ نے کہ ایجنسی نے پکڑنا تو صرف انہیں ہی ہے، یہ تو سارے تماش بین ہیں۔ میت تو وہ ہیں، یہ تو سارے پھولوں کے ہار لے کر دفنانے آئے ہیں۔ ان کے دل کی دھڑکن اب نارمل ہوتی چلی گئی۔

''چاچا! آپ کی دوکان کے سامنے دو ایجنسی والے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ وہ دونوں آپس میں جھگڑ بھی رہے تھے اب وہ آپ کے گھر کی جانب آ رہے ہیں۔'' اس شور میں چائے والے لڑکے نے چیختے ہوئے

کہا۔

''نہ ہونے دیں گی گرفتاری فخر الدین کی۔'' ان کے ایک جیالے دوست نے نعرہ لگایا۔

اس کے جواب میں ہر جانب سے نعرے پھوٹ پڑے۔ ''نہیں اٹھانے دیں گے' ایجنسی سے چھین لیں گے۔''

ایک جانب سے ایک اور نعرہ آیا۔ ''یہ ملک جنرل کی جاگیر نہیں کہ جو دل چاہے وہ کرے۔''

ان کی بیوی اپنے بچوں سمیت سیڑھیوں میں کھڑی تھی۔ ٹی وی کیمرہ مین نے ان کو کلوز کیا اور اپنے نمائندے کو ان کے پاس جانب جانے کا اشارہ کیا۔ نمائندہ لوگوں کے رش سے بچتا ہوا سیڑھیوں کی جانب گیا۔ اس کی طرف دیکھ کر فخر الدین کی بیوی نے جھٹ پردہ کر کے منہ دوسری طرف کر لیا۔ کیمرہ مین شرمندہ سا نیچے اتر آیا۔ ایک جانب سے گرما گرم نعرہ بازی ہو رہی تھی۔

''جنرل! تمہاری لئے سولہ کروڑ عوام فخر الدین ثابت ہوگی' تم کتنے فخر و مارو گے۔''

فخر الدین نے جھٹ سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ایک اور دوست نے سب کو چپ کراتے ہوئے ایک پرانے نعرے میں بخیہ گری کی۔

''یا اللہ یا رسول ---- فخر الدین بے قصور۔''

جس کا سبھی حاضرین نے ''بے قصور' بے قصور'' کے للکارے کے ساتھ یک زبان جواب دیا۔

دوستوں نے فخر الدین کو پھولوں کے ہاروں کے ساتھ لاد دیا۔ ایک دوست نے انہیں کاندھوں پر اٹھا لیا۔ ان کی آنکھوں سے فرط جذبات سے آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ گلی میں گاڑیوں کے رُکنے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ ایک بلند آواز اُبھری۔

''ایجنسی والے آ گئے ہیں۔''

اخبارات کے فوٹو گرافراز اور چینل کے کیمرہ مین نے اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ سب دیدے پھاڑے باہر والے دروازے کی جانب دیکھ رہے تھے' ایجنسی کے خوف سے کوئی دروازے کی جانب جانے کی جرات نہیں کر رہا تھا۔ چائے والا لڑکا بھاگ کر باہر گیا' پھر اندر بھاگ آیا۔

''چاچا ایجنسی والے آ گئے ہیں ----'' پھر اس نے باہر کی جانب منہ کر کے کہا۔ ''اندر ہی آ جائیں۔''

فخر الدین کی بیگم اور بچوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ آنے والے سادہ وردی میں تھے' وہ اندر والے حالات کو وہ سمجھنے سے قاصر تھے۔ مجمع کو سانپ سونگھ چکا تھا۔ ان میں سے ایک بولا۔

''فخر الدین صاحب کون ہیں؟''

''جی یہ ہیں۔'' فخر الدین کو اُٹھائے ہوئے شخص نے اوپر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

چند لمحے قبل فخر الدین کے حق میں نعرے لگانے والے یوں لگتا تھا جیسے گونگے ہو گئے ہوں۔ صرف چچا' ان کی بیوی اور بچوں کی سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فخر الدین کاندھوں سے نیچے اتر آئے تھے۔ پہلے بولنے والا دوبارہ مخاطب ہوا۔

''جناب! ہم پیپسی کولا ایجنسی کی جانب سے آئے ہیں۔ ہماری ایجنسی نہ صرف آپ کی دوکان میں مفت رنگ و روغن کروا دے گی بلکہ ہم آپ کو سٹاک میں رعایت دیں گے۔''

ان کے ساتھ آنے والے دوسرے شخص نے کہا۔ ''جناب! ہم کوکا کولا ایجنسی کی جانب سے آئے۔ ہماری ایجنسی نہ صرف آپ کو فریج فری دے گی بلکہ آپ کی دوکان کا بجلی کا آدھا بل بھی ہماری ایجنسی ادا کرے گی۔ یہ معاہدہ آپ ہمارے ساتھ کریں۔''

قہقہے تھے جو فخر الدین کے صحن میں گونج رہے تھے۔ ایجنسی والے ہونقوں کی طرح مجمع کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اچانک ہنسی کو پھر بریک لگ گئی' باہر والے دروازے ایک سوٹڈ بوٹڈ نوجوان داخل ہوا۔ اس نے ڈائری نکالتے ہوئے کہا۔

''فخر الدین صاحب کون ہیں؟''

''فخر الدین نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں ہوں' آپ کون سے خفیہ ادارے سے آئے ہیں؟''

''جناب! مَیں بینک الفلاح کے کریڈٹ کارڈ سیکشن سے آیا ہوں۔ آپ کے ایک دوست نے بتایا تھا کہ آپ کریڈیٹ کارڈ بنوانا چاہتے ہیں۔ میں کل بھی آیا تھا' آپ نہیں ملے' فون بھی اٹینڈ نہیں کیا۔ میں تو یہاں سے گزر رہا تھا' رش دیکھ کر اندر آ گیا۔ معذرت چاہتا ہوں۔ ویسے آپ کا کریڈیٹ کارڈ چند دنوں میں بن جائے گا' بس چند انفارمیشن دے دیں۔''

فخر الدین کے دل کی دھڑکن معمول پر آ چکی تھی۔ اس کے گھر والوں کے چہروں کی رونق لوٹ آئی تھی' ستے ہوئے چہرے کھل اُٹھے تھے۔ وہ وہیں بے اختیار سجدے میں گر گئے۔ ان کے کانوں سے ان کی بیوی کی شوخ آواز ٹکرائی۔

''سجدہ توبہ کے ساتھ کرنا۔''

☆☆

ڈھول کا پول

☆ منظور احمد اعوان

گہری سانولی رنگت، لمبوترے مدقوق چہرے اور منحنی جسامت کا نواب کسی ریاست کا نواب نہیں تھا، اس کا بس نام ہی نواب تھا۔ یہ نام اس کے والدین نے رکھا تھا۔ وہ ایک میراثی گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ ڈھول بجانا اس کا خاندانی پیشہ تھا۔ اس کا پکھڑ دادا، لکڑدادا، پردادا، دادا اور پھر باپ بھی اپنے اپنے دور کے مشہور ڈھولچی تھے اور ڈھول پیٹتے پیٹتے یکے بعد دیگرے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ اب نواب کی باری تھی اور وہ اپنی باری خوب نبھا رہا تھا---اس نے دیسی تالیں اور ڈسکو گڈمڈ کر کے چند نئی تالیں ایجاد کر لی تھیں۔ جس کے باعث پرانی اور نئی نسل کے لوگ اس کے ڈھول کی تھاپ پر بدمست ہو کر تھرکنے لگتے تھے، یوں نواب نے وراثت میں ملے اس فن کو بام عروج پر پہنچا کر اپنے پرکھوں کی بھی مت ماردی تھی۔

اس کے ڈھول کے ڈنکے دور دور تک سنائی دیتے تھے، خوشی کے ہر موقعہ پر اسے بلایا جاتا تھا۔ کہیں بیاہ ہوتا، عرس ہوتا، میلہ لگتا، دنگل ہوتا، ریچھ اور کتوں کی لڑائی ہوتی، وہاں نواب سب کی آنکھ کا تارا بنا ڈھول پیٹتا دکھائی دیتا تھا۔

☆☆☆

کھگا صاحب کی حویلی میں گہما گہمی تھی۔ گاؤں کی گوریاں سرخی پاؤڈر لگائے زرق برق اور بھڑک کے لئے ملبوسات زیب تن کئے لکتی مٹکتی، کھلکھلاتی اور ہنہناتی پھر رہی تھیں۔ حویلی کو رنگ برنگی جھنڈیوں اور برقی قمقموں سے خوب آراستہ کیا گیا تھا۔ فرش پر دریاں بچھی تھیں، تنبو اور قناتیں لگی تھیں۔ حویلی سے باہر بھی وسیع میدان میں طویل و عریض شامیانہ تنا ہوا تھا۔ شامیانے کے نیچے کرسیوں اور چارپائیوں کی قطاریں لگی تھیں جن پر مہمان براجمان تھے۔ شامیانے سے قدرے ہٹ کر اینٹوں سے بنے عارضی چولہوں پر دیگیں دھری تھیں اور دیگیں پکانے والے نائی ان میں کڑچھے گھماتے دکھائی دے رہے تھے۔

کھگا صاحب اس گاؤں کے نمبردار اور بڑے زمیندار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یکے بعد دیگرے تین بیٹیاں اور پھر ایک بیٹا عطا کیا تھا جو کہ اب پندرہ برس کا ہو چکا تھا۔ آج اسی صاحبزادے کی رسم ختنہ تھی۔ کھگا صاحب خوشی کے اس موقع کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتے تھے۔ نواب حویلی کے احاطے کے بیچوں بیچ گلے میں ڈھول آویزاں کئے کھڑا تھا۔ وہ زور زور سے ڈھول بجا رہا تھا۔

''ڈھم---ڈھم---ڈھما---ڈھم---''

خواتین اور لڑکیاں دائرے کی صورت میں اس کے گرد محو رقص تھیں۔ حویلی کی خواتین پردے کی سخت پابند تھیں لیکن نواب غیر تو نہیں تھا، وہ تو سب کا سانجھا تھا۔ کچھ دیر قبل اس نے حویلی سے باہر لگے بڑے شامیانے کے نیچے مردوں کے درمیان اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ خوب داد پائی اور نوٹ سمیٹے تھے۔ یہاں بھی گاہے بگاہے اس پہ نوٹوں کی بوچھاڑ ہونے لگتی تھی ور حسن وشباب کے جلوے سوا تھے۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ نوب ایک شریف النفس انسان تھا۔ کسی کو بری نظر سے دیکھنا پاپ سمجھتا تھا۔ جسے بھی دیکھتا تھا، پیار بھری نظر سے دیکھتا تھا۔ ویسے تو اسے سبھی پہ پیار آ رہا تھا لیکن جس پہ زیادہ امڈ رہا تھا، وہ کھگا صاحب کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی نذیراں تھی۔

نذیراں بیس برس کی ایک الہڑ مٹیار تھی۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کا غرارہ پہنا ہوا تھا اور دوپٹے کو کمر میں کس کے باندھا ہوا تھا۔ وہ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ وہ بار بار دائرے میں سے نکل آتی۔ نواب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے باکی سے دیکھتی اور پھر ایسا رقص کرتی، ایسے پینترے مارتی، ایسے ٹھمکے لگاتی کہ نواب کا ایمان ڈگمگا جاتا۔ اس کا ڈھول بے سُرا ہونے لگتا، ناچنے والیاں بدمزہ ہونے لگتیں۔ پھر وہ یکا یک سر کو زور سے جھٹکتا اور خود کو ہوش کی دنیا میں گھسیٹ لاتا۔ پیار اپنی جگہ لیکن وہ اپنے فن کو بدنام نہیں کرنا چاہتا تھا۔

نذیراں نہ صرف ڈانس اچھا کرتی تھی بلکہ فراخدل بھی غضب کی تھی۔ ناچتے ناچتے وہ گاہے بگاہے اپنی ''پاکٹ'' میں سے کوئی نوٹ برآمد کرتی اور خوشبو کا جھونکا بن کر اس کے بالکل پاس آجاتی اور نوٹ کو اس کی جیب میں گھسیڑ دیتی اور پھر پیچھے ہٹ کر ناچنے لگ جاتی۔ نواب کی

شغل+مغل

✿ شادی کر کے اِنسان کیا کھوتا ہے اور کیا پاتا ہے؟

☆ شادی کر کے اِنسان کھوتا ہی بن جاتا ہے اور بوجھ پاتا ہے۔

✿ اگر بیوی بگڑی ہو تو ساری عمر شوہر نہیں بولتا اگر شوہر بگڑا ہو تو ساری عمر بیوی نہیں بولتی' کیا یہ صحیح ہے؟

☆ جناب! اگر دونوں بگڑے ہوں تو پورا محلہ ہی نہیں بولتا۔

✿ روزانہ خواب میں ایک خوبصورت حور نظر آتی ہے۔ جب وہ میرے قریب آتی ہے تو میری آنکھ کھل جاتی ہے؟

☆ دوبارہ دیکھئے' اگر وہ واقعی خوبصورت ہے تو پھر آپ کے پاس کیا لینے آتی ہے؟

✿ اگر کسی کو کڑی سزا دینی ہو تو کیا کرنا چاہئے؟

☆ اُس کی شادی کروادیں۔

✿ ''عشق بچوں کا کھیل نہیں'' پھر اس کے کوچنگ سنٹر کیوں نہیں کھولے جاتے؟

☆ لگتا ہے' کبھی آپ نے گرلز کالج یا بازار کا چکر نہیں لگایا۔

✿ سب لوگ کہتے ہیں کہ مَیں بہت ہی حسین ہوں؟

☆ اندھوں کی باتوں کا یقین مت کیا کریں۔

✿ کیا جنت میں حوروں کے علاوہ دُنیا والی بیوی بھی ملے گی۔

☆ جی نہیں ورنہ کوئی بھی شخص جنت میں جانے کی آرزو نہ کرتا۔

✿ لڑکیاں اکثر میری طرف دیکھ کر ہنستی ہیں؟

☆ کچھ کھایا پیا کریں۔ اگر غور سے دیکھنے پر نظر آئیں گے تو لڑکیاں تو ہنسیں گی ہی' نا!

✿ وہ بار بار پھسل جاتا ہے---دوپٹہ سر سے۔

☆ دوپٹے کے اوپر دس کلو کا پتھر رکھ دیں۔

✿ دُنیا کا سب سے بڑا جھوٹ آپ بول سکتے ہیں؟

☆ مَیں نے ایک لڑکی کو خاموش دیکھا۔

✿ اگر آپ کے پاس دو سیب ہوں اور دو دوست آجائیں تو آپ کیا کریں گے؟

☆ اُن کے جانے کا انتظار۔

✿ مَیں دُنیا میں اپنا نام بلند کرنا چاہتا ہوں' کیا کروں؟

☆ کے۔ ٹو پر مکان تعمیر کروالیں۔

✿ عورت کی زبان بند کرنے والی مشین کب ایجاد ہوگی؟

☆ ایسی مشین تو پہلے ہی موجود ہے--- دوسری عورت!

✿ عشق' مشک اور کھانسی چھپائے نہیں چھپتی کیا یہ دُرست ہے؟

☆ چھپ جاتی ہے تین فٹ گہری زمین میں۔

✿ عقل کے اندھے کن لوگوں کو کہا جاتا ہے؟

☆ شادی شدہ لوگوں کو۔

✿ اگر میاں اور بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں تو پھر بچے کیا ہوئے؟

☆ سٹپنی---!

✿ میری پڑوسن پانچ زبانوں پر عبور رکھتی ہے۔

☆ لیکن خاموش کسی زبان میں بھی نہیں رہ سکتی ہوگی۔

✿ مجھے ہر چیز گول گول نظر آتی ہے۔

☆ جلد ہی آپ کے رول (شادی) ہونے کا وقت آنے والا ہے۔

✿ مَیں نے کبھی اپنے حسن پر غرور نہیں کیا۔

☆ جو چیز موجود ہی نہ ہو اُس پر غرور کیا کرنا۔

✿ تیرے بن مجھے نیند نہیں آتی سئیں کیا کروں؟

☆ اے ٹی وَن کی گولی کھالیا کریں۔

✿ آخر مردوں کو عورت ذات میں کیڑے ہی کیڑے کیوں نظر آتے ہیں؟

☆ ہوتے جو بہت ہیں۔

✿ اگر آپ کی شادی کروادی جائے تو---؟

☆ بھائی! آپ کی میرے ساتھ کیا دُشمنی ہے؟

✿ میری محبوبہ مجھے گھاس نہیں ڈالتی۔

☆ کھیتوں میں جاکے چرلیا کریں۔

✿ مجھے ایک لڑکی سے پیار ہوگیا ہے۔

☆ اب آپ کا اللہ ہی محافظ۔

✿ کیا دُنیا میں سارے احمق ہی ہیں؟

☆ جی نہیں' کچھ کنوارے بھی ہیں۔

✿ مَیں نہ بیوی سے ڈرتا ہوں' نہ ساس کو خاطر میں لاتا ہوں۔ نہ سسر سے ڈرتا ہوں' نہ سالے سے' بھلا کیوں؟

☆ کیونکہ ابھی تک آپ نے شادی جو نہیں کی۔

✿ ''تیری گلیوں میں نہ رکھیں گے قدم آج کے بعد''

☆ بارشوں کی وجہ سے کیچڑ جو ہوگیا ہے۔

✿ مَیں جب بھی کسی لڑکی کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھاتا ہوں' ناکام ہوجاتا ہوں' کیا کروں؟

☆ آئندہ ہاتھ بڑھاتے وقت ہاتھ میں پانچ ہزار کا نوٹ رکھ لینا۔

✿ محبت کیا ہے؟

☆ ایسے معجون کی مانند ہے جس کی ڈیٹ ایکسپائر ہوچکی ہو۔

✿ شادی والے دن رُخصتی کے وقت دُلہن روتی کیوں ہے؟

☆ کیونکہ اسے پتہ ہوتا ہے کہ باقی ساری عمر شوہر ہی روتا رہے گا۔

✿ کہتے ہیں کہ مصیبت اکیلی نہیں آتی' کیا یہ صحیح ہے؟

☆ بالکل---ساتھ وہ ساس کو بھی لاتی ہے۔

✿ شوہر کب خوش ہوتا ہے؟

☆ جب بیوی میکے چلی جائے۔

✿ دو اور دو چار ہی ہوتے ہیں؟

☆ اگر کسی کے دینے ہوں تو تین' اگر کسی سے لینے ہوں تو چار!

✿ میری شادی اپنوں میں بہتر رہے گی یا بیگانوں میں؟

☆ بیگانوں میں---شادی کے بعد اپنے بھی بیگانے ہوجاتے ہیں۔

✿ کئی لوگ تو اپنی بیویوں سے بہت ہی خوش ہوتے ہیں؟

☆ ہاں' جن کی بیویاں فوت ہوجائیں۔

محمد صابر مغل عبدو پوری

قمیض کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے کھلے گریبان میں سے اس کی ابھری ہوئی پسلیاں واضح دکھائی دیتی تھیں۔ نوٹ جیب میں ڈالتے وقت نذیراں کا گورا گورا اور نرم وملائم ہاتھ اس کی کسی ہڈی سے چھو جاتا یا وہ خود ہی ہڈی کو اس کے ہاتھ سے ٹکرا دیتا تھا۔ نذیراں کی قربت اور ہاتھ کا لمس پا کر اس کے اندر کرنٹ سا دوڑ جاتا' اس کی ناتوان ہڈیوں میں جان آ جاتی اور وہ مخمور ہو کر اسے گھورنے لگتا۔ وہ جب تک وہاں رہا' یہ آنکھ مٹکا چلتا رہا۔ پھر آخر کار اسے مردانے میں بلالیا گیا کیونکہ ختنہ کرنے والا نائی اپنے اوزاروں اور ہتھیاروں سمیت وارد ہو چکا تھا۔ وہاں دعائے خیر اور رسم ختنہ کی تکمیل ہوئی تھی۔ پھر مردوں نے بھنگڑا ڈالنا تھا' بعدازاں طعام وشرب کا بندوبست بھی تھا۔

شام کے وقت نواب نوٹوں سے جیبیں لبالب بھرے لنگڑاتا ہوا گھر پہنچا تو بھینس نما کالی کلوٹی اور ہٹ کٹی گلابو نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ پانچ عدد کالے بجنگ بچے بھی ''ابا--- ابا'' کے نعرے لگاتے ہوئے جونکوں کی طرح اس سے چمٹ گئے اور لگے خرمستیاں کرنے۔ نوب نے انہیں ایک ایک روپیہ پاکٹ منی دے کر بمشکل ان سے جان چھڑائی۔ شور شرابا سن کر چارپائی کے ساتھ بندھے کپڑے کے جھولے میں پڑا نئے سال کا نیا تحفہ منا بھی جاگ گیا تھا اور حلق پھاڑ پھاڑ کے چلانے لگا تھا۔ نواب نے ڈھول کو کمرے کی دیوار میں گڑی ایک کھونٹی سے لٹکایا۔ نذیراں کے دیئے ہوئے نوٹوں کے علاوہ باقی تمام نوٹ گن کر گلابو کے حوالے کیئے اور نہانے کے لئے غسل خانے میں گھس گیا۔ گلابو نے رقم کو ایک صندوق میں حفاظت سے رکھ دیا اور پھر کھانے کی وہ پوٹلی کھولنے لگی جو نواب حویلی سے لے کر آیا تھا۔

اندھیری رات تھی' پورا عالم سو رہا تھا۔ فضا مچھروں اور جھینگروں کے بولنے' مینڈکوں کے ٹرانے اور گلابو کے بے سرے خراٹوں سے گونج رہی تھی۔ بچے چند ٹوٹی پھوٹی چارپائیوں پر اوندھے سیدھے پڑے خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ نوب ایک جھلنگا سی چارپائی پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ چرس بھرے سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور بار بار نذیراں کے دیئے ہوئے نوٹوں کو سونگھ رہا تھا۔ اسے ان میں نذیراں کی مہک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس مہک کو اپنی نس نس میں اتار رہا تھا۔ اس پہ خمار طاری تھا' آنکھیں بند تھیں اور تصور میں نذیراں رچی بسی تھی۔

گلابو بھی کی چارپائی پر پھیلی پڑی تھی۔ اس کے منہ سے خرخرانے کی عجیب آوازیں نشر ہو رہی تھیں۔ کبھی وہ دونوں ایک ہی چارپائی پر سویا کرتے تھے لیکن ایک شب سوتے میں جب گلابو نے اچانک پہلو بدلا تو نواب کی ٹانگ اس کے نیچے پھنس گئی۔ اس نے ٹانگ کھینچ کھانچ کر اس ہتھنی کے نیچے سے نکال تو لی مگر اس کے گھٹنے کا جوڑ بری طرح سے ہل گیا تھا جو باوجود مالش' ٹکور اور مرہم پٹی کے بھی سیٹ نہیں ہو سکا تھا۔ اس کی

اپوا

''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ''
مگر ہے شاعرِ رنگیں' بیاں کا قافیہ تنگ
کہ یہ غریب تو شوہر ہے اور شاعر ہے
وہ لیڈرانی ہے' اپوا کی بلکہ ممبر ہے
اِسے ہے فکرِ سخن اور اُسے ہے قوم کی فکر
غرض کہ بچوں کا آتا نہیں کہیں بھی ذِکر
یہ بچے وہ ہیں کہ جن کا نہیں ہے کوئی کفیل
کہ ماں ہے بحرِ رجز اور باپ بحرِ طویل
سیاسیات میں خدمت نے پائی یہ عظمت
سوائے اپنے ہی بچوں کے ''مادرِ ملت''
نظر نہ آئے گی گھر میں کبھی یہ گھروالی
کہ اِس کے پیشِ نظر قوم کی ہے بدحالی
''علی الصباح چومر دَم بہ کاروبار روند''
یہ پرس اُٹھا کے چلی' جس کی کوئی ساس نہ نند
نتیجہ یہ ہے کہ بچوں میں عین غین ہوں مَیں
کہ صرف باپ نہیں' والدین ہوں مَیں
ہر ایک بحر میں لوری اُنہیں سناؤں گا
یہ روتے جائیں گے' مَیں گنگنائے جاؤں گا
کسی کے واسطے لاؤں گا دودھ کی شیشی
کسی کو گود میں لے کر بجاؤں گا سیٹی
کوئی جو گود میں چڑھ کر کرے بداخلاقی
تو اِس سے عارضی صورت میں ہوگی ناچاقی
رہے گی ساتھ ہی فکرِ سخن مگر جاری
کہ شاعری تو ہے دراصل ایک بیماری
مگر کہے تو کوئی کس طرح کہے اشعار
بنے ہوئے ہیں یہ بچے نتیجۂ افکار

(شاعر: شوکت تھانوی مرحوم) انتخاب ✿ ثاقب حسین مجاہد

چال میں لنگڑاہٹ اسی حادثے کا نتیجہ تھی۔ وہ تب سے چوکنا ہو گیا تھا اور الگ چارپائی پر سونے لگا تھا۔

ویسے تو نواب' میراثی ہونے کے ناطے دعائیں کرتا ہی تھا کہ کہیں نہ کہیں خوشی کی کوئی تقریب منعقد ہوتا کہ اس کے گھر کا چولہا دھڑا دھڑ جلتا رہے۔ اب رہ رہ کر اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے یہ دعا نکلتی تھی کہ کھگا صاحب کی حویلی میں یا ان کے کسی عزیز کے ہاں خوشی کی کوئی محفل سجے تا کہ وہ رقم کمانے کے ساتھ ساتھ نذیراں جیسی خوبرو حسینہ کا جلوہ بھی دیکھ سکے' یعنی وہ ایک ہی ٹکٹ میں دو شو دیکھنا چاہتا تھا۔

اس کی دعا بالآخر قبول ہوئی۔ پاس کے گاؤں میں کھگا صاحب کے بھانجے شرفو کھگا کے بھانجے شرفو کھگا کی شادی میں دونوں کا ٹکراؤ ہو گیا۔ نذیراں نے سرخ رنگ کا بہت مہنگا لہنگا پہنا ہوا تھا جو اس کے گورے بدن پر خوب جچ رہا تھا۔ وہ زیوروں سے بھی لدی پھندی تھی۔ اس پہ کسی دلہن کا گمان ہوتا تھا۔ اس کا یہ روپ دیکھ کر وہ مبہوت رہ گیا اور جب تک زنانے میں رہا' اس کی بے چین نگاہیں نذیراں کے دلکش سراپے کا ایکسرے کرتی رہیں۔ نذیراں بھی شوخ و شنگ نظروں سے اسے دیکھتی اور ناچتی رہی۔ آج اس کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ ڈھول بجتا رہا' نذیراں ناچتی رہی اور ادھر نواب کا دل بے قرار ہو کر تھرتھراتا رہا۔

اس روز کے بعد وہ نذیراں کے بارے میں زیادہ شدومد سے سوچنے لگا۔ اس حسینہ طرح دار کے عشق کا بھوت اس کے انگ انگ میں سرایت کر گیا' وہ ہر پل اس کے سہانے خیالوں میں غرق رہنے لگا۔ نذیراں اگر اسے لفٹ نہ کرتی تو وہ اس کے بارے میں کبھی سوچنے کی جرات نہ کرتا۔ اسے اس کی ایک ایک ادا یاد آتی اور وہ دل تھام کر رہ جاتا تھا۔

''مجھ میں آخر کیا خوبی ہے جو بڑے گھر کی پروردہ ایک حسین و جمیل لڑکی مجھ پہ مرمٹی ہے؟'' وہ اکثر اپنے سے یہ سوال پوچھتا تھا۔

اس نے آئینہ میں باریک بینی سے اپنا جائزہ لیا تھا۔ اس نے خود میں ایسی خوبی کو ڈھونڈنے کی بہت سعی کی تھی لیکن ناکام رہا تھا۔

''دل تو اگر کھوتے (گدھے) پر آ جائے تو وہ بھی دلبر لگنے لگتا ہے۔'' وہ یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیتا تھا۔

جب بھی بے چینی بڑھتی' وہ چرس بھرا سگریٹ سلگا لیتا۔ نذیراں کے دیئے ہوئے نوٹوں کو سونگھنے لگتا۔ گلابو سے رومانس کرتے وقت بھی وہ آنکھیں بند کر لیتا۔ سامنے گلابو ہوتی مگر تصور میں نذیراں رچی بسی ہوتی۔ یوں وہ ایک نئے احساس' نئے لطف سے روشناس ہونا چاہتا لیکن نذیراں ایک چھریرے بدن کی سلیم اور سمارٹ لڑکی تھی جبکہ گلابو کسی بھینس کی طرح ہٹی کٹی تھی۔ نواب کے سارے تصور کا ستیاناس ہو جاتا تھا۔

''کاش' میں میراثی نہ ہوتا' کھگا ہوتا تو آج گلابو کی بجائے نذیراں میرے گھر میں راج کر رہی ہوتی۔'' وہ حسرت سے سوچتا تھا۔

اسے نذیراں کی سب سے بڑی بہن وزیراں کی شادی میں بلایا گیا۔ اس بار نذیراں کی بے تکلفی بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ نواب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جان لیوا انداز میں مسکراتی اور فرمائش کرتی۔

''نوابے! وہی تال بجاؤ جو شروع میں بجاتی تھی۔''

کبھی اس کا ڈھول بے سرا ہونے لگتا تو وہ ناچتے ناچتے پیار سے سرزنش کرتی۔

''سنبھل کے نوابے! اب تم پٹڑی سے اترنے لگے ہو۔''

وہ کبھی پاس آ کر اس کی جیب میں نوٹ گھسیڑتی اور سرگوشی میں کچھ کہتی۔ نواب قدرے اونچا سنتا تھا اس لئے اس کی سرگوشی کو سمجھ نہیں پاتا تھا۔ اسے تو بس گلاب کی پتیوں سے ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے اور وہ صدقے واری ہونے لگتا تھا۔

بارات کی آمد پر براتیوں کو ٹھنڈے مشروبات پیش کئے گئے۔ ایک پانچ چھے برس کی پیاری سی بچی نواب کے پاس بھی کوکا کولا کی ایک بوتل لے آئی۔ وہ اس عزت افزائی پر ششدر رہ گیا۔ وہ حیرت سے کبھی بوتل کو دیکھتا تھا اور کبھی بچی کو۔

''پی لو میراثی۔۔۔!'' بچی نے معصومیت سے کہا۔ ''باجی نذیراں نے بھیجی ہے۔''

''میراثی کہے جانے پر وہ اندر ہی اندر کھول اٹھا۔ اس نے ناگواری سے بچی کو دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ڈھول بجانے کی چھڑی اسے دے مارے مگر بچی بڑے خاندان کی تھی اور بوتل نذیراں نے بھیجی تھی۔ وہ اس کا کڑواہٹ کو کوکا کولا میں گھول کے غٹاغٹ پی گیا۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو وہی بچی اسے بچے کھچے کھنے سے بھری ٹرے دے گئی۔ وہ جان گیا کہ اس کی یہ خاطر مدارت یونہی نہیں ہو رہی بلکہ آگ ادھر بھی ہے برابر لگی ہوئی۔ اس آگ کو مزید بھڑکانے کے لئے تیل کا چھڑکاؤ اشد ضروری تھا لیکن غریب اور بے حیثیت نواب کے پاس تیل کہاں تھا؟

کھانے کے بعد کچھ رسومات کی ادائیگی ہوئی اور پھر دلہن کی رخصتی ہو گئی۔ جب آخری بار نواب اور نذیراں کا سامنا ہوا تو نذیراں کے ہونٹوں پر ایک مدھ بھری مسکان تھی۔ نواب کی مونچھیں پھڑ پھڑائیں اور باچھیں کھل اٹھیں۔ ہونٹوں کے گوشے پھیل کر کانوں کو چھونے لگے۔ ٹیڑے میڑھے زرد دانتوں کی قطار لشکارے مارنے لگی۔ یہ اس کی چاہت کا ایک اسٹائل تھا اور اس بات کا عہد بھی کہ پھر ملیں گے۔

پھر تو پورا برس بیت گیا۔نواب اس کے ہجر وفراق میں مرغ بسمل کی مانند پھڑ پھڑاتا رہا۔وہ حسرتناک نظروں سے حویلی کی بلند وبالا دیواروں کو دیکھتا تھا جن کے اندر اس کی محبوبہ دلنواز کا بسیرا تھا--- پرانے دور کے عاشق ٹائپ لوگ اپنے دل کی آواز کو معشوقہ تک پہنچانے کے لئے ٹیپ ریکارڈر پرفل آواز سے گانے بجایا کرتے تھے یا بانسری کا سہارا لیا کرتے تھے۔اس بے چارے کے پاس تو فقط سیلوں سے چلنے والا دو بینڈ کا ریڈیو تھا۔اسے بانسری بجانی بھی نہیں آتی تھی البتہ وہ بین گزارے لائق بجالیتا تھا۔بین بجانی اس نے اپنے آنجہانی سسر رمتے جوگی سے سیکھی تھی۔

وہ فارغ دنوں میں حویلی کے قریب کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھ جاتا اور پھر دیر تک بین بجاتا رہتا۔اسے امید تھی کہ کبھی نہ کبھی اس کی بین کی آواز نذیراں سن لے گی اور پھر وہ دیوار سے جھانک کر دیکھے گی۔ ملنا تو شاید نصیب میں نہ ہو لیکن وہ اس کا دلکش مکھڑا ضرور دیکھ لے گا مگر اس کی یہ امید کبھی بر نہ آئی۔نذیراں نے کبھی دیوار سے جھانک کر نہ دیکھا البتہ وہاں سے گزرنے والے مویشی مڑ مڑ کر حیرت سے اسے دیکھتے اور اس کی اس بے وقت کی راگنی پر احتجاج کی صدائیں بلند کرنے لگتے تھے۔

''میں تو اس کے لئے تڑپتا ہوں' کیا وہ بھی مجھے یاد کرتی ہوگی؟'' وہ کبھی کبھی اپنے دل سے یہ سوال پوچھتا تھا۔

اس کا دل تو بنا سوچے سمجھے ''ہاں'' کہہ دیتا تھا مگر دماغ تپ جاتا اور الٹا اسی سے پوچھنے لگتا تھا۔

''تم میں آخر ایسی خوبی کیا ہے کہ وہ تمہیں یاد کرے گی؟''

اسی ذہنی ودلی کشمکش میں ایک روز پھر بلاوا آگیا۔

حویلی میں حسب سابق خوب رونق تھی' شادی کے ہنگامے عروج پہ تھے۔نواب نے اندازہ لگایا کہ آج کھگا صاحب اپنی دوسری بیٹی بشیراں کا بار عظیم اتار کر کچھ ہلکے پھلکے ہو رہے ہوں گے اور پھر ان پر صرف ایک ہی بوجھ رہ جائے گا' نذیراں کا بوجھ۔

''اللہ کرے یہ بوجھ ان کی موٹی گردن پر تاحیات سوار رہے' بے شک وہ اس بوجھ میں دب کر اگلے جہان کو سدھار جائیں۔'' اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

اس کی بے قرار نگاہیں متلاشی انداز میں ادھر ادھر بھٹکتی پھر رہی تھیں۔اس رونق میلے میں اسے سبھی حسینائیں دکھائی دیں مگر نذیراں یوں غائب تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔وہ وہاں اس کے بارے میں پوچھ تاچھ بھی تو نہیں کرسکتا تھا' آخر کس حیثیت سے پوچھتا؟

''شاید وہ بیمار شیمار ہو۔'' اس نے خود کو تسلی دینے کے لئے اندازہ لگایا۔

نذیراں کے بغیر اس کا جی نہیں لگ رہا تھا' ناچنے والیاں اسے چڑیلیں دکھائی دے رہی تھیں اور وہ خود کو بھی بھوت تصور کر رہا تھا۔اسے غصہ آرہا تھا۔وہ اپنا غصہ ڈھول پر تابڑ توڑ سوٹیاں برسا کر اتار رہا تھا۔ بے چارہ ڈھول اس بے دردی سے پیٹے جانے پر بلبلا رہا تھا۔پھر بارات آئی۔کھایا پیا اور دودلہن کو وصول کر کے چلی بھی گئی۔

نواب واپسی کے لئے پر تولنے لگا۔اتنے میں وہی بچی جس نے گزشتہ مرتبہ اسے کوکا کولا اور کھانا لاکر دیا تھا۔اس کے پاس آئی۔مٹھی میں دبا ایک مڑا تڑا کاغذ اور سو سو روپے کے دو نوٹ چپکے سے اس کے حوالے کیے اور چلتی بنی۔نواب کا دل دھک سے رہ گیا۔اس کے ذہن میں بہت سی ایسی فلموں کے سین گردش کرنے لگے کہ جب کوئی امیر لڑکی کسی غریب لڑکے کو چاہتی ہے تو اپنا تن من دھن اس پہ نچھاور کر کے اسے مالا مال کر دیتی ہے اور ماں باپ کو خبر تک ہوتی ہے جب اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا ہوتا ہے۔پھر بھی وہ اسے راہ راست پہ لانے کے لئے پیار سے سمجھاتے ہیں ور جب دیکھے ہیں کہ لاتوں کی بھوتنی باتوں سے نہیں مان رہی ہے تو اس کی خوب لتریشن کرتے ہیں۔اس پر بے جا پابندیاں عائد کر دیتے ہیں' لڑکے پر بھی عرصہ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے مگر پیار کے متوالے تشدد کو حوصلے سے سہہ جاتے ہیں ور ''اف'' تک

ہزل

(علامہ اقبال کی روح سے معذرت کے ساتھ)

کانچ کی چوڑی سے کٹ سکتا ہے عاشق کا جگر
پیر جنگلی پر' کلامِ صنفِ نازک بے اثر
چاند تارے توڑ کر لانا' پرانی بات ہے
ہوش اڑ جائیں گے' محبوبہ کو لے جا پارلر
خرچ شادی کا لگایا' لسٹ بنی اتنی طویل
''نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر''
ساگ لینے جاتی تھی ہر روز' دیکھا میں نے جب
بو دیا ہے اس لئے سرسوں در و دیوار پر
شادی ہوتی خانہ آبادی ہے لیکن جانے کیوں
روح میری کانپتی ہے کارڈ شادی دیکھ کر

✿ روح' مردان
موبائل: 0300-5713018

نہیں کرتے ہیں، ہر گھڑی پیار کی مالا جپتے رہتے ہیں جس کے باعث جیت بالآخر پیار کی ہوتی ہے۔

''شائد نذیراں بھی کسی آفت میں مبتلا ہے اس لئے تو آج دکھائی نہیں دی۔'' اس نے فکر مندی سے سوچا اور خود کو بھی خطروں میں گھرا ہوا محسوس کیا۔ اس نے خط اور رقم کو اپنی دھوتی کی ڈب میں اڑس لیا۔ ڈھول کو کاندھے پر لٹکایا ہاتھ میں کھانے کی پوٹلی اٹھائی اور جلدی سے وہاں سے روانہ ہوگیا۔

اندھیری رات تھی، گلابو اور بچے بے خبری سے پڑے سو رہے تھے۔ نواب جاگ رہا تھا۔ اس کی چارپائی کے پاس ٹین کے ایک اوندھے کنستر پر لالٹین جل رہی تھی۔ نواب لالٹین کی زرہ روشنی میں نذیراں کے خط کو پڑھنے کے لئے مغز ماری کر رہا تھا۔ وہ تین جماعتیں پڑھا ہوا تھا' اخبار بھی جوڑ توڑ کر کے پڑھ لیتا تھا۔ نذیراں کی لکھائی ایسی بھدی تھی گویا کاغذ پر کیڑے مکوڑے چپکا دیئے گئے ہوں۔ نواب نے اٹک اٹک کر بالآخر وہ خط پڑھ ہی ڈالا' لکھا تھا۔

''پیرے نواب---!''

اتنا پڑھ کر ہی نواب پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ کچھ دیر وہ یونہی گم صم بیٹھا اپنے اندر گونجنے والی ''پیارے نواب--- پیارے نواب---'' کی صدائیں سنتا رہا۔ رفتہ رفتہ خود کو سنبھالا اور پھر آگے پڑھنے لگا۔

''سدا ڈھول بجاتے اور خوشیاں مناتے رہو۔

السلام علیکم! میں سب سے چھپ کر یہ خط لکھ رہی ہوں۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ تم کتنے بڑے جادوگر ہو۔ تم جب بھی ڈھول بجاتے ہو' میرے اندر دھماکے سے ہونے لگتے ہیں۔ پھر میرے اندر شاید نرگس کی بدروح سما جاتی ہے اور میں بے خود ہو کر ناچنے لگتی ہوں۔ تم نے ہماری برادری والوں کی ہر خوشی میں مجھے اودھم مچاتے دیکھا ہوگا مگر آج میں بے حد مجبور ہوں کہ ناچنے والیوں کی ٹولی میں شامل نہ ہو سکی لیکن تمہارے ڈھول کی ''ڈھم--- ڈھم---'' پر یہاں اپنے کمرے میں اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی مست ہو کر جھومتی رہی۔ تم پاس کے گاؤں کے مراد علی عرف مرلی کھگا کو تو جانتے ہو گے۔ وہ میرے تایا کا بیٹا ہے۔ بچپن میں اس کی نسبت آپا بشیراں کے ساتھ طے پا گئی تھی لیکن بڑے ہو کر اسے میں بھا گئی اور وہ مجھے پسند آ گیا۔ بہت عرصہ ہم سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ''پیار پیار'' کھیلتے رہے۔ اس کی شادی کی بات چلی تو اس نے اپنے والدین سے صاف کہہ دیا کہ اسے بشیراں نہیں بلکہ نذیراں چاہئے۔ وہ ماں باپ کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا ہے' اس کی ضد کے آگے انہیں جھکنا پڑا۔ انہوں نے جیسے تیسے میرے والدین کو بھی رضامند کر لیا۔ بہرحال' بڑوں کی کوششوں سے آج پیار کے دو متوالوں کا ملن ہو رہا ہے۔ کچھ دیر بعد میں پیا دیس کو سدھار جاؤں گی۔ میں نے سنا ہے کہ تم جیسے مسکین لوگوں کی دعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔ میری خوشگوار ازدواجی زندگی کے لئے ضرور دعا کرنا۔ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں اپنے ہونے والے بیٹے کے عقیقے اور ختنے پر بلکہ خوشی کے ہر موقعے پر تمہیں ضرور بلواؤں گی تاکہ تمہارے ڈھول کی ''ڈھما--- ڈھم---'' پر ڈانس کر کے اپنی خوشیاں دوبالا کر سکوں--- خط کے ہمراہ دو سو روپے بھیج رہی ہوں۔ سوکھے سڑے اور مریل سے ہو گئے ہو' کھاؤ پیو اور جان بناؤ تاکہ پھر نئے جوش اور توانائی کے ساتھ ڈھول بجا سکو۔ رب رکھا

فقط تمہارے ڈھول کی دیوانی

نذیراں بی بی بقلم خود''

نواب تو نہ جانے اس سے کیا امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھا' آج اس پہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ تو محض اس کے ڈھول کی دیوانی ہے تو اسے دھچکا سا لگا اور اندر ہی اندر کچھ ٹوٹ کر بکھرتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ گرتا پڑتا اس میخ کی جانب بڑھا جس پر اس کا ڈھول آویزاں تھا۔ اس نے اسے وہاں سے اتار کر اپنے گلے میں لٹکا لیا اور پھر اسے بجانا شروع کر دیا۔ گلابو اور بچے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ جھولے میں پڑا منا بھی چیخنے چلانے لگا۔ نواب کو ڈھول اپنا رقیب' دشمن اور نہ جانے کیا کیا لگ رہا تھا۔ وہ اسے زور زور سے پیٹ کر اپنا سارا غصہ اس پہ اتار رہا تھا--- بے چارا ڈھول کچھ دیر تو اس کی مار سہتا رہا' پھر اچانک ہی اس کے دونوں پڑے ''پھڑک'' کر کے پھٹ گئے۔ نوب پر جنون طاری تھا۔ وہ ڈھول پر بجانے والی چھڑیاں اپنے سر پہ مارنے لگا۔ پھر یکا یک تیورا کر گرا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔ گلابو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے' وہ اسے جھنجھوڑنے لگی۔

نہ جانے وہ کتنی دیر بے سدھ پڑا رہا۔ ہوش میں آیا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اس پہ جھکے ہوئے تھے۔ کوئی اس پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا' کوئی ہاتھ اور پاؤں مل رہا تھا۔ بچے اس کے چاروں جانب کھڑے رو رہے تھے۔ گلابو سر میں خاک ڈالے سینے پر دو ہتھڑ مار مار کے بین کر رہی تھی۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں اسے دلاسے دے رہی تھیں۔ نوب پہلے تو سمجھ ہی نہ پایا کہ ایسا کیا ہوا ہے جو گھر میں کہرام برپا ہے۔ پھر اس کی نظر پاس ہی پڑے پھٹے ہوئے ڈھول پر پڑی' اسے سب کچھ یاد آ گیا اور اس نے پھر سے آنکھیں موند لیں۔

☆☆

☆ سید ابرار بخاری

شعراء اور شاعری

صاحبو! ہمارا تعلق چونکہ اَدب سے ہے اور اَدب کے معاملے میں ہم کچھ زیادہ ہی ''اَدب'' کے قائل ہیں اِس لئے ہر کوئی ہمیں آدابتا ہے۔ کوئی ناول کا تیسرا باب سنا کر (آخری سننے کی حسرت ہی رہی) ہم سے اُس کے متعلق تکنیکی بحث کا خواہاں ہے' کوئی اپنا تازہ افسانہ سُنا کر خود ہی اُسے مکاں ولامکاں سے بھی ماوراء ثابت کرنے پر خار کھائے بیٹھا ہے اور کوئی مزاح پر ''قلم برداشتہ'' مضمون لکھ کر لاتا ہے اور ہمیں سُنا کر دِلبرداشتہ کرتا ہے۔ کئی بار تو ہمیں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ ہمارا موڈ مضمون سننے سے پہلے خراب تھا یا سننے کے بعد ہوا ہے البتہ ہم خاتمے پر ہنس ہنس کر داد ضرور دیتے ہیں۔ کچھ خاطر اجداب سے' کچھ بطورِ طنز مزاحیہ تحریر سے مزاح کی گمشدگی پر اور زیادہ تر اِس بات پر کہ صد شکر کہ مصنف ہذا نے مزاحیہ مضمون لکھنے پر ہی اکتفا کیا۔ اگر مضمون کی بجائے مزاحیہ فلم کی تخلیق کرتا تو ہمارا کیا حشر ہوتا...... اِس بات کو آپ شاید مبالغہ جانیں لیکن وہ کیا ہے کہ ''جن تن لاگے سوتن جانے''...... ہمیں ایسی ایسی نادرروزگار تحریروں کو پڑھ اور سن چکے ہیں کہ جن کا اثر اُلٹ ہوتا ہے سنجیدہ تحریر پر ہنسی اور مزاحیہ تحریروں پر رونا آتا ہے البتہ مصنف تحریر ہذا ہم سے اِس بات کی سو فیصد اُمید رکھتا ہے کہ ہم اُسے مارک ٹوئن سے بھی زیادہ نمبر دیں گے حالانکہ ہمارے نزدیک تو ایسے ادیب کو ہی ''مارک'' کر دینا چاہئے لیکن جن کو ہمارے ساتھ خدا واسطے کا بیر ہے' وہ شاعر حضرات ہیں۔ جو ہیں اور بہت ہیں حالانکہ ہم اِس بات کے اَشد متمنی ہیں کہ شاعر اگر ہوں بھی تو کم ہوں اور اگر بفضل تعالیٰ بالکل نہ ہوں تو ہم سے زیادہ روئے زمین پر دوسرا کوئی خوش نہ ہوگا...... بقول ہمارے دوست بٹ صاحب' پہلے کوئی اینٹ اُٹھاتا تھا تو نیچے سے یا تو مٹی نکلتی تھی یا کوئی بٹ کپڑے جھاڑتا نکل آتا تھا۔ آج کل تو اینٹ اُٹھانے پر مٹی بھی نہیں نکلتی فقط شاعر صاحب بغل میں اپنا دیوان دابے ''عرض کیا ہے'' کہتے برآمد ہوتے ہیں۔

آپ کا یہ سوچنا بجا کہ اَدب سے تعلق اور اَدب کی اہم اور معروف ترین مصنف سے ایسی لاتعلقی اور بے اعتنائی؟ تو جناب! عرض ہے کہ ہمیں شاعری سے کوئی پرخاش نہیں بلکہ اُن سے گلہ ہے۔ جو بقول شخصے' اپنے ''زبردست شعر'' ہمیں زبردستی سنانے بھی لگتے ہیں۔ ہمیں تو پھر بھی شعر و شاعری سے دِلچسپی اور لگاؤ ہے لیکن ہم کئی ایسے افراد کو بھی جانتے ہیں جو شعر کے ساتھ ساتھ شاعر سے بھی پرہیز کے قائل ہیں...... ابھی پرسوں کی بات ہے کہ ہم اپنے ایک شاعر دوست کے ساتھ ایک ڈاکٹر کے کلینک میں حاضر ہوئے۔ ہمارے وہ دوست خلل دماغ کی حد تک شعر فوبیا میں مبتلا ہیں ہر بات کے شروع' درمیان اور آخر میں جب تک کسی اُستاد کے شعر پر ہاتھ صاف نہ کر لیں' اُن کی بات پوری نہیں ہوتی۔ اُن ڈاکٹر صاحب کے روبرو بھی اپنی بیماری کی شدت' اُس کی علامات اور اُس کے نتیجے میں سہی جانی والی تکلیف کا ذِکر کرتے کرتے' اپنے بیان کو پُراثر اور پُردرد بنانے کے لئے اُنہوں نے درمیان میں ایک شعر بھی پڑھ دیا۔ جس میں جگر کی تندی' تیزی کے علاوہ خونِ جگر کا بھی ذِکر تھا۔ بجائے اِس کے کہ ڈاکٹر صاحب شعر کی داد دیتے' انہوں نے اُسے بھی مرض کی علامات میں شامل کر لیا ار مرض کی تشخیص کرتے ہوئے بولے کہ ''ہیپاٹائٹس۔ بی''...... خود ہم نے اپنے ایک صحافی دوست کے روبرو یہ شعر پڑھا کہ......

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

تو ہمارے وہ صحافی دوست بغیر کچھ سمجھے بوجھے ترنت بولے۔

''لگتا ہے' شاعر کے تعلقات حکومت وقت اور پولیس دونوں سے خراب تھے؟''

ہمارے اکثر نثر نگار دوست ہمارے حامد سرائی کے لئے بمشکل مہینے بھر میں ایک آدھ تحریر ہی لکھ پاتے ہیں لیکن اللہ معافی یہ شاعر حضرات اُٹھتے' بیٹھتے' سوتے' جاگتے شاید صرف شعر ہی موزوں کرتے رہتے ہیں تاکہ ہمیں انتہائی ناموزوں وقت پر سُنا کر ہمارے صبر اور برداشت کا امتحان لے سکیں۔

ہمارے ایک شاعر دوست جو ہمیشہ ہمارے سامنے اپنی عدیم الفرصتی' غمِ روزگار اور فکر و فاقہ کا رونا روتے رہتے ہیں' وہ بھی مہینے بھر میں پچیس' تیس غزلوں سے کیا کم کہتے ہوں گے...... ایک ''دیوانی شاعر'' جو ماشاءاللہ بڑے بسیار گو ہیں اور ہمیشہ منہ سے کچھ نہ کچھ اُگلتے رہتے ہیں' جب اُن سے پانچ غزلیں' دو نظمیں' دو قصیدے' دو ہجویں اور تین ''مخنث'' سن چکے (آپ سوچیں

گے' یہ مخنث کس بلا کا نام ہے تو عرض ہے کہ بقول اُن کے' یہ اُن کی ذاتی کاوشوں کا ثمر ہے جس کا شمار نہ غزل میں کیا جاتا ہے' نہ نظم قصیدی اور مسدس وغیرہ وغیرہ میں۔ اگر ہم نے اُس کا نام مخنث رکھ دیا تو کیا بُرا کیا) تو عرض کیا ہے کہ قبلہ! لگتا ہے آپ کی فکر رَسا اور جودت طبع دو مواقع پر ہی آپ کو شعر کہنے سے روکتی ہوں گی۔ ایک تناول ماحضر کے وقت اور دوسرے جائے ضرورت کے وقت تو انہوں نے پان کی پیک سے پہلے تو سبزے کو گلرنگ کیا' پھر بائیں ہاتھ سے عینک کو ناک کے پھننگے پر جمایا' اچکن کی جیب سے رومال نکال کر باچھوں سے بہتے سرخ آمیزے کو صاف کیا اور ازاں بعد آدھ کھائے پان اور پورے کھائے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولے۔

''اجی' حضرت! تناول ماحضر کے وقت تو دماغ کا دَر بند اور منہ کا کھلا ہوتا ہے اِس لئے ہم شعر کہنے کی بجائے شیر خرما اور شیر مال پر ''شیر'' کی طرح پل پڑتے ہیں لیکن قبلہ دوسری جگہ تو سوچ و بچار کے لئے انتہائی موزوں بلکہ موزوں تر ہے۔ دماغ کے عرصے سے بند دَر بھی کھل جا سم سم کی طرح کھل جاتے ہیں بلکہ حق اور سچ بات تو یہ ہے کہ ذہنی کام کرنے کے لئے اِس سے بہتر جگہ تو کوئی ہے ہی نہیں۔ ایسے ایسے نادر روزگار مضامین صفحہ ذہن پر القاء ہوتے ہیں کہ طبیعت دنگ رہ جاتی ہے۔''

اُن کا یہ جواب سن کر تو ہم خود دنگ رہ گئے البتہ ہمیں اِس بات کا جواب ضرور مل گیا کہ اُن کے اشعار پڑھ کر یا سن کر ہمیں بے چینی اور متلی کیوں ہونے لگتی ہے۔

جس طرح شعر کہنے کا ملکہ کسی کسی کو حاصل ہوتا ہے' اُسی طرح اچھے شعر کی داد دینے کا ملکہ بھی کسی کسی کو ملتا ہے۔ افسوس! ہمیں اِن دونوں میں سے کوئی ''ملکہ'' بھی حاصل نہ ہوا۔ ہم تو اپنے ملنے ملانے والے کئی شعراء حضرات کو باتوں باتوں میں جتلا چکے ہیں کہ' بھائی! تم اچھے' تمہارا کلام اچھا' اب اتنے اچھے کلام کو پڑھ کر ہم سے اُس کی اتنی بُری داد تو نہ لو کیونکہ کوئی نکتہ فہم اور سخن داں ہی اچھے شعروں کو سن کر اُن کی اچھی داد دے سکتا ہے۔ اگر آپ اپنا کلام سنانے سے' ہمیں محفوظ رکھیں تو ہم اُس سے کہیں زیادہ اچھی داد دیں گے' جتنی آپ کا کلام آپ سے سن کر آپ کو دیتے ہیں لیکن ہماری کوئی سنے تب' نا! ہماری اِس کم فہمی کی بدولت جس کا ہمیں اعتراف ہے' کئی بار بات ناراضگی تک جا پہنچی۔ چند دِن پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب نے دورانِ گفتگو اپنی تازہ غزل سنانی شروع کر دی۔ پہلا شعر سنانے کے بعد استفسار کیا۔

''مطلع کیسا ہے؟''

ہماری جانے بلا کہ اُنہوں نے نثر کو نظم میں تبدیل کر دیا ہے' ہم نے بے دھیانی میں کہہ دیا کہ ''خبرنامے'' کی بدولت آج پورے ملک میں مطلع اَبر آلود رہنے کی توقع ہے۔ وہ اِسے اپنی بے عزتی اور اپنے کلام کی بے حرمتی سمجھے۔ ایک جھٹکے سے اُٹھتے' آنکھوں سے شعلے برساتے اور منہ سے پھنکارتے ہوئے بولے۔

''بہت ہو گئی' صاحب! آج سے آپ کا اور میرا تعلق ختم...... واللہ' میں اپنی ہتک اور بے عزتی برداشت کر سکتا ہوں' اپنے کلام کی ہرگز نہیں۔''

بڑی مشکلوں سے انہیں قائل کیا کہ یہ سب اتفاقی حادثہ اور غلط فہمی کا نتیجہ ہے ورنہ کہاں آپ کا کلام اور کہاں کوّے کی کائیں کائیں...... قسم آپ کے کلام کی' روزانہ سونے سے پہلے آپ کی شاعری کی کتاب کو بوسہ دے کر اور آنکھوں سے مس کر کے سرہانے کے نیچے رکھ کر سوتے ہیں۔ ایک دِن ایسا نہیں کیا تھا تو ساری رات آرام سے سو نہیں سکے۔ اِس سے زیادہ قدردانی اور کیا ہوگی کہ آپ کے اُس تبرک کو آج تک کھول کر نہیں پڑھا مبادا پڑھ کر سمجھ نہ سکے تو اِس متبرک کتاب کی بے حرمتی ہوگی...... پھر کہیں جا کر راضی ہوئے لیکن خود کو ہم آج تک اِس بات پر راضی نہیں کر سکے کہ واقعی اُن کا کلام کوّے کی کائیں کائیں سے افضل و اعلیٰ ہے...... ایسے ایک اور صاحب بھی ہیں جو اپنے دِل کی بھڑاس نکال چکنے کے بعد ہمیں مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ بھائی! خدا کی قسم' قلب و ذہن کے ساتھ ساتھ رُوح کی گہرائیوں میں بھی ایک عجیب طمانیت اور فرحت کا احساس جاگ اُٹھا ہے' جسم و رُوح دونوں ہلکے ہو گئے لیکن اُس وقت ہمارے قلب و ذہن میں صرف یہی احساس جاگتا ہے کہ کاش! فرحت کسی لیلیٰ ثانی کا نام ہوتا تو ہم اُس کے والی وارثوں سے شکایت لگا اور چغلی کھا کر اِن کی خوب پٹائی کرواتے۔ رہی بات جسم و رُوح کے ہلکے ہونے کی تو اِس ''ہلکے'' پن کا احساس اکثر گھر کے کسی نہ کسی فرد نے یہ کہہ کر ضرور دلوایا کہ آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ جب سے اللہ دِتہ ''کلفت'' گھر سے رُخصت ہوئے ہیں تبھی سے آپ پر ہر کسی کو کاٹ کھانے کا دورہ پڑ گیا ہے؟

چچا غالب نے ہمیشہ یہ گلہ کیا کہ اُن کی شاعری کی داد تو ملتی ہے لیکن سمجھ کر داد دینے والا کوئی نہیں' خوبیٔ قسمت' اُن کے ایک دوست نے ایک ایسی ہستی کا ذکر اُن سے کیا جو شعر کی تہہ تک پہنچ کر داد دینے میں اپنی مثال آپ تھی۔ نوشہ میاں نے اپنے خرچ پر اُس ہستی کو اپنے ہاں بلوا کر اُسے اپنا مہمان بنایا اور کافی عرصہ تک اُسے مہمان رکھا۔ دُورغ برگردن راوی' آخر میں وہ ہستی غالب کے شعر سنانے پر اُسی طرح ٹکر ٹکر اُن کا منہ دیکھنے لگتی تھی جس طرح آج کل ہم کتاب میں غالب کا شعر پڑھ کر خالی ذہن ہو کر کتاب کو دیکھتے ہیں...... ہر دُور کے شاعر نے اپنی ناقدری کا رونا رویا ہے۔ آج کل بھی جس شاعر کو ٹٹولو وہی آہ بھر کر کہے گا۔

''افسوس! اِس زمانے میں فن کا قدردان کوئی نہیں۔''

اکثر شاعر حضرات مشاعرے میں ایک دوسرے کو سامعین سے بھی بڑھ چڑھ کر داد دیتے ہیں تاکہ اپنی باری آنے پر وہ اِس داد کو دوسروں سے بمعہ سود وصول کر سکیں۔ داد شاعر حضرات کے لئے آکسیجن کا کام دیتی ہے اکثر

شاعروں کے یرقان زدہ چہروں پر داد ملنے کے بعد خون کا جوار وبھاٹا اُٹھتے ہم نے خود دیکھا ہے۔ داد پا کر یوں خوش ہوتے ہیں جیسے ہفت اِقلیم کی دولت ہاتھ لگ گئی ہو۔ شاید اِسی وجہ سے منتظمین اُن کو دوسری دولت سے محروم ہی رکھتے ہیں۔ ایسے ہی ایک شاعر مشاعرہ پڑھ کر بغیر مشاہرہ کے ہنستے مسکراتے گھر تشریف لائے اور اچکن کے بٹن کھولتے ہوئے بولے۔

''قسم سے' بیگم! آج تو ہم نے مشاعرہ لوٹ لیا۔''

بیگم نے اُن کی تمام جیبوں پر نگاہ ڈالی جو مہاتما بدھ کے پیٹ سے بھی زیادہ پچکی ہوئیں تھیں اور دانت پیستے ہوئے بولیں۔

''مشاعرہ لوٹنے کی بجائے کسی سیٹھ کو لوٹتے تو کہیں زیادہ فائدہ ہوتا۔''

اِسی دوران ہمیں ایک لطیفہ بھی یاد آ گیا ہے۔ جسے آپ ایک واقعہ بھی کہہ سکتے ہیں' لگے ہاتھوں وہ بھی سن لیجئے۔ جیل حکام نے جیل کی ایک کوٹھڑی میں دو قیدی بند کر دیئے۔ ان میں سے ایک خوش قسمتی سے چور تھا اور دوسرا بدقسمتی سے شاعر۔ ایک مہینے کی سنگت کے بعد اخلاقی مجرم نے جیل حکام سے اپیل کی کہ اُسے کسی اور کوٹھڑی میں بند کیا جائے' چاہے وہ پھانسی کی کوٹھڑی ہی کیوں نہ ہو ورنہ مَیں جیل کی قید سے رہا ہونے سے پہلے ہی زندگی کی قید سے رہا ہو جاؤں گا' وہ بھی پاگل پن کی حالت میں...... افسرانِ بالا میں سے ایک افسر نے اُس سے پوچھا۔

''آخر تمہیں اِس کوٹھڑی میں کیا تکلیف ہے؟''

وہ بولا۔ ''کوٹھڑی سے کوئی تکلیف نہیں' کوٹھڑی میں بند دوسرے قیدی سے شکایت ہے جو ہر روز بیس پچیس غزلیں مجھے زبردستی سناتا ہے حالانکہ کئی بار مَیں نے ہاتھ جوڑے' پاؤں پڑا حتیٰ کہ گالی گلوچ تک بھی نوبت پہنچائی۔ یہ بھی عرض کی کہ اخلاقی طور پر یہ بات جائز نہیں کہ دوسرے کو ناجائز تنگ کیا جائے لیکن وہ ہے کہ مجھے اپنا باسی اور تازہ کلام سنانے سے باز نہیں آتا۔''

افسر نے کہا۔ ''اگر ہم تمہاری درخواست نہ مانیں تو؟''

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''تو پھر' حضور! خدا کے لئے شاعر کی زبان بند اور دیوان تالہ بند کرنے کا حکم دیا جائے۔''

خیر' جیل حکام نے ایسا ہی حکم جاری کر دیا۔ دو مہینے بعد شاعر کے عزیز و اقارب جیل حکام سے اُس کی لاش وصول کر رہے تھے۔ بیچارا شاعر اپنے آپ میں ہی گھل گھل کر مر گیا۔

جس طرح بات سے بات نکلتی ہے' اِسی طرح ہمیں اِس واقعہ سے ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ چونکہ پچھلا واقعہ آپ نے لگے ہاتھوں سے سنا تھا اِس لئے یہ واقعہ اب آپ بندھے ہاتھوں سنیئے۔ ایک شاعر سے دو چار غزلیں قسمت سے ایسی موزوں ہو گئیں کہ خود اِنہیں بھی اپنا بقیہ کلام دوسروں کے ساتھ ساتھ ناموزوں لگنے لگا۔ اب اُنھوں نے ہر مشاعرے میں وہی غزلیں ترنم کے ساتھ لہک لہک کر پڑھنی شروع کر دیں البتہ پڑھنے سے پہلے سامعین سے معذرت آمیز لہجے میں یہ وضاحت ضرور کرتے کہ محترم حاضرین! میری تازہ غزلوں کا پرچہ اتفاق سے گم ہو گیا ہے اِس لئے آپ کی نذر اپنی چند پرانی غزلیں پیش کرتا ہوں۔ ایک مشاعرے میں ابھی انہوں نے پریشانی کے عالم میں صرف یہی کہا تھا کہ حضرات! کہ ایک دِل جلا اُٹھ کر بولا۔

چوکے

خدشہ

اِس کے جب ٹوپیں انگلش سوٹ کی تعریف کی
کیا بلیک اِس کا کلر' فیشن بھی ہے کس ڈھنگ کا
بولا وہ' خاطر تواضع ہی نہ کر ڈالے پُلس
کوٹ میرا بھی وکیلوں سا ہے کالے رنگ کا

بندوبست

جو بھی کہنا ہے' وہ اپنے خون سے لکھ بھیجنا
مجھ کو روکا ہے زبانی حالِ دِل سے یار نے
خون کی یوں تو کمی ہو جائے گی' یہ سوچ کر
جاتا ہوں بندوق سے پھر آج کوّے مارنے

لاچاری

ایک مَیں ہوں آپ کی ایکٹنگ کا دِل سے معترف
ہر جگہ تعریف کرتا ہوں بلاخوف و خطر
ایک بیگم ہے' جب اِس سے حالِ مجبوری کہو
جھٹ سے کہتی ہے کہ لاتنخواہ' اداکاری نہ کر

دیدہ ور

بچے سے جب کہا کہ خوف و ہراس چھوڑو
ایسا نہیں یہ ڈوگی جو تم کو کاٹ کھائے
وہ بولا' کس سرے پر اِس کے یقین کر لوں
آگے سے گھورتا ہے' پیچھے سے دُم ہلائے

حادثہ

جب وہ کھانے کی ٹیبل کو جانے لگی
ہر نظر اِس کے پیچھے تڑپ کر گئی
اِس کو تکنے میں بھوکا ہی میں رہ گیا
اور وہ چار مرغے ہڑپ کر گئی

✿ جواد حسن جواد' اسلام آباد

''حضور! ہمیں علم ہے کہ آپ کی تازہ غزلوں والا پرچہ کہیں گم ہو گیا ہے' پڑھیے پڑھیے' حضور! پرانا کلام ہی پڑھ دیں۔ ہمیں آپ سے کوئی شکایت نہیں البتہ منتظمین سے ضرور گلہ ہے۔''

موصوف روہانسے ہو کر فریاد کناں ہوئے۔ ''نہیں' صاحب! آج تو عجب واقعہ ہوا' تازہ کے ساتھ پرانی غزلوں والا پرچہ بھی کہیں گم ہو گیا ہے۔''

سارے مجمع میں خوشی کی لہر دوڑ گئی' ایک سامع نے ہوٹ کیا۔ ''خس کم جہاں پاک''

دوسرے نے اُن کی طرف اُنگلی اُٹھائی اور پکارا۔

''ابھی کہاں......؟''

جس طرح ہر خرابی کی ذمہ دار پچھلی حکومت ہوتی ہے' اِس طرح شعرو

شغل + مغل

''اگر تم مل جاؤ پرانا چھوڑ دیں گے ہم'' --- آج کل کی لڑکیاں --- عرفان شہزاد

☆ پرانے بے چارے کا بینک بیلنس جو صفر ہو جاتا ہے۔

شادی سے پہلے ''جان'' اور شادی کے بعد ''جان چھوڑو'' --- واہ رے' مرد وا! --- نازیہ ناز نازی

☆ شادی کے بعد بیوی جو وبال جان بن جاتی ہے۔

سب سے بڑی حماقت کسی لڑکی سے محبت کرنا --- سعید بدر

☆ اور اِس سے بھی بڑی حماقت' پھر اسی لڑکی سے شادی بھی کر لینا ہے۔

شادی کر کے بندہ جیب سے تو خالی ہوتا ہی ہے' ساتھ ساتھ دماغ سے بھی خالی ہو جاتا --- عرفان شہزاد

☆ اِن دونوں کے خالی ہونے پر آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟

میں بیگم سے نہیں ڈرتا --- یہ کہنے کا حکم بھی اُسے بیگم نے ہی دیا تھا --- سعید بدر

☆ کس کی بیگم نے یہ حکم دیا تھا' وضاحت تو فرمائیے؟

ہم ہر کام شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھتے ہیں' لڑکیاں ہر کام شروع کرنے سے پہلے میک اپ کرتی ہیں --- تارزن

☆ کیا لڑکی کو چھیڑنے سے پہلے بھی بسم اللہ پڑھتے ہو؟

مہینے میں ایک دو بار بیوی کی مرمت اس کی دماغ اور اپنی صحت کے لئے ضروری ہے --- بابا شوقی

☆ مگر آج زمانہ اتنی بہادری دکھائے کون؟

بیوی کی مرمت کرنے والے مجاہد اب خال خال ہی ہیں --- طوطی نقار خانہ

☆ بھڑوں کے چھتے میں بھلا کون ہاتھ ڈالے؟

بھوکے کی نگاہ کھانے پر' بلی کی نگاہ چھچھڑوں پر اور بیوی کی نظر شوہر کی جیب پر ہوتی ہے --- تارزن

☆ اور شوہر کی نگاہ پڑوسن پر ---!

ٹرپل این کو سانپ نے ڈس لیا' ٹھیک 30 سیکنڈ بعد سانپ مر گیا --- تارزن

☆ جھوٹ مت بولو۔ مر کر پھر آپ کیسے بول رہے ہو؟

بیویاں کم از کم دو ہونی چاہئیں' یوں وہ اوقات میں رہتی ہیں --- خادم حسین

☆ پھر شوہر کو بھی تو اوقات یاد دلا دیتی ہیں' نا!

بیوی خواہ کتنی ہی اچھی ہو' تعریف کرتے ہوئے شوہر کے ''ہیڈ'' میں کچرا آ جاتا ہے --- عفیفہ شاہد

☆ بیوی اور اچھی؟ توبہ ہے بھئی آپ بڑے مذاق کرتی ہیں --- ہاہاہا!

مرد فریج کے اوپر بھی کھڑا ہو گا' پھر بھی بیوی کو صدا لگائے گا کہ ذرا پانی دینا --- عفیفہ شاہد

☆ کیونکہ فریج کے اوپر کھڑا ہو کر پانی والے ''خانے'' تک ہاتھ جو نہیں پہنچتا۔

بیوی سے بہتر ہے کہ بندہ بھینس پال لے' کم از کم اِس کے سامنے بین تو بجائی جا سکتی ہے --- شاہد اسلم

☆ بھینس پالنے کی کیا ضرورت ہے' شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی بیوی ہی کھا کھا کر بھینس بن جاتی ہے۔

شوہر کا مطلب کیا --- پلا پلایا نوکر --- سید بدر سعید

☆ وہ بھی بغیر تنخواہ کے۔

میں تین جھوٹ فی منٹ کی رفتار سے باتیں کر سکتی ہوں --- تارزن

☆ بے چاری اٹک اٹک کر بولتی ہوگی۔ یہاں ہر لڑکی ایک منٹ میں سینکڑوں جھوٹ کی رفتار سے باتیں کرتی ہیں۔

میں بیوی سے بالکل نہیں ڈرتا کیونکہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی --- تارزن

☆ یہ ساری اکڑ خانیاں شادی ہوتے غائب ہو جائیں گی۔

جو عاشق مجھے مطلوبہ گفٹ نہ دے' اُسے بھائیوں کی لسٹ میں شامل کر لیتی ہوں --- ایک لڑکی --- تارزن

☆ اِس لسٹ میں آپ کا نام کتنے نمبر پر ہے؟

اِس کی محبت بجلی کا بلب ہے۔ جب چاہتی ہے آن کر لیتی ہے اور جب چاہتی ہے آف کر دیتی ہے --- سیّد بدر سعید

☆ بار بار آن آف کرنے سے بلب کہیں فیوز ہی نہ ہو جائے۔

ہمیشہ سچ بولو --- مگر جان کی سلامتی چاہتے ہو تو اِس کے بعد فوراً رُخصت ہو جاؤ --- پرنس کشمیری

☆ ورنہ چار بندے اُٹھا کر اگلے جہان رُخصت کر آئیں گے۔

وزیر اطلاعات ایسا ہونا چاہئے؟ جو دُنیا میں سب سے زیادہ جھوٹ بول سکتا ہو --- شاہد اطہر

☆ پھر تو خواتین کو وزیر اطلاعات بنانا چاہئے۔

دل سے عورت پہ فدا اور اسی کے خلاف بولنا' مرد کی منافقت کا منہ بولتا ثبوت --- نازیہ ناز نازی

☆ اسی کو ''خوش فہمی'' کہتے ہیں' محترمہ!

بیوی اور ٹی وی میں فرق یہ بھی ہے کہ TV میں تفریح کے پروگرام بھی دکھائے جاتے ہیں --- پرنس کشمیری

☆ ایک اور فرق بھی ہے۔ ٹی وی کی آپ جب چاہیں' زبان بند کر سکتے ہیں۔

فٹ بال کا کھیل اس لئے ایجاد کیا گیا کہ مرد لاتیں مارنے کا شوق پورا کر لیں --- فرحین بیگ

☆ جبکہ عورت نے مرد کو ہی فٹ بال سمجھ رکھا ہے۔

محمد صابر مغل عبدو پوری

شاعری کی ذمہ داری بھی ہمارے اور آپ کے پچھلوں اور پھر اُن کے پچھلوں کے پچھلوں پر عائد ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس! ہمارے بزرگ بجائے معشوق کی دیوار کے سائے تلے بیٹھ کر سوچ بچار کرتے کہ کسی سیب کے درخت کے تلے بیٹھتے تو کششِ ثقل کی دریافت کا سہرا نیوٹن کی بجائے اُستاد مونا دیوانہ دہلوی کے سر بندھتا لیکن، جناب! ایسا ہوتا کیونکر؟ ہمارے بزرگ وضع دار بزرگ تھے، ساری زندگی ایک ہی سہرا باندھنے پر اکتفا کیا۔ اُدھر اہلِ فرنگ جسمِ اِنسانی کا اندرونی نظام دریافت کر رہے تھے اور اِدھر ہمارے بزرگ ابھی اِنسانی جسم کی بیرونی ساخت پر ہی تحقیق اور غور و فکر کر رہے تھے۔

اِنسان جوانی میں جتنا چاہے رنگین مزاج ہو۔ بڑھاپے تک آتے آتے بدمزاج ہو تو ہو رنگین مزاج ہرگز نہیں رہتا لیکن یہ شعراء کرام ساری دُنیا سے نرالے ہوتے ہیں منہ میں دانت نہیں، پیٹ میں آنت نہیں لیکن غزلوں میں اپنے عشق کی گرمی اور محبوبہ کے جسم کی نرمی کا بیان اِس طرح کرتے ہیں کہ اُن کی محبوبہ پر ترس آنے لگتا ہے اور دِل خواہ مخواہ چاہنے لگتا ہے کہ محبوبہ کی طرف سے ہم خود ہی ''قتلِ عاشق'' کر کے بیچاری کی زندگی کو برباد ہونے سے بچالیں...... دَرسی کتابوں یا عام کتابوں میں چھپی شعراء کی تصویریں دیکھیں تو پہلی چیز جس پر نگاہ پڑے گی وہ مرزا، میر اور آغا صاحب کی سفید ریش مبارک ہوگی۔ اگر ایسا ہی کوئی بزرگ کوئی ''ایسی'' ہی بات شعر کی بجائے نثر میں کر دے تو محبوبہ کے ساتھ ساتھ اُس کے گھر والے اور اہلِ محلہ کچھ ایسا سلوک کریں کہ بزرگوار کا سارا جسم فگار اور دامن تار تار ہو جائے اور دو مہینے تک کسی کو شرم کے مارے منہ دِکھانے کے قابل نہ رہے اور جب نکلے تو بچہ لوگ تالی بجاتے ''بابا میٹر، ہائے ہائے'' کے نعرے لگاتے پیچھے پیچھے ہولیں۔ بعض شعراء کو دیکھ کر بندہ فوراً اِس راز کو پا جاتا ہے کہ آخر محبوبہ نے اِن کی بجائے اِن کے رقیب کو منہ لگانا کیوں پسند کیا کیونکہ حور اور لنگور میں قافیے کے علاوہ اور کوئی وجہِ مناسبت بھی تو نہیں ہے...... ہمارے ایک واقف کار شاعر کی شاعری سے متاثر ہو کر اُن کی محبوبہ نے غلطی سے انہیں ''منہ'' لگالیا تھا۔ موصوفہ سنا ہے کہ ابھی تک ''پائیوریا'' کے مرض سے شفایاب نہیں ہوسکیں۔ حکیم، ڈاکٹر سب آزما لئے لیکن بیماری ہے کہ گل محمد کی طرح مسوڑوں میں قدم جمائے کھڑی ہے۔ ویسے یہ بیماری ہے بھی کچھ ایسی نامراد کہ بیماری کی طرح اِنسان کو چمٹ جاتی ہے، شاید کسی شاعر نے اِسی کی طرف اشارہ کر کے یہ شعر کہا تھا کہ ''چھٹتی نہیں ہے یہ کافر منہ سے لگی ہوئی''...... ہمیں معلوم ہے کہ یہ بند ٹیپ کا بند ثابت ہوگا جسے پڑھنے کے بعد ہر کوئی (جو خود کو شاعر اور ہمارا دوست سمجھتا ہے) ہمارے پاس بھاگا بھاگا آئے گا اور شکایت بھرے لہجے میں کہے گا کہ ''بُروٹس! تم بھی۔''

ہمارے پُرانے شاعروں میں ایک خوبی مشترک ہے کہ جس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ وہ سب کب کے اپنے ''پران'' دے چکے ہیں اور ہمارے عہد کے شاعروں میں یہ خامی ہے کہ ابھی تک ہمارے سینوں پر مونگ دِل رہے ہیں البتہ زندہ، مردہ دونوں میں چند خوبیاں اور خامیاں مشترک بھی ہیں۔ مثلاً ہر شاعر محبوبہ کے چہرے پر موجود تل پر صدقے واری ہو کر بلخ و بخارا سے ہاتھ دھو ڈالتا ہے، دوسرے پر اصفہان و خراسانی دست بردار ہو جاتا ہے، تیسرے چھوتے اور پانچویں تل اگر خوشنمائی کی سرحد سے نکال کر بدنمائی کی حدود میں داخل نہ ہو جائے تو افغانستان، پاکستان اور ہندوستان بھی کب کے کوڑیوں کے مول بک چکے ہوتے۔ اِن کے شعری دیوان اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اِن دیوانوں میں موجود ہر دوسرا شعر صنم پرستی کے متعلق ہوگا اور صنم کی پوجا اِس ذوق وشوق سے کرتے ہیں کہ ایمان والے ہو کر بے ایمان لگنے لگتے ہیں۔ محبوب کی چوکھٹ پر پڑے پڑے مشتِ استخوان کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور بیچاروں کی معشوق کے ہجر و فراق میں ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ ''پھونک مارو تو چراغ بجھ جائے''، اِن میں سے کچھ محبوب کے قدموں کی خاک بن جاتے ہیں البتہ یہ خاک کچھ ایسی ڈھیٹ ہوتی ہے کہ محبوبہ چاہے لاکھ اپنے جوتے جھاڑے، یہ اُس میں سے نہیں نکلتی۔ اِن میں سے کچھ جان بوجھ کر ''مچلے'' بن کر (بمعنی ڈرامہ بازی) لمبے لمبے لیٹ جاتے ہیں اور نامہ بر کو محبوب کی طرف دوڑاتے ہیں کہ ''جائیو، چھبن میاں! کہیو کہ مریضِ عشق ہاتھوں سے نکلا کہ نکلا......'' اور خود کفن نما چادر میں لپٹے دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگتے ہیں۔ اگر نامہ بر بجائے محبوب کو ساتھ لانے کے بجائے اُس کا خط لے آئے تو یہ کہہ کر نئی غزل کہنے لگتے ہیں کہ، ہم تو ''لفافہ دیکھ کر نفسِ مضمون بھانپ لیتے ہیں'' اور اگر نامہ بر چالاک و ہوشیار ہو اور وہ معصوم اور سیدھے سادھے محبوب کو اُلٹی راہ پر لگا لائے تو یہ فوراً بسترِ مرگ چھوڑ

پیپر ویٹ

بیٹھ جاتا ہے جو فائل پر، وہ پیپر ویٹ ہے
دِل، دماغ اُس کا نہیں ہے، وہ سراپا پیٹ ہے
یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ آنے میں دفتر لیٹ ہے
یہ بھی سنتے ہیں کہ اِس کے بیٹھنے کا ریٹ ہے
اس سے کوئی بات کہتے ہیں تو وہ سنتا نہیں
شعر یا نغمے کو سن کر بھی وہ سر دُھنتا نہیں
یہ تکلف ہو تو پھر کیا لطف یارانے میں ہے
آنکھ ہے عینک کے پیچھے، ہاتھ دستانے میں ہے
خط بھی دِلکش تھا پر اُن کی خوش کلامی، کیا کہیں
جو مزا ڈالی سے میوہ توڑ کر کھانے میں ہے

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی، کراچی 37

کر اُس کے استقبال کو دوڑتے ہیں اور اگر محبوب اِن کے دغا و فریب مکاری و دجل پر اِن کو بُرا بھلا کہے تو فوراً معصوم بن کر کہتے ہیں......

''اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے''

جب کسی سے کام نکلوانا ہو تو اُس کا قصیدہ کہتے ہیں اور اُس کی ایسی ایسی خوبیوں کا راز طشت از بام کرتے ہیں کہ جس کے متعلق اُس شخص کو خود بھی علم نہیں ہوتا۔ جس کے متعلق قصد سے قصیدہ کہا گیا ہوتا ہے اور اگر بیچارا زیرِ عتاب آ جائے تو اُس کی ایسی ہجو کہتے ہیں کہ بیچارا بعد از مرگ فرشتوں تک سے آنکھیں ملانے کے قابل نہیں رہتا......ضروری نہیں یہ قصیدے اور ہجویں اشخاص کے متعلق ہی ہوں بلکہ اُردو شاعری میں قصیدہ دَر دال ار ہر' قصیدہ دَر بینگن' قصیدہ دَر ککڑی اور قصیدہ دَر ہاتھی مہابت خاں اور ہجو دَر مچھر' کھٹمل' بچھو وغیرہ وغیرہ بھی ملتے ہیں' البتہ ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ قصیدہ پیٹ خالی ہونے پر' کہا جاتا تھا اور ہجو بھرے ہونے پر البتہ کبھی کبھار دوست احباب کی حمایت میں یا فرمائش پر یا پھر تفننِ طبع کے طور پر کسی کی ہجو کی جاتی تھی...... ہمارے ایک کلاسیک شاعر جنہیں اِنہی دو خوبیوں کی وجہ سے زیادہ تر شہرت نصیب ہوئی ہے' انہوں نے ایک ولائتی پٹھان کی ہجو کہی اور طرفہ تماشا یہ کہ اُسی محفل میں پڑھ بھی دی جس میں وہ خدائی خوار بھی ایک کونے میں بیٹھا نسوار کی جگالی کر رہا تھا۔ اب یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ شاعر موصوف اُس کی محفل میں موجودگی سے آگاہ تھے یا نہیں۔ اُس اللہ کے بندے نے نہایت درجہ اطمینان سے سخن دلگیر سُنا اور اِس کے بعد اُس سے بھی زیادہ اطمینان سے اُس نے شاعر نامدار کو گریبان سے پکڑ کر خوب جھٹکا' پٹکا' جھٹکا اور ایک دو کرارے ہاتھ جمائے اور آخر میں نہایت ذلیل ثقیل گالیوں سے بھی نوازا۔ شاعر صاحب کے سر کا ''سودا'' جب اچھی طرح نکل گیا تب جا کر دوسروں کے کہنے پر اپنی جنگلی کاروائی کو اختتام پذیر کیا۔ اُدھر جب شاعر کے اُوسان ذرا بحال ہوئے تو شکایت بھرے لہجے میں اُس پٹھان سے شکایت کی۔

''اجی' قبلہ! اِس میں غصہ کی کیا بات تھی؟ مَیں نے تو صرف نظم کہی تھی۔''

پٹھان نے نسوار کی پُرانی گولی کو نچلے ہونٹ کی قید سے رہائی دلوائی اور نئی گولی بناتے ہوئے بولا۔

'اچا' تو یہ تمہاری نظم تھا......خوچہ! جو تم نے کہا تھا' وہ تمہارا نظم تھا تو جو ہم نے تمہارے ساتھ کیا' وہ ہمارا نثر تھا۔ حساب برابر ہوئی۔''

ہمارے ایک انتہائی قریبی دوست جو خود کو ''غالب ثانی'' کہتے ہیں (اور سچ کہتے ہیں کیونکہ غالب کی طرح اُن کے اشعار کی بھی ہمیں آج تک سمجھ نہیں آئی) اُن کی عادت ہے کہ جب اُن پر شعر کی آمد آمد ہوتی ہے تو اِن کو کسی کل چین نہیں پڑتا۔ کہیں ٹک کر بیٹھنا اِن کے لئے محال ہو جاتا ہے' سارے مکان میں درآمد برآمد ہوتے رہتے ہیں۔ اِن کا حال بعینہٖ اُس شاعر جیسا ہے جس نے اپنے دوسرے شاعر دوست سے اپنے شعر کہنے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ کیا بتاؤں' صاحب! جب شعر کی آمد ہوتی ہے تو ہمارے ساتھ کیا بیتتی ہے' کسی پہلو چین نہیں پڑتا۔ کبھی اُٹھتے' کبھی بیٹھتے' کبھی بائیں کروٹ' کبھی دائیں کروٹ' جی بیٹھتا ہے۔ دِل گھبراتا ہے' جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا ہے۔ دوسرا بولا۔

''تو یوں کہئے نا! کہ آپ شعر کہتے نہیں ''جنتے'' ہیں۔''

یہی کیفیت اِن کی ہوتی ہے۔ ایک دِن ہم اُن کے یہاں پہنچے تو وہ ہر سو بولائے بولائے ہوئے پھر رہے تھے۔ ہم سوال گندم کرتے' وہ جواب چنا دیتے۔ ہم نے مسکرا کر انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''پروانہ جی! لگتا ہے کہ ذہن کند فہم میں کوئی شعر آ رہا ہے یا پھر دوسرا مصرعہ موزوں نہیں ہو رہا؟''

ٹھنڈی سانس بھر کر روہانسے ہو کر بولے۔ ''ارے' صاحب! معاملہ انتہائی تشویش ناک اور اِس کے بالکل برعکس ہے۔ پریشانی کی اصل وجہ تو یہ ہے کہ کئی دِنوں سے شعر تو کیا' شعر کا پہلا حرف تک دماغ کی تختی پر نمودار نہیں ہوا' شعر کی موزونیت تو بعد کی بات ہے۔''

ہم نے مسکرا کر اُن کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''پروانہ جی' ہماری طرف سے بھابی جی کو مبارکباد دے دیجئے گا۔''

بولے۔ ''وہ کاہے کی؟''

ہم نے کہا۔ ''وہ اِس بات کی کہ آپ کی ''جملہ علامات'' بیان کر کے پچھلے ہفتے مینٹل ہسپتال سے جو دوائی وہ لائیں تھیں' اُس نے اپنا اثر دِکھانا شروع کر دیا ہے۔''

اب کتنا لکھیں اور کتنا سنائیں؟ ویسے پچھلے تین چار دِنوں میں جب سے یہ مضمون شروع کیا ہے' تین چار معرکے کی غزلیں ہم سے بھی موزوں ہو گئی ہیں۔ دِل چاہتا ہے کہ لگے ہاتھوں آخر میں اُن نادر الوجود غزلوں سے بھی آپ کو مستفید کریں۔ لیجئے' دِل و جگر تھام کر سنئے......لاحول ولاقوۃ' یہ ہم لکھتے لکھتے کیا لکھنے لگے ہیں۔ اِس مضمون نے تو ہماری کھوپڑی اور ذہنی پٹڑی دونوں بدل دیں ہیں' واقعی شاعری میں بڑی طاقت ہے ایسے ہی دہلی و لکھنؤ کے پنواڑی اور حجام تک اساتذہ کے پان لگاتے اور حجامتیں بناتے بناتے ہی شاعری نہیں کرنے لگے تھے۔ ویسے کم از کم اپنی حد تک ہم بالکل بے فکر ہیں کیونکہ ہمیں جب بھی یقین ہو گا کہ ہم پر ''پوئٹری وائرس'' نے شدت سے حملہ کر دیا تو ہم بھابی سے مینٹل ہسپتال کے ڈاکٹر سے لکھوایا ہوا نسخہ لا کر اُس میں تجویز کی ہوئی ''اینٹی شاعری'' ادویات کی چند خوراکیں پھانک کر اِس بیماری سے نجات حاصل کر لیں گے۔

☆☆

☆ شبیہہ منظہر رانجھا

لالہ بندو

جوانی تو لالہ بندو پر ڈِنبی سٹی کی طرح حملہ آور ہوئی تھی۔ نین کجرارے اور ہونٹ انگارے ہو گئے تھے کیونکہ جوانی تھی کہ چڑھتی چلی آ رہی تھی۔ لیکن ایک بات میں جو پہلے وہ تھا' وہ اب بھی ویسا ہی تھا یعنی عقل کا خانہ خالی ہی تھا۔ اِس پورشن کے بارے میں سب کا خیال تھا کہ یہ خالی ہی رہے گا۔ جس کے جواب میں وہ اکثر من کھول کر ہنستا اور کہتا۔

"کیوں اِس پورشن میں جالے لگے ہوئے ہیں---"

پھر جلد ہی اِس نے سب کے اندازے اور قیاس آرائیوں کو گنجے سر سے وگ کی طرح اُتار پھینکا' جن کا کہ بعد میں ذکر کیا جائے گا۔

وہ بچپن سے لڑاکا اور بے فکر "اِنسان" تھا۔ اگر آپ اِسے سلطان راہی سمجھیں تو یہ آپ کی اپنی "عقل مندی" ہوگی ورنہ وہ تو شان جیسی شان رکھتا تھا--- تعلیمی لحاظ سے وہ تھوڑا سا خواندہ ہے' اِس خوبی کے آثار اِس کی شخصیت سے متعلق ایک واقعہ ہے ملتے ہیں' ملاحظہ کیجئے۔ ایک دفعہ کا ذِکر ہے کہ لالہ بندو سکول پڑھنے کے لئے گیا (جی ہاں' تاریخ میں تو ایک بار ہی جانے کے بارے میں لکھا ہے اور یہ غالباً نو دو گیارہ 9211 قبل مسیح کی داستان ہے) ماسٹر فیروز نے لالہ بندو کے سامنے ایک بچے کی پٹائی کر دی۔ یہ منظرِ دلدوز دیکھ کر لالہ جی کو غصہ سینے میں ٹھاہ کر کے لگا۔ تہبند کے لڑ اُٹھا کر کس کر باندھ لئے اور ماسٹر فیروز بہشتی کا مار مار کر سارے کا سارا ابھر کس نکال دیا۔ ٹیبل سے حاضری رجسٹر اُٹھا کر پھاڑ دیئے اور اِس کے ٹکڑے ماسٹر فیروز کے نیم بسمل لاشے پر یوں پھینکے جیسے کوئی شوخا عاشق طوائف پر نوٹ وارتا ہے--- پھر اُس بچے کو تھام کر اُس کے گھر چھوڑ آیا' صرف اِس لئے کہ وہ ننھا منا بچہ لالہ بندو جیسے کڑیل جوان کا کلاس فیلو تھا۔ بس جی پھر تو ساری زندگی گورنمنٹ سکول والوں نے اِسے سرخ اینٹوں والی بلڈنگ پار کرنے ہی نہیں دی اور کانوں کے سننے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ سکول' کالجوں میں طالبعلموں کے ہاتھوں سے اساتذہ کی پٹائی تب سے شروع ہوئی ہے جب سے لالہ بندو نے ماسٹر فیروز جیسے قوم کے ہیرو کے خلاف لالہ سدھیر کا کریکٹر کیا ہے۔

گلیوں میں پھرتے اور ابا کو نشہ میں لت پت دیکھتے ہوئے لالہ بندو بھی تھوڑا سا جوان ہو گیا۔ ابھی اُس نے تھوڑا سر نکالا ہی تھا کہ سوہنی مٹیار کی طرح اُس پر ہر طرف سے لڑکیوں نے ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ پر وہ بھی کوئی آسان رضائی نہ تھا کہ ڈورے ڈلوا لیتا' بالکل سنبل کی روئی پہ گیا تھا--- سکول تو لالے بندو کی قسمت میں نہ تھا اِس لئے ابا نے اُسے آرا مشین پر ڈال دیا۔ ایک بار وہ علی الصبح سردی کے موسم میں ٹھٹھرتا ہوا آڑے کی جانب دوڑ رہا تھا کہ پیچھے سے بانو درزن نے آواز دی۔ لالہ بندو پہلے تو ڈر گیا کیونکہ اِس نے سُنا ہوا تھا کہ اندھیرے میں پیچھے سے کوئی آواز دی تو ہمیشہ وہ چڑیل ہی ہتی ہے۔ ماں کے الفاظ ذہن میں گونجے تو وہ سپیڈ سے بھاگنے لگا۔ بانو درزن نے یہ حال دیکھا تو پھر آواز دی۔

"وے' بندو! کبھی ہمیں بھی لفٹ کرا دیا کر---تو نے تو جوان ہو کر ہماری گلی میں آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں تجھے ابھی بھی بڑا یاد کرتی ہوں۔ چھوٹے ہوتے تیری ناک بڑی بہتی تھی' کہیں ابھی بھی ایسا تو نہیں۔"

لالہ بندو کے کان اِس کی آواز پہ ہی لگے ہوئے تھے۔ اُس نے بانو کی بات کے جواب میں آہستہ آہستہ گردن موڑ کر دیکھا تو آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اِس کے ساتھ ہی بالکل ایسی ہنسی کی آواز آئی جیسے چڑیلیں ہنستی ہیں۔ بندو نے آنکھوں کو کھولا اور اُنگلیوں کے جھرکوں سے بانو کی جانب دیکھا۔ دو پیار بھری آنکھوں سے اُسے تک رہی تھی۔ بندو کو بڑی شرم آئی۔ اِس واقعہ نے لالہ بندو کو تمام دِن آرا مشین پر بھی پریشان رکھا۔ بار بار اُس کے کانوں میں بانو کی آواز گونجتی۔

آخر رات 10 بجے آرے سے چھٹی ہوئی تو وہ بھاگم بھاگ گھر کی طرف آیا لیکن جب رستے میں بانو کا گھر آیا تو وہ وہیں رُک گیا۔ اُس نے کچھ دیر سوچا پھر دروازے پر ہاتھ دے مارا۔ تھوڑی دیر بعد بانو کا ابا اندر سے بر آمد ہوا۔ لالہ بندو تھوڑا سا بدکا اور پھر اندھا دھند شروع ہو گیا۔

"اوئے' چاچا! تیری دھی اب جوان ہو گئی ہے اور تم اِس کا دھیان

نہیں رکھتا۔ یہ مجھے گندے گندے مذاق کرتی ہے۔ میں اِدھر سے گزروں تو مجھے چھیڑتی رہتی ہے۔ مَیں کہتا ہوں اِسے پٹہ ڈال' نہیں تو مَیں اِس کا بالا نکال دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹا اور گھر جا کر چین کی نیند سو گیا لیکن دوسری جانب بانو بیچاری پر بیٹھے بٹھائے عذاب اُتر آیا۔ ابا نے اِسی وقت اِس کو بستر سے نکال کر فرش پر پٹخا اور ٹھڈوں کے اولے برسانے شروع کر دیئے۔ صبح تک بیچاری مکمل طور پر چلتا پھرتا ہسپتال بن چکی تھی--- وہ بندو کے حوالے سے نشانِ عبرت تھی اور دوسرے نوجوان یہ حال دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کر کے پیچھے ہٹ چکے تھے--- بندو کی اب پورے محلے میں بڑی "واہ واہ" تھی۔ پورے محلے میں اِس کا سکہ بیٹھ گیا تو باپ نے چرس کا سوٹا لگوا کر اِسے "فور پنکھو" کا لقب عنایت کر دیا۔ ہر آتا جاتا نشئی اِس کے پاؤں چھوتا اور اِس کے دِلکش سوٹوں کو "سلام پیار" کہتا۔

گھر کے قریب نہر بہتی تھی اور اِس نہر کے کنارے ایک نلکا بھی لگا ہوا تھا۔ گرمی کے دِن تھے' لالے بندو نے رَج کے نیند لی تو صبح آرے سے لیٹ ہو گیا۔ بھاگم دوڑم جانے کی تیاری کی اور آرے کی جانب چل پڑا۔ اچانک وہ ایک منظر دیکھ کر رُک گیا کیونکہ ایک پوستی کی رہتی سہتی قومی غیرت جاگ اُٹھی تھی۔ نہر والے نلکے پر ایک اجنبی نہار رہا تھا اور قریب ہی مٹیاریں سانجھ سویرے برتن' کپڑے دھو رہی تھیں۔ لالے نے آرا مشین بھلا کر اِس اجنبی کی طرف قدم بڑھائے۔ مٹیاریں یہ منظر دیکھ کر سہم گئیں اور سائیڈ پہ لگ کے ہرنی جیسی آنکھوں سے پیش آنے والے حالات کی منتظر ہو گئیں۔ لالے بندو نے فلم کے سائیڈ ہیرو (وِلن) کی طرح جا کر بڑھک لگائی اور اِس غسل کرتے ہوئے "ہیرو" کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ کھرے کے گیلے گیلے فرش پہ لینڈ سلائیڈنگ کرتا ہوا وہ کسی زخمی بکرے کی مانند بھیگنے لگا۔ لالے نے فلائنگ کک کا ناکام تجربہ کرنے کے بعد اِسے دھوبی پٹکا مارا اور سینے پر کباڑ خانے سے حاصل کیئے ہوئے ملتانی کھسے والا پیر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں بھئی' اِدھر نلکے پر نہانے کی کیا تک ہے؟ میری گلی محلے میں آج تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اس طرح کی بے حیائی کر جائے اور توں کہاں سے یہ 'عید' منانے چلا ہے--- پینٹ پہن کے نہا' شلوار پہن کے نہا لیکن یاد رکھ' آئندہ کے لئے کپڑا باندھ کر نہانا بھول جا۔ شاید تجھے پتہ نہیں کہ یہ نہر ہر سال ایک بندہ لیتی ہے۔ یہ نہ ہو کہ اِس بار تیری باری ہو۔ اُٹھا کے پھینک دوں گا اِس میں۔"

یہ کہہ کر لالے بندو نے اِس کی معافی کا انتظار کیئے بغیر ٹھڈا مارا اور وہ "شریف شہری" لڑھکنیاں کھاتا ہوا نہر کے بیچ جا گرا۔ لالے نے پیر جھاڑنے کی بجائے ہاتھ جھاڑے اور اکڑے ہوئے سانڈ کی طرح چلتا ہوا آرے کی طرف بڑھنے لگا۔

دِن پر دِن گزرتے جا رہے تھے اور لالے کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

جی نہیں' قطعاً آپ غلطی پر ہیں۔ لالہ جی کو کسی سے عشق نہیں ہوا تھا بلکہ اُس کا واحد سر درد' اُس کے بچپن کا ساتھی' اُس کی تنہائیوں کی رونق' اُس کا مونس و غمگسار' اُس کا سکھ چین' اُس کا ہم نوالہ و ہم پیالہ' اُس کے سوٹے بازی کا من پسند راز دار' اُس کا "پاپا" المعروف "لاہوریا پاں پاں" بذاتِ خود بسترِ مرگ پر موجود تھا اور اُس کے بچنے کی کوئی صورت شکل نظر نہیں آتی تھی--- ایک دِن اِسی پریشانی میں وہ اپنے پسندیدہ سٹائل میں ٹن ہو کر نہر کنارے اپنی پرسنل سوچوں میں گم چلا جا رہا تھا۔ وہ اتنا آ گیا تھا کہ سر اُٹھا کر اُس نے اپنے آس پاس دیکھا تو ماحول مکمل طور پر اِس کے لئے اجنبی تھا۔ وہ دوپہرے وقت چلا تھا اور اب سہ پہر ہو چکی تھی۔ نہر کے کنارے گھنے درختوں کی لائنیں تھیں جن کے باعث بالکل شام لگ رہی تھی۔ وہ جوؤں اور لکڑی کے بورے سے بھرے ہوئے گھنے بالوں میں بایاں ہاتھ پھنسائے اور دائیں ہاتھ کی شہادت کی اُنگلی اُونٹ جیسے ہونٹوں میں دبائے' آنکھیں سکیڑے آس پاس بڑے غور سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک اِسے زنانہ چیخوں کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو وہ گھبرا کر نہر میں چھلانگ لگانے لگا لیکن جلد ہی اُس نے اپنے دِلی جذبات پر قابو پایا اور ہمدردی کے تحت مزید آگے چلا گیا تاکہ دیکھ سکے کہ آخر کون اتنے درد سے چیخیں مار رہی ہے--- وہ ناک کی سیدھ میں چلتا جا رہا تھا کہ اچانک کسی درخت کی اوٹ سے نکل کر کسی آدمی نے اِس پر سوٹے کا وار کیا۔ اُس نے منہ وٹ کے اُس کے وار کو سہا اور جوابی طور پر اِس پر وار کرنے کی بجائے اُس سے سوٹا ہی چھین لیا۔ لالے کے اِس طرح بہادری دِکھانے پر کسی نے پیچھے سے حملہ کر کے منہ توڑ داد دی اور اوپر تلے اُس پر سوٹے کیوار کر کے مقابلے کی دعوت بھی دے ڈالی۔ جونہی لالے بندو نے گھوم کر پیچھے جوابی کارروائی کرنا چاہی' اُس نے دیکھا کہ پیچھے ایک مرد تھا جس کے پیچھے ایک لڑکی تھی جو کہ یونیفارم میں تو نہیں تھی لیکن اُس کے ہاتھ میں کتابیں دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے وہ کہیں سے پڑھ کر آ رہی ہے یا کہیں پڑھنے جا رہی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں دیکھ کر لالے کا نشہ ہرن ہو گیا اور اُس نے عملی طور پر "ی ملاجٹ" بننے کا ارادہ کر لیا۔ پھر تو بس کچھ نہ پوچھیں کہ دونوں غنڈوں کو کہاں کہاں ضرب لگی۔ بقول لالے بندو کے' اُن کی کوئی ہڈی سلامت نہیں بچی تھی--- لالہ اِس سے فارغ ہو کر خطرناک انداز میں اِس لڑکی کی طرف بڑھا۔ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور

اِس کی نیچے گری ہوئی دو چار کتابیں اُٹھا کر اُسے پکڑائیں اور پھر اُس سے پوچھا۔

''کڑیئے! تم اِن رستوں سے اکیلی کیوں گزر رہی ہو؟ پتہ نہیں کہ یہ جگہ کُڑیاروں کے گزرنے لائق نہیں ہے۔''

اب وہ سہمی ہوئی سی لڑکی منمنائی۔

''بھائیجان! مَیں لاہور میں پڑھتی ہوں اور مہینے میں دو تین دفعہ گھر آتی ہوں' پہلے بھی اِسی راستے سے گزرتی ہوں۔ کبھی پہلے اِس طرح نہیں ہوا لیکن آج پتہ نہیں یہ غنڈے کہاں سے آ گئے۔''

''اوئے' اچھا اچھا---اب بس کر۔ کوئی ساڈے ہوتے تجھے کج نہیں کہے گا۔ توں اج سے میری بہن ہے---اوئے' ٹھیک ہے نا؟'' لالے بندو نے اُس سے پوچھا۔

''جی' بھائی جی---!''

وہ فرمانبرداری سے بولی تو جیسے زلزلہ آ گیا۔

''اوئے' نہیں نہیں کڑیئے! مَیں کسی کا ''بھائی جی'' نہیں ہوں۔ اب کہا تو زبان کاٹ کے ہتھیلی پہ رکھ دوں گا۔ علاقے میں ہے کوئی جس میں اتنی جرأت ہو کہ وہ مجھے بھائی کہے۔ مَیں تو لالہ ہوں' سب کا لالہ!''

''ٹھیک ہے جی' آپ لالہ ہیں' سب کے لالہ!'' اُس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''اوئے' آہو---''

اِس کی فرمانبرداری پہ لالہ خوش ہو گیا' شاید اِس لیے کہ پہلے کبھی کسی نے اتنی عزت سے نہیں نوازا تھا۔ گھر پہنچنے تک اُس لڑکی کا مکمل تعارف حاصل ہو چکا تھا۔ اُس کا نام فرح بھٹی تھا اور وہ لاہور یونیورسٹی میں بی ایس سی کی سٹوڈنٹ تھی۔ لالے نے اِس کا ہاتھ اُس کے گھر والوں کے ہاتھ میں دیا اور اِدھر سے خوب خدمت کرا کر اور شاباش حاصل کر کے منہ بولے بندھنوں میں بندھ کر گھر آ گیا۔ پھر کیا تھا' لالے کی بہادری کا کسی نے یقین نہ کیا۔ تو ایک دِن فرح خود لالے کے گھر ملنے آئی۔ اُس نے گواہی دی کہ واقعی یہ ''کارنامہ'' لالہ جی نے ہی انجام دیا ہے تب جا کے لالے کے ''چڈی فرینڈز'' خالو شاکے اور لیا قو نے یقین کیا۔

کچھ دِنوں سے لالہ بندو کھویا کھویا سا نظر آتا تھا' یوں جیسے اُسے زندگی گزارنے کا مزہ نہ آ رہا ہو۔ وہ ہر کسی سے اُکتایا ہوا سا رہتا' یوں جیسے ابھی ابھی 105 بخار سے فارغ ہوا ہو۔ لوگ کہتے کہ اِسے ''بابے لاہوریے'' کی بیماری کا غم ہے اِس لئے وہ چڑچڑا سا ہو گیا ہے---آج کل وہ حرکتیں بھی اُلٹی سیدھی کرتا نظر آتا تھا اور گھر سے بھی کتنے کتنے دِن غائب رہتا۔ اگر گھر میں ہوتا تو مہینوں گھر سے نکلنا ہی بھول جاتا۔ اگر کھانا کھاتا تو بے تحاشا کھاتا اور اگر نہ کھاتا تو کتنے کتنے دِن تک لقمہ تک نہ کھاتا۔

اب لالہ بندو کو زندگی گزارنے کا مزہ نہیں آتا تھا' اکثر کھویا کھویا نظر آتا۔ لوگ کہتے کہ اسے بابے لاہوریے کی بیماری کا غم ہے لیکن وہ دانت سے دانت نہ اٹھاتا اسی لیے کسی کو بھی اس کی پریشانی کی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ ایک بار سننے میں آیا ہے کہ امجد اسلام امجد لالے کے پاس سے گزر رہے تھے' انہوں نے لالے کو نہر کنارے سوچوں میں گم پایا تو بے اختیار چیخ اٹھے---

چار چوکے

ہڑپہ

ظفر جس پہ تشریفیں رکھی ہوئی ہیں
وہی پیڑ اِک دِن گرا دیں گے ہم' تم
ہڑپ کرنے کا یونہی عالم رہا تو
وطن کو ہڑپہ بنا دیں گے ہم' تم

اُلفت

اُلفت خوش انجام جو ہو
اِس کا عقد مقدر ہے
گویا کہ یہ جذبہ بھی
خودکش حملہ آور ہے

قومی سیاست

اب ہمارے پاس اِس کے واسطے
بے نیازی کے سوا کچھ بھی نہیں
اِن دِنوں قومی سیاست بھی' ظفر
نعرہ بازی کے سوا کچھ بھی نہیں

پلیز

زندگی رونقوں سے خالی ہے
اِس میں اپنی وفائیں بھر لیجے
لے کے پھرتا ہوں دِل کا موبائل
اِک نظر ''ایزی لوڈ'' کر لیجے

نوید ظفر کیانی
nzkiani@gmail.com

پیڑ کو لگے جائے گھن اور آدم زاد کو غم
ہم نے تو امجدؔ دونوں کو بچتے دیکھا ہے کم

بس تب سے سب نے مشترکہ طور پر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا کیونکہ اس شعر کی عملی تصویر پر بننا بھی اعزاز سے کم نہ تھا۔

ایک بار تو گویا حد ہوگئی۔یعنی شدید سردی میں سلامتے قصائی نے صبح صبح کمادوں سے نکل کر گھر کی طرف آئے ہوئے سڑک پار کی تو پٹ سے بے ہوش ہوتے ہوئے بچا کیونکہ لالہ بندو برف کے کارخانے کی طرف جانے والے ایک ریڑھے پر لادے ہوئے برف کے بلاکوں پر بیٹھا تھا اور اسے ٹھنڈ کا احساس بھی نہ ہو رہا تھا۔اسکی واحد وجہ اس کے شبنمی ہونٹوں میں دبا ہوا سگار تھا جس سے کہ وہ سُوٹے لگا رہا تھا اور مزے سے بلاکوں کے اوپر بیٹھا دھیرے دھیرے کارخانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔سلامتے قصائی نے سر پیٹتے ہوئے گلی کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔گھر پہنچ کر اس نے من وعن بلکہ دو ''ٹوٹے'' بڑھا کر ساروں کو اس گرما گرم لیکن ٹھنڈی ٹھار ''صبر'' سے آگاہ کیا جس کو سن کر سب اپنی اپنی بساط مطابق رنجیدہ ہوئے اور لالے کے آنے پر باری باری علیحدگی میں پوچھا کہ اسے کیا مسئلہ ہے؟ لیکن لالہ بھی پرانے زمانے کی ڈھیٹ بائیکل تھا۔اس نے بھی اپنا مسئلہ کسی کو نہ بتایا۔لوگوں نے بہت سمجھایا اور کہا کہ بندو! تیرا ابا اتنی جلدی جانیوالا نہیں ہے' وہ دو چار دن اور زندگی کی بہار لوٹ سکتا ہے' تجھے اتنی جلدی یتیم کر کے وہ نہیں جائے گا۔۔۔لیکن لالے جیسے کڑیل اور پتھر انسان پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔اسے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ ابے کے بیڈ سے لگنے کے بعد وہی گھر میں سب سے بڑا ہے۔بس اسے تو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔نہ تو کھاتا پیتا ڈھنگ سے اور نہ نہاتا کیونکہ اس پر دیکھتے ہی دیکھتے گوڑے گوڑے میل چڑھ آئی تھی اور وہ سوکھ کر قلفی کا تیلا بن رہا تھا۔

آخر کار سب نے نہر کنارے میٹنگ بلائی اور اس میں متفقہ فیصلہ کیا کہ بانو درزن لالے بندو کی پریشان سوچوں کا گھڑا نکال کر اس سے پنچھ پرست کریگی۔سب کی تجویز کے مطابق بانو لالے کے ابے سے چوری چوری اسکے گھر میں داخل ہوئی تو گھر کے کونے میں رکھے چولہے کے پاس بندو بیٹھا راکھ پھرول رہا تھا۔بانو بلی کی چال چلتی ہوئی اسکے قریب گئی اور دھیرے سے اسکے مونڈھے پر ہاتھ رکھ دیا۔بندو کا تراہ نکلا اور اس کا پورا ہاتھ گرما گرم راکھ میں دھنس گیا۔اب بانو کی شکل دیکھنے والی تھی بلکہ اب تو لالے کی شکل بھی دیکھنے والی تھی۔اس نے کچھ کہنے کیلئے نتھنے بلکہ نتھنوں کے نیچے لب وا کیے تو بانو درزن پہلے ہی بول پڑی۔

''دیکھ' بندو! مجھے کچھ کہنے سے پہلے میری بات سن لے۔تیری پاس مجھے سب نے اس لیے بھیجا ہے کہ میں تجھے اچھی طرح سمجھتی ہوں اور تجھے سمجھا بھی سکتی ہوں۔تو کچھ دنوں سے ڈاڈھا پریشان ہے۔مجھے اپنی پریشانی بتا دے' ہوسکتا ہے کہ میں تیری پریشانی کو دور کرنے میں کوئی مدد کروں۔تو مجھ پر اعتبار کر' کیا پتہ میں ہی کوئی حل نکال سکوں۔'' اتنا سننا تھا کہ بندو کے نینوں سے چشمے پھوٹ پڑے۔اس نے جلدی سے بانو سے پیٹھ موڑی اور دیوار کی طرف منہ کر کے اپنے نازک ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھ ڈالے۔یہ دیکھ کر بانو جلدی سے اسکے سامنے آئی۔

''وے' بندیا! کیا بات ہے تو ابے کی وجہ سے پریشان نہ ہو' ہم سارے محلے مل کر تیرے ابے کا علاج کروائیں گے۔دیکھنا' لاہوریا چاچا اپنے قدموں سے اٹھ کر باہر جائے گا اور نشہ کرے گا۔''

اتنا سننا تھا کہ بندو نے ہاتھ اٹھا کر بانو کو بولنے سے منع کر دیا۔

''بانو! میں ابے کیلئے نہیں پریشان۔میں۔۔۔مجھے عشق کا روگ لگ گیا۔'' اسکے ساتھ ہی بندو کے غبارے سے ہوا نکل گئی اور وہ چھم چھم رونے لگا۔بانو کا منہ تو کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''اوئے بندو! تو عشق کی وجہ سے پریشان ہے۔'' بڑی دیر بعد بانو کے منہ سے یہ لفظ ادا ہوئے۔''ہم تو سمجھ رہے تھے کہ تم اپنے ابے کے لئے پریشان ہو۔پر تم تو جیسے تمہاری مرضی لیکن میں تو کوئی اتنی بری بھی نہیں تھی۔پتہ نہیں وہ کون خوش نصیب ہوگی جو تجھ پسند آئی ہے۔''

بانو درزن سر جھکائے دھیرے دھیرے باتیں کر رہی تھی۔اس کے غم آلود لہجے پہ بندو نے لحظہ بھر کو بھی توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ اپنے دل کا راز آشکار کر کے وہ فرید چوڑا ہو گیا۔

بانو' میری بہن! (اس لفظ پر بانو کا چہرہ پھول کر تربوز جتنا ہو گیا) تو کچھ ایسا کر کہ میرا ویاہ کوثر سے ہو جائے۔کیا تو اس سے میرا ویاہ کرا سکتی ہے؟ ابا بڑا ظالم ہے اور اسکے بھی بھائی چار ہیں جو بڑے بدمعاش ہیں۔اگر تو میرا کام کر دے تو تیرا تو کچھ نہیں بگڑے گا البتہ میں دنیا پہ آ جاؤں گا۔تو میرے اماں ابا سے اس بارے گل کریگی' نا؟

بندو اسے کندھوں سے پکڑ کر جھٹکے دے رہا تھا۔اسے شکوہ کناں نظروں سے دیکھتے ہوئے غالباً درزن نے ترس کھایا اور ''انگشتانہ'' دکھا کر طوعاً کرہاً لالے کی مدد کر نیکا وعدہ کر کے گھر کو چل دی۔

لالے کے سر کی جوں کو چین آ گیا تھا جو کہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح لالے کے دل کے سر میں بولائی بولائی گھوم رہی تھی۔لیکن بانو کو ایک اور دریا کا سامنا تھا۔جی ہاں اپنے دل کی خواہش کو مارنا تھا اور لالہ جی کی خواہش کو عملی جامہ پہنانا تھا۔اس کیلئے اس نے 8 چک شمالی کی رہائشی کوثر سانولی (حالانکہ وہ سانولی ہرگز نہ تھی بلکہ کالوں سے بھی کالی تھی) کے گھر

کا ایک چکر لگایا۔ اُپلے تھاپنے والی اور گلی میں منجی بچھا کر بیٹھنے والی کوثر لی میں اسے کوئی کشش محسوس نہ ہوئی البتہ اس نے لالے کی چوائس پہ دل ہی دل میں جی بھر کے لعنت ملامت ضرور کی۔ خیر' جو بات درزن کے سر چڑھے' وہ تو پوری ہو کے رہتی سو اس نے لاہورئے پاں پاں کو انگشتانے پر چڑھایا اور ایسا ٹانکا لگایا کہ سیدھی زبان کی قینچی چلتی گئی اور بغیر (ٹیڑھ میٹرھ) کے ہی دونوں گھروں کی طرف سے ہاں ہوگئی۔

لالے کے تو موروں جیسے پیر زمین پر ٹکتے ہی نہ تھے۔ وہ تو اپنے بیاہ پہ اللہ دِتہ لُونے والے کی مانند چھم چھم ناچتا پھر رہا تھا۔ شادی پر آئے ہوئے کسی بچے نے اپنی ماں سے کہا۔

"امی! میں نے لالہ بندو دیکھنا ہے۔ میرے دوست اس کا بڑا نام لیتے ہیں۔"

ماں نے کہا "بیٹا! وہ تمھارا ماموں ہے اور میرا کزن ہے۔ ابھی کہیں سے بے لگام آتا دکھائی دیگا تو تمہیں بھی دکھاؤنگی۔"

بچہ کھیل کود میں لگ گیا تبھی تھوڑی دیر بعد ماں نے چیخ چیخ کر بچے کو بلایا۔

"جیدے' او جیدے! ادھر آ۔" لڑکا قریب آیا تو ماں نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ دور جو آدمی سہرے کی لڑیوں میں چوری چوری جھانک رہا ہے اور رومال کو ناک پہ کبھی رکھتا ہے اور کبھی اٹھا لیتا ہے' بس وہی تیرا ماموں لالہ بندو ہے۔"

بچے نے ماں کا بازو کھینچا اور ضد کرنے لگا۔ "امی! میں نے قریب سے دیکھنا ہے۔"

مجبوراً ماں ساتھ چل پڑی۔ لڑکے نے پاس جا کر کہا۔

"لالہ' انکل! شادی مبارک ہو۔"

لالے بندو نے پہلے تو سہرے میں سے ہی اُسے وا جھانکنے کی کوشش کی لیکن پتلی پتلی کلیاں آنکھوں میں چبھیں تو اس نے آنکھیں ملتے ہوئے لڑیاں اوپر اٹھا دیں۔ آنکھوں میں سے پانی بہا اور چھینک پہ چھینک۔ سامنے کھڑے ہوئے جیدے کے نئے کپڑے لالے نے خراب کیے تو بچہ بیچارہ کراہت سے پرے ہٹ گیا اور رونے لگا۔

"امی! لالہ انکل تو بہت گندے ہیں۔ میں سب کو بتاؤں گا کہ یہ مجھ پر ناک پھینکتے ہیں۔"

وہ روں روں کرتا پرے بھاگ گیا اور بس جناب اس واقعہ نے شہرت دوام حاصل کی اور لالے کی لومیرج کو امر کر دیا۔

شادی گزرے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے اسلیئے لالے پر بیاہ کے چاولوں کا خمارہ طاری تھا۔ اب تو اسے ابے کی کمپنی بھی یاد نہ آتی اور نہ ہی وہ نشے پانی کو اتنا "مس" کرتا۔ ہر وقت "کوثر کوثر" کا ورد لبوں پر جاری رہتا۔ ابھی ابھی تو وہ شادی شدہ ہوا تھا' اسکے "ختم شدہ" ہونے کے دور دور تک کوئی پروگرام نہ تھے کہ اب لاہوریا سخت بیمار پڑ گیا۔ لالے کا "شادی مزا" کرکرا ہو گیا۔ اب آہستہ آہستہ موت کی جانب بڑھ رہا تھا۔ لالے نے ہفتہ دس دن ابے کو سرکاری ہسپتال میں بھی رکھوایا لیکن نشہ ہڈیوں میں رچ چکا تھا اس لیئے وہ ٹھیک نہ ہو سکا اور ایک رات اچانک دنیا سے اپنا آپ لے کر عالم بالا پہنچ گیا۔

شغل+مغل

✿ محبوبہ سے بیوی بننے کا سفر بہت ہی حسین ہے مگر آگے منزل بہت خطرناک ہے--- توصی

☆ ان کے لیے آسان ہے' خطرناک تو شوہر حضرات کے لیے ہے۔

✿ مرد کو عظیم بنانے والی ہستی اس کی بیوی ہی ہوتی ہے--- نازیہ ناز نازی

☆ نام کی حد تک تو ہمیں تسلیم ہی ہے۔

✿ "میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا" --- ہر لڑکے کا پسندیدہ جملہ--- غزل رانی

☆ اور بعد از شادی ساتھ رہ کر مر جاتا ہے۔

✿ جتنی محبت شوہر محبوبہ سے کرتا ہے' اگر اتنی ہی محبت بیوی پر نچھاور کرے تو ہر گھر جنت نہ بن جائے--- نازیہ ناز نازی

☆ پس ثابت ہوا کہ کسی بھی گھر کو دوزخ بنانے میں عورت کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔

✿ کاکیو! اگر ان لڑکوں کی کمینگی سے بچنا چاہتی ہو تو "بھائی جان" تکیہ کلام کے طور پر بنا لو--- نازیہ ناز نازی

☆ پھر شادی کے بعد تو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ شادی بھی تو کسی لڑکے سے ہی ہوگی؟

✿ اگر کاکوں نے اسی طرح بال بڑھانا شروع کر دیئے تو اُسترا آثارِ قدیمہ کے پاس چلا جائے گا--- نازیہ ناز نازی

☆ جی نہیں' لڑکیوں نے بھی تو اسی اُسترے سے اپنی ٹھڈیں بنانا شروع کر رکھی ہیں۔

✿ لڑکیوں کا پیچھا کیے بغیر شاید ان چھچھوروں کا کھانا ہضم نہیں ہوتا--- نازیہ ناز نازی

☆ آپ روزانہ کتنے چھچھوروں کا کھانا ہضم کرواتی ہیں؟

✿ آج کل کی لڑکی شکل دیکھ کر ہی بتا دیتی ہے کہ اُس کی جیب میں کتنے پیسے ہیں--- محمد عباس

☆ جب لڑکیوں کو پتہ چلتا ہوگا کہ آپ کی جیب میں اِک پائی نہیں تو آپ کو کافی شرمندگی ہوتی ہوگی؟

✿ فیشنی کاکوں کو دیکھ کر مجھے تو سرکس کا جوکر یاد آ جاتا ہے--- نازیہ ناز نازی

☆ لیکن آپ کے سامنے فیشنی کاکے نہیں بلکہ آئینہ رکھا ہوا ہے۔

✿ نئی زمانہ شاعروں کو لڑکوں کے لمبے بالوں پر اشعار لکھنے چاہئے--- نازیہ ناز نازی

☆ اور لڑکیوں کی ٹھڈوں پر بھی---!

✿ عاشق اور رقیب کو دیکھئے' مرد ہی مرد کا دشمن ہے--- نازیہ ناز نازی

☆ اور وجہ دشمنی بھی دیکھیے--- لڑکی اور صرف لڑکی---!

✿ تاریخ گواہ ہے کہ محبت میں گھاٹا عورت نے' نفع مرد نے پایا ہے--- نازیہ ناز نازی

☆ واقعی رانجھے کی شوگر مل تھی' مجنوں کی بسیں چلتی تھیں اور فرہاد امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا تھا۔

محمد صابر مغل عبدو پوری

رمضان کا مہینہ تھا۔ سحری ٹائم کوثر نے سب کو اٹھایا۔ ابے کو بھی روٹی کھانے کیلئے ہلایا جُلایا تو اسکی جان نکل گئی کیونکہ ابے کے جسم میں بھی جان نہیں رہی تھی۔ کوثر بھاگم بھاگ لالے کے پاس پہنچی۔

''بندو جی! بندو جی! تہاڈے ابو جی نہ بول رہے ہیں' نہ آنکھیں کھول رہے ہیں' بس ہولی ہولی ڈول رہے ہیں۔ ان کی تو چارپائی کا پاؤں بھی نکل گیا ہے' جا کر دیکھو کہیں مر مرا تو نہیں گئے۔''

یہ سن کر لالے کے نینوں کا نشہ اڑ گیا اور ہاتھوں کے طوطے ہرن ہو گئے۔ وہ بھاگم بھاگ ابے لہورئیے کی چارپائی کے نزدیک پہنچا۔ اسے اچھی طرح جھنجھوڑا لیکن لہوریا مرحوم دنیا میں ہوتا تو کوئی رسپانس دیتا۔ بندو اس صورتحال پر گھبرا گیا اور وہیں چادر دیکھے بغیر پاؤں پھیلا کر دھاڑیں مارنے لگا اور بین کرنے لگا۔ چند لمحے تو کوثر سانولی نے یہ جذباتی منظر بڑے شوق اور حوصلے سے دیکھا اور چند ایک ٹسو سے بھی بہائے لیکن آخرکار اس نے بندو کے جھٹکے کھاتے بدن کو سہارا دیکر زبردستی روکا اور کہا۔

''ابے کو پہلے دھو دھلا لیں اور نئی چارپائی پہ منتقل کر لیں' پھر رونا شروع کرنا۔ اسطرح تو اپنی بے عزتی ہو گی کیونکہ ابیکا کمرہ اور بستر اتو بہت گندے ہیں۔'' بندو نے سسکیاں لیتے ہوئے یہ بات سنی تو فوراً ہی خاموش ہو گیا۔ جلدی سے لنگوٹا کسا اور الہڑ مٹیار کیطرح بھاگ بھاگ کر کام کرنے شروع کر دیئے۔ پہلے تو ابے کی لاش کو جپھی ڈال کر گھرے میں لے جانے لگا۔ اسی کوشش میں اسکے بازوؤں میں سے ابے کی ٹانگیں چھوٹ گئیں اور لاش ایسے ہو گئی جیسے بندو کے سہارے کھڑی ہو۔ یہ سوچ کر بندو کو جھرجھری آ گئی اور ابے کو اس نے چارپائی پر ہی لمبا کر دیا۔ پھر میاں بیوی نے باہم صلاح مشورے سے پائنتی اور ادوائن کی سائیڈوں سے چارپائی کو پکڑا اور اٹھا کر غسل خانے میں لے گئے چونکہ ابا ان سے اکیلا قابو نہیں آ رہا تھا اس لیئے وہ اسے چارپائی سمیت ہی غسل خانے میں لائے اور ابے کو طہارت کرانے لگے۔ بندو نے لاش کو پکڑ دھکڑ کر چارپائی کے کلیجے پر بٹھایا۔ کوثر سانولی نے نلکا چلایا اور لالہ بندو ابے کی آخری یادگار' یعنی لاش پر صابن ملنے لگا۔ اس کے جسم کو اچھی طرح مَلا اور خشک کر کے پھر چارپائی پر لٹا دیا۔ پھر کھینچ کھانچ کر غسل خانے سے باہر نکالا اور کمر کے گرد کپڑا کس کے وہ پیٹنا ڈالا کہ ابے کی لاش کو بھی جھرجھری آ گئی۔ گلی محلہ اکٹھا ہوا اور لہورئیے پاں پاں کی اتنی اچھی اور صاف ستھری موت پر عش عش کر اُٹھا۔

ابے کی موت کے چند دن بعد تک بندو نے بڑا سوگ منایا۔ شیو بڑھالی' کپڑے بدلنے چھوڑ دیئے۔ شادی والا نواں نواں چاء بھی اتر گیا۔ سُوٹے کا نشہ بھی وقتی طور پر اتر گیا اور دائمی جلائی والا سگار منہ میں دبا لیا۔ پر کب تک؟ اسے دوستوں نے سمجھایا' بیوی نے آگاہ کیا کہ ابھی تمہارے ویاہ کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ آخر ساروں کی بولیوں نے اس کو مجبور کیا تو اس نے مونڈھے سے غم کی کالی لوا تار پھینکنے کا فیصلہ کر لیا۔ کوثری اسے اس کا پسندیدہ کھانا دلیہ بنا کر کھلاتی تا کہ ''بندو کھائے اور غم بھول جائے۔'' بہانے بہانے سے بانو اس کیلئے عاشق دہی بھلے والے سے 15 روپے کی سپیشل پلیٹ بنوا کر دہی بھلوں کی لاتی تا کہ بندو بہل جائے پر وہ بندو ہی کیا جو بہل جائے۔ اسے تو آپ جلدی بھنگ کا نشہ نہیں تھا چڑھتا تو ابے کا غم خاک بھولتا لیکن سب کی دلجوئی کی بدولت وہ گھر سے نکل کر نہر کنارے بیٹھنے لگا۔ ایک جمعے کو سب کے اصرار پہ اس نے صابر نائی سے شیو بھی بنوالی۔ اب تو ذرا اسکا منہ نکل آیا تھا اور نہ تو اسے لگ رہا تھا جیسے اسکی شکل پہ سیاہ رنگ کا جنگل ہو اور اس جنگل کو آنکھیں لگی ہوں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مستی بندو لالہ نہر کنارے بیٹھا پانی کی لہروں میں ابے کی فوٹو دیکھ رہا تھا۔ خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ درزن مشین کا تیل اٹھا لائی۔ بندو نے پاس کھٹی کھٹی امبیاں بھی دھری ہوئی تھیں۔ اس کو خبر نہ ہوئی اور بانو نے تیل سے ہاتھ بھر کے' جذبات سے لبریز ہو کر بندو کی کمر پہ ہاتھ پھیر دیا۔ بس جی' بندو کو تو چڑھ وَٹ گئے۔ اس نے آموں کا آگے رکھا کریٹ نہر میں مُودھا کر دیا اور پیچھے مُڑ کر بانو کو مارنے کیلئے ہاتھ بڑھایا اور اس کو دیکھتے ہی وہیں رک گیا کیونکہ بانو کی نینوں سے بندو کیلئے بے تحاشا پیار ڈھلکاں مار رہا تھا۔ بس ایک لمحے کی بات تھی کہ بندو سلپ ہو گیا۔ جی نہیں' وہ بانو کے نینوں والے کچے ویہڑے میں سلپ نہیں ہوا تھا بلکہ اپنے کھا کے پھینکے ہوئے آم کے چھلکے سے سلپ ہوا اور سیدھا نہر میں جا پڑا۔ بانو بھی ساتھ ہی لڑھکتی چلی گئی ہو سکتا ہے کہ یہ سین بھی چلتا لیکن اِس سین کے ساتھ ہی کٹ کی آواز پہ دونوں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو کوثر سانولی کپڑے دھونے والا ڈنڈا ہاتھ میں پکڑے آنکھوں سے شعلے برساتی' فلمی سائیڈیے (وِلن) کی طرح نہر کے کنارے کھڑی اِن دونوں کی باہر آمد کی منتظر تھی۔ لیں' جناب! بانو درزن نے جب یہ سین دیکھا تو نہر میں غوطہ لگا کر ایسے تیرنے لگی اندر ہی اندر جیسے کپڑے کو گم سلائی لگاتے ہیں۔ جب بانو نمودار ہوئی تو کوثر بہت پیچھے مسلسل اِس جگہ کو گھور رہی تھی جہاں وہ گم ہوئی تھی۔ بانو نے باہر نکل کر شکر بھی ادا نہ کیا اور فنافٹ دُڑکی لگا کر سڑک عبور کی اور سانپ جتنی طویل گلی میں اپنا دروازہ تلاش کر کے اندر گھسی اور کنڈا چڑھا لیا۔

☆☆

☆ قاضی محمد الیاس

عجیب غلطیاں

قارئین کرام! غلطیاں ہماری زندگی میں کس قدر اہمیت رکھتی ہیں، غلطیوں کی ابتدا کہاں سے ہوئی، نیز دنیا کی پہلی غلطی کس نے کی؟ یہ مسئلہ بھی ہنوز متنازعہ فیہ کہ غلطیاں پروان کیسے چڑھیں؟ ان موضوعات پر تادم تحریر کوئی تحقیق یا ریسرچ نہیں ہوئی اور نہ ہی ہنوز کسی لئے جرأت رندانہ یا ہمت مردانہ سے کام لیا ہے۔ یہ صورت حال دیکھتے ہوئے ہم نے عنوانات بالا کے بارے میں تھوڑی بہت چھان پھٹک کی ہے۔ بقول میر۔۔۔

کیا کروں دِل خوں کروں شعر ہی موزوں کروں
چلتی ہے اب تک زباں کچھ تو کیا چاہئے

ایک خدشہ یہ بھی تھا مبادا کوئی اور ہم سے پہلے ہی ایسی غلطی نہ کر بیٹھے۔ تو عزیزانِ من! ہماری اس تحقیق سے آپ ہرگز یہ قیاس نہ لگائیں کہ ماہدولت کو دیوانگی مرغوب ہے یا پھر جنون سے کچھ نسبت ہے (ہماری نظر میں تو ایسا سوچنے والا بھی غلط ہے) بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اب اس سلسلے میں ہماری مزید خاموشی کا اہل وطن غلط مطلب بھی نکال سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں غلطیوں کے بارے میں عزیزان وطن کی معلومات بڑی محدود ہیں۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس باب میں ایک ضخیم کتاب مرتب کریں تاکہ اہل فن وہنر بھی غلطیوں کی برکات سے بہرہ ور ہوسکیں بس یہی سوچ کر ہم نے غلطیوں جیسے غلط موضوع پر طبع آزمائی کرنے کا فیصلہ کرلیا اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اس عمل میں ہم اپنے تحقیقی مزاج کے باعث نت نئی غلطیاں ایجاد کرنے چلے گئے کیونکہ غلطیاں جیسے موضوع پر قلم اٹھانا بذات خود غلطیاں کرنے کے مترادف ہی تو تھا حالانکہ بعض محرمان راز کا یہ خیال بھی تھا کہ اس سلسلے میں کسی تحقیق کی ضرورت نہیں، یہ کام تو الحمدللہ ہر وقت جاری وساری رہنے والا ہے۔ معاف کیجئے غلطی سے یہ بات تو آپ کو بتانا ہی بھول گیا کہ جو خواتین وحضرات یہ تحریر پڑھ رہے ہوں/رہی ہوں انہیں چاہیے کہ اپنے گریبان کے بٹن بند کرلیں ورنہ یہ بات عین قرین قیاس ہے کہ مضمون ہذا پڑھتے پڑھتے اپنے ہی گریبانوں میں جھانکنے لگیں جو کہ انتہائی غلط فعل ہوگا (فی زمانہ جھانکنے کے لئے دوسروں کے گریبان ہی کافی ہیں)

بات غلطیوں کی ہورہی تھی۔ نہ تو تحریر ہذا سے قبل کسی لئے اس موضوع پر تصنیف وتالیف کا کام کیا تھا (ہوسکتا ہے کسی نے کوشش کی ہو لیکن زمانے نے اسے حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہو) تاریخ کے صفحات بھی اس باب میں خاموش تھے چنانچہ ہماری تحقیق کا آگے بڑھنا ایسے ہی ناممکن تھا جیسے تھانے کی حدود سے شرافت کا گزر لیکن جب ہم نے اپنے ناریل کا (یعنی کھوپڑی) سے غلطیوں کے عناصر ترکیبی کا جائزہ لیا تو درج ذیل کیفیات بڑی واضح نظر آئیں۔

۱۔ یہ بات وثوق سے نہیں کی جاسکتی کہ غلطی کی جاتی ہے یا ہوجاتی ہے۔
۲۔ غلطیاں قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ عطیہ ہیں جو کچھ انسانوں کو پیدائشی طور پر بھی ملتی ہیں۔
۳۔ غلطی صرف اسی وقت غلطی کہلاتی ہے جب وہ پکڑی جائے یا کرنے والا پکڑا جائے۔
۴۔ غلطی اگر مرد کرے تو مذکر اور عورت کرے تو مونث ہوتی ہے۔
۵۔ طبی نقطۂ نظر سے غلطی کرنے میں ایک ایسی بے ساختہ مسرت بھی موجود ہے جو کچھ حضرات کو قبض کشا گولیاں کھا کر ہوتی ہے۔
۶۔ آخر میں اپنی طرف سے ایک فلسفیانہ نکتے کا اضافہ کرتا چلوں کہ غلطیاں بہرحال غلطیاں ہوتی ہیں اور کسی تحقیق کی متحمل نہیں ہوتیں۔

اگر آپ غلطیوں کے تحقیقی مطالعے کا شوق رکھتے ہیں تو یہ امر آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا کہ صدیوں کی کاوشوں کے بعد غلطیوں کے بے شمار اور نادر نسخے وجود میں آچکے ہیں اور غلطیوں نے باقاعدہ فن کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ دور کیوں جائیں اب اسی مضمون کو ہی لے لیں اس میں لاتعداد غلطیاں ہیں۔ اَب اگر میں آپ سے پوچھوں کہ وہ کونسا لفظ ہے جسے پڑھے لکھے باشعور افراد بھی غلط پڑھتے، غلط ہی لکھتے اور غلط ہی سمجھتے ہیں؟ یقیناً آپ کا جواب بھی ''غلط'' ہی ہوگا۔ یہ تو حال ہے آپ

کی ذہانت کا۔ حالانکہ میں بھی اسے غلط ہی سمجھتا تھا، اگر آپ کو یقین نہ آئے تو میں آپ کو وہ قیمتی اسناد دکھا سکتا ہوں جو ماسٹر صاحب نے ہمیں مولا بخش کے ذریعے کمر پر عطا کی تھیں حالانکہ غلطی ہماری نہیں بلکہ اس گھڑی کی ہوتی تھی جو ہمیشہ آدھ گھنٹے لیٹ رہتی تھی۔ اب ایسے عالم میں انسان ذرا دیر سے اسکول پہنچ جائے تو تعجب کیسا؟ لیکن کچھ احباب ہمارے اس طرز عمل کو غلطی سے تعبیر کرتے ہیں اب ایسے لوگوں کے منہ کون لگے۔

بالفرض محال کباب بنانے کی کوشش کی تو لئی یا پاپڑ ٹائپ کی چیز وجود میں آگئی۔ اکثر اوقات ۴×۶ کا مشکل سوال = ۱۰ کی صورت میں اختتام پذیر ہوا کیونکہ ہم اسے ہر بار ضرب دینے کی بجائے جمع کر دیا کرتے تھے۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ کھانا کھانے کے بعد دوبارہ یہ سوچتے ہوئے کھانے لگے کہ شاید ابھی نہیں کھایا لیکن، صاحبو! آپ کو ہماری عقل کی داد دینی پڑے گی کہ ہم آج تک سانس لینا اور دوسروں سے ادھار لینا کبھی نہیں بھولے۔ ہمیں تین وظیفے بھی اسی بات کے ملے تھے۔ ایک تو عمدہ یادداشت کا تھا اور دوسرے دو اوہ--- وہ تو یاد ہی نہیں رہے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ غلطیوں کے باب میں یہ بندۂ کمینہ اپنے ہی واقعات بیان کئے جا رہا ہے تو عرض ہے کہ اگر اسی بہانے ذرا اپنی ''پبلسٹی'' ہو جائے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ کہ اکثر اہل فکر و دانش اسے ''پبلک پبلسٹی'' سے موسوم کرتے بھی دیکھے گئے ہیں۔ آیئے اب چلتے ہیں دوسروں کی ان غلطیوں کی طرف جو ہماری کھوپڑی گھوم جانے کی صورت میں وجود میں آئیں۔

ولادت باسعادت: ہم ہر کام شروع سے شروع کرتے ہیں۔ آیئے غلطیوں کو بھی شروع سے شروع کریں۔ غلطیوں کی ابتدا کے سلسلے میں حضرت انسان کا نام (باوا آدم علیہ السلام کا گندم کھانے کے حوالے سے) خوامخواہ بدنام ہے۔ یہ الزام شیطان کے سر یوں تھوپنا پڑا کہ ہم خود بھی انسان ہیں اور اول الذکر صورت میں ہمارا دامن بھی جھلس سکتا ہے۔ آیئے آپ کو حقائق کی روشنی میں بتائیں کہ غلطیوں کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ یہ آسمان کی باتیں خداوند ذوالجلال فرشتوں سے فرما رہے ہیں، ہم انسان کو اپنا نائب یعنی اشرف المخلوقات بنا کر بھیج رہے ہیں۔ شیطان کی شیطانی کے پیش نظر گمان غالب یہی ہے کہ شیطان نے کہا ہوگا۔ آپ مالک المختار ہیں۔ جناب! لیکن مجھے خدشہ ہے کہ یہ حضرت انسان زمین پر جاتے ہی کسی اشرف نامی لڑکی سے شادی کر کے اسے ہی اپنی مخلوق بنا لے گا (اشرف نامی لڑکیوں سے معذرت) رب اکبر نے تمام فرشتوں سے انسان کو سجدہ کرنے کو کہا لیکن ابلیس نے انکار کر دیا۔ بس یہیں سے ہی غلطیوں کی ابتدا ہوگئی۔ اب ملایئے ہاتھ، میں نہیں کہتا تھا کہ یہ سب کچھ تو شیطان خبیث کا کیا دھرا ہے۔ مانا کہ ہم لاکھ کمینگی، خود غرضی، مفاد پرستی، تعصبات اور فرقہ واریت کا رجحان سہی لیکن ذرا سوچئے کہ کیا ان چھوٹی موٹی غلطیوں سے، یا پھر تھوڑی بہت رشوت، جھوٹ یا مکاری سے ہماری مسلمانی میں کونسا فرق آ جاتا ہے۔ بھئی، یہ باتیں تو وقت کی ضرورت ہیں اور ضرورت کے وقت یہی حضرت انسان کھوتے کو والد محترم پر فوقیت دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

غلطیوں کی اقسام وطریقہ استعمال: عزیزان من ذرا تصور کی آنکھ کھولیئے اور دیکھئے کہ غلطیوں میں کتنی رنگیاں اور کتنے پہلو پوشیدہ ہیں۔ آیئے آغاز میں آپ کا تعارف ایک رنگین قسم کی ''چلتی پھرتی غلطی'' سے کرواتے ہیں تاکہ آپ تحریر ہذا کو اشتیاق سے پڑھیں۔

ایک پنکھڑی لبوں، گلابی رخساروں اور سنہری زلفوں والی دوشیزہ بازار سے گزر رہی تھی۔ ایک لڑکے نے قریب سے گزرتے ہوئے شخص سے پوچھا۔

''جناب! وہ وہ جو لڑکی جا رہی ہے کون ہے؟''

وہ شخص بولا۔ ''وہ میری بیوی ہے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

یہ سن کر لڑکا گھبرا کر بولا۔ ''معاف کیجئے گا مجھ سے غلطی ہوگئی''

مخاطب یہ بات سن کر کہنے لگا ''ابے، غلطی وہ میری ہے تمہاری کیسے ہوگئی، ہائیں۔''

تو ملاحظہ کیا آپ نے غلطی کا ادنیٰ سا نمونہ؟ آیئے اب آپ کا موڈ (جو کہ کافی خوشگوار ہو چکا ہوگا) بدلنے کے لئے علامہ بوجھ بھکو کے پاس چلتے ہیں جو اپنے نوکر پر ناراض ہو رہے ہیں۔

''ابے فضلو! آج صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کیوں نہیں کیا؟''

''حضور! صبح سے ہی بارش ہو رہی ہے۔''

''تو تم چھتری لے لیتے نا، کام چور کہیں کے۔''

غلطی کی یہ قسم حماقت کے زمرے میں آتی ہے۔

خواتین کی غلطیاں: اس ذات شریف پر غلطیاں غیب سے اترتے ہوئے مضمون کی طرح خود بخود ٹپک پڑتی ہیں۔ اس وقت ان کا جاہ جلال دیدنی اور دلائل شنیدنی ہوتے ہیں جبکہ جب مرد عورتوں کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں تو پھر عورتیں مردوں کی باتیں کانوں سے سن کر منہ سے نکالنے لگتی ہیں--- غلطیوں کی یہ قسم بھی سراسر صنف نازک کی ایجاد ہے۔ کسی کے معاملات کو کریدنا اور کسی کو جھنڈے پر چڑھا دینا اسی مخلوق کا خاصہ ہے، بس ایک مختصر سا فقرہ ہی تو کہنا پڑتا ہے۔ ''اے بہن کسی اور سے نہ کہنا'' --- اور اس کے ساتھ ہی نہ کہنے

والی باتیں کہہ دی جاتی ہیں۔ بہر حال، اس بارے میں کچھ زیادہ لکھنا ہمارے اور ایڈیٹر چاند کے حق میں نہیں جاتا۔

تکلفاتی غلطیاں: غلطیوں کی اس قسم کو پہلی مرتبہ زیر قلم لانا ہماری اعلیٰ تاریخ دانی کا ہی نتیجہ ہے۔ ہمارا تجزیہ ہے کہ اگر چند شرفاء بیٹھے موسم کی رنگا رنگی اور نسوار کی قیمتوں تک کے تذکرے کر رہے ہوں اور ایسے عالم میں چائے آجائے تو ہر ایک تکلفاً دوسرے سے کہتا ہے۔ ''پہلے آپ لیجئے۔'' دوسرے صاحب فرماتے ہیں ''نہیں، جناب! پہلے آپ نوش فرمائیں۔'' تیسرے صاحب چونچ کھولتے ہیں۔ ''اللہ، یہ ظلم نہ کیجئے آپ ہی بسم اللہ کریں''۔ نہیں سمجھے؟ آیئے آپ کو عملی طور پر سمجھائیں۔ دو صاحب ایک بازاری بیت الخلا کے دروازے پر اپنی باری کے انتظار میں کھڑے تھے گو کہ ضبط کے مارے دونوں کا برا حال ہو رہا تھا لیکن وضع قطع اور بزرگی میں سبقت لے جانے کے لئے ایک دوسرے کو دعوت دے رہے ہیں کہ پہلے آپ فارغ ہولیں۔ اس قسم کے مکالمے ہو رہے ہیں۔

''قبلہ! پہلے آپ اندر جائیں۔''

''نہیں، بزرگو! پہلے تسی۔''

''نہیں پہلے آپ۔''

''نہیں پہلے تسی۔''

''اب آپ ہی اندر جائیں، ہم تو یہیں فارغ ہو گئے ہیں۔''

نازک مزاج شاہاں تاب سخن ندارد

تو ملاحظہ فرمائیں آپ نے تکلفاتی غلطیاں اور ان کا نتیجہ؟ اگر آپ پر ایسا برا وقت آجائے تو ہر گز تکلف نہ کریں۔ پیشگی لکھ دیا ہے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آوے۔

اساتذہ کی غلطیاں: ہمارے ایک استاد محترم ہیں۔ موصوف نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر تک موجود ہر شے کو ''فرض کرو'' کے صیغے میں بلا تفریق جن وانس کو استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً فرض کرو ایک شخص نے ایک لکڑ بھگا تین ہزار میں خریدا اور اسے ساڑھے انتیس سو پچاس روپے میں فروخت کر دیا، بتاؤ اسے کتنا منافع ہوا؟ میں نے کہا۔

''محترم! میں نے تو آج تک لکڑ بھگا دیکھا تک نہیں۔''

فرمانے لگے۔ ''ہائیں، یعنی تم نے لکڑ بھگا واقعی نہیں دیکھا؟ بھئی، میری طرف دیکھو، نیچے کیا دیکھ رہے ہو۔''

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہم ان کے فرض کیئے گئے سوالوں کے جواب دینے سے قطعی قاصر ہوتے تو موصوف جواب دینے کا فریضہ بھی خود ہی سرانجام دیتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے لیاقت سے پوچھا۔

''فرض کرو دو آدمی لڑ رہے ہیں۔ پہلا دوسرے سے کہہ رہا ہے تم گدھے ہو، دوسرا کہہ رہا ہے تم گدھے کے باپ ہو۔ لڑکے! اب تم گدھا بن کر سوچو کہ انسانوں کی اس گفتگو سے تمہارے جذبات مجروح ہوئے کہ نہیں؟''

قارئین کرام! ذرا خدا لگتی کہیئے گا کہ وہ کونسا فاتر العقل انسان ہوگا جو پہلے تو انسان سے گدھا بننے کو تیار ہوگا اور اگر بالفرض محال تیار ہو بھی ہو جائے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کلاس کے دوسرے لڑکے

ظفرانیات

کلجگ کی پھرتی کے ہم قائل ہیں وافر
آٹا تو کمیاب ہے، موبائل ہیں وافر
کیسا باندھ کے مارا ہے دشمن کو نشانہ
تیر چلانے والے خود گھائل ہیں وافر
یار ہیں شکوہ سنج کہ ان کو گھاس نہ ڈالی
بل جو دیکھوں تو نمبر ڈائل ہیں وافر
منصف سارے ''پی سی او'' پر چلے گئے ہیں
کیس تو میرے جذبوں کے فائل ہیں وافر
اندھوں کے ہاتھوں میں تھی تقسیم، چنانچہ
دینے والے عنقا ہیں، سائل ہیں وافر
دل دیکھو تو مکھی کی منڈی سے چھوٹا
شجرہ دیکھو تو ''میڈ اِن رائل'' ہیں وافر
اَمن کے پرمٹ لینے ہیں تو وہیں ملیں گے
جن ہٹیوں میں بم اور میزائل ہیں وافر
جانے پروانے کیوں مچھر سے لگتے ہیں
شمع حسن کی جانب تو مائل ہیں وافر
روز تری انگنائی میں سر پھٹنے لگے ہیں
مِلّت کے ینگ مین اَنرجائل ہیں وافر
بھتنی بھی میک اَپ سے حور بنی پھرتی ہے
آج تو ہر لڑکی کے اسٹائل ہیں وافر
چپ جو رہوں تو ٹنڈ میں کھجلی سی رہتی ہے
فقرہ بازی کروں تو پھر زائل ہیں وافر

نوید ظفر کیانی
nzkiani@gmail.com

خاموشی سے اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہیں گے اس گدھے پر سواری نہیں کریں گے؟ اور اگر غلطی سے کسی انسان نے دوسرے انسان کو گدھا کہہ بھی دیا تو اس بات کا بتنگڑ بنا کر ہم جیسوں پر عرصہ حیات تنگ کر دینا کیا معنی رکھتا ہے؟

انعام یافتہ غلطیاں: فارسی کے ایک معروف شاعر مولانا گرامی سے اکثر بدحواسیاں سرزد ہوتی رہتی تھیں۔ ایک دفعہ میر محبوب علی خان نظام دکن کے دربار میں اس حالت میں گئے کہ شلوار کا ازار بند لٹک رہا تھا۔ نظام دکن نے یہ منظر دیکھا تو پیش کار سے کہنے لگا۔

''ذرا گرامی کی طرف دیکھو، اسے کچھ ہوش نہیں آیا ازار بند تک لٹک رہا ہے۔''

پیش کار نے سوچا کہ کہیں عتاب نازل نہ ہو جائے لہٰذا اپنی طرف سے بات بنائی کہ گرامی کو جو تنخواہ ملتی ہے، وہ اخراجات میں ضائع ہو جاتی ہے۔ وطن میں اس کی بہن کی شادی رکی ہوئی ہے (حالانکہ ان کی کوئی ہمشیرہ نہ تھی) لہٰذا یہ فکرمند اور پریشان رہتا ہے۔

میر محبوب نے انہیں پانچ سیر سونا دینے کا حکم دیا۔ مولانا گرامی کو معلوم ہوا تو کہنے لگے۔

''ابھی تو ازار بند صرف لٹکا ہی تھا کہ پانچ سیر سونا مل گیا، اگر کھل جاتا تو دس سیر سے کم نہ ملتا۔''

پردہ پوش غلطیاں: آپ نے اکثر اخبارات ورسائل میں ''حسن وصحت'' یا ''بیوٹی بکس'' جیسے کالموں میں کسی ''آنسہ'' یا ''مس'' صاحبہ کے اس قسم کے سوالات ضرور پڑھے ہوں گے کہ میری ایک سہیلی کے بال گر رہے ہیں، اس کا رنگ بھی کالا ہے اور دانت بھی باہر کو نکلے ہوئے ہیں براہ کرام ان کا کوئی حل بتائیں؟ حالانکہ یہ تمام بیماریاں خود موصوفہ کی ذات مبارکہ میں پہلے سے بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں لیکن محض احساس کمتری سے فرار کے لئے یہ بیماریاں اس غریب سہیلی کے سر تھوپ دی جاتی ہیں جو ابھی تک عدم سے وجود میں ہی نہیں آئی۔

کارآمد غلطیاں: ایک دن میں دوکان پر بیٹھا تھا کہ اچانک دیکھا کہ سڑک پر ٹریفک ایک دم جام ہو گیا ہے اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ سامنے دیکھا تو ایک آدم گدھے پر بیٹھا ہوا تھا اور گدھا سڑک کے عین درمیان کھڑا زمین پر کچھ سونگھ رہا تھا گدھے کا مالک اسے ڈنڈے مار رہا ہے لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا جس کی وجہ سے ٹریفک مزید جام ہو رہا تھا الغرض بچوں اور بڑوں کو ہنسنے کا ایک بہانہ ملا ہوا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر مجھے شرارت سوجھی۔ قریبی جنرل اسٹور سے کھلی مرچیں لیں اور گدھے کی ناک کے قریب جا کر پڑیا کھول دی۔ گدھے نے مرچوں کو بڑی دلچسپی سے سونگھا۔ جب دل ودماغ معطر ہوئے تو حضرت خر نے ''پھوں پھوں پھوں'' کا فلک شگاف نعرہ بلند کیا کہ اگلی ٹانگیں اوپر اٹھائیں۔ جس سے گدھے پر بیٹھا شخص نیچے گر گیا اور دوسرے ہی لمحے وہ گدھا گولی کی رفتار سے ایک سمت کو جاتا دکھائی دیا۔

گدھے کے مالک نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے اسے کیا خوراک دی۔ میں نے کہا۔

''خان صاحب! میں نے تو دو روپے کا خوراک دیا تھا۔''

''اچھا---'' خان صا جب بولے۔'' جوان کا بچہ! ابھی چار روپے کا ڈبل خوراک ہمارے کو بھی دو، ہم نے ابھی جا کر گدھے کو بھی پکڑنا ہے۔''

حماقتی غلطیاں: یہ نقطہ بھی قابل غور ہے کہ کچھ غلطیاں جان بوجھ کر بھی کی جاتی ہیں محض دوسروں سے اپنی حماقت کی تصدیق کروانے کے لئے، جیسے ہمارا یہ تحریر لکھنا یا پھر آپ کا مضمون ہذا کو پڑھنا وغیرہ۔

ہمارے ہاں کچھ یہ فیشن بھی چل نکلا ہے کہ ہم نے غلطیاں اور بدحواسیوں کو پروفیسر حضرات سے منسوب کر رکھا ہے جو کہ انتہائی غلط بات ہے۔ ایک دفعہ ہم گھر جا رہے تھے کہ کیلے کا ایک چھلکا راستے میں ہمارے لئے بدبختی کا سامان لئے پڑا ہوا تھا۔ جب ہم اس سے پھسل کر گرے تو یہ منظر دیکھ کر لوگ ہنسنے لگے اور ہم محض اپنی کم علمی کے سبب آج تک ان کے مزاح کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں، نہ جانے لوگوں کے ہنسنے کی کیا وجہ تھی؟

غلطیوں کے باب میں ہماری ملاقات ایک عالم فاضل سے ہو گئی ہم نے مدعا عرض کیا تو بولے۔

''برخوردار! تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے جد امجد حضرت آدم کو جنت سے کیوں نکالا گیا تھا؟''

ہم نے کہا۔ ''محض گندم کا ایک دانہ کھانے سے جو کہ انہوں نے غلطی سے پھانک لیا تھا۔''

''تو اندازہ لگا لو---'' موصوف کہنے لگے۔ ''کہ گندم کا ایک دانہ کھا لینے کی اتنی بڑی سزا ہے اور ہم تو روزانہ نجانے گندم کے کتنے دانے کھا لیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ غلطیوں کا تناسب بھی تو وہی ہوگا نا۔''

ہم انہیں فوری کوئی جواب نہ دے سکے کیونکہ حضرت ایک عالم فاضل شخص تھے اور ہماری قابلیت ذرا دوسری قسم کی کتابوں سے تعلق رکھتی تھی۔ ویسے ان کی بات میں واقعی وزن تھا، دل کو لگی۔ ہمیں اپنی جہالت کا شدت سے احساس ہوا کہ خوامخواہ اتنا وقت ضائع گیا۔

☆☆

☆ سرتاج صدیقی

رسمِ کڑوی

آج ٹی وی پر دیکھئے ''کل'، 'ٹی وی---عقل کے اندھے ناظرین کے لئے 'کل ٹی وی' کی آزمائشی نشریات کا آغاز ہو چکا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ایک منفرد، بے باک، اور خالصتاً بے ادبی مشاعرہ۔ آپ نے رسمِ ازار بندی وغیرہ اور اسی قماش کے مشاعرے دیکھے ہوں گے لیکن یہ اپنی نوعیت کا انوکھا مشاعرہ ہے جس کا عنوان ہے ''رسم کڑوی مشاعرہ'' جو عالمِ بے ادبی میں تہلکہ مچادے گا۔ اس مشاعرہ کے لئے ہمارے سر پہ احسان کیا ہے ''ٹیلی مادہ'' نے۔ موبائل صنعت میں زنانہ انقلاب۔ جی ہاں! وجودِ زن سے ہے ہر موبائل فون میں رنگ۔ انسان چاند پر مٹر گشت کر آیا لیکن ہمارے دیس میں آج تک زنانہ موبائل سروس کا آغاز نہ ہو سکا تھا۔ مایوسی کی ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ اب آپ کی خدمت میں پیش ہے ''ٹیلی مادہ'' صرف اور صرف مادائوں کے لئے جسے مردوئے بھی عورت کی اجازت و مرضی سے چھو سکتے ہیں ان چھ رہنے کے لئے---آیئے، ہم ٹیلی مادہ کی سروس کی متعلق آپ کی بے جان کھوپڑی سے سر کھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنا موبائل ہاتھ میں لئے رہیں۔

خلا میں خالی گھورنے کے لئے صفر دبائیں۔ کسی اور کو گھورنے کے لئے دوبار صفر دبائیں---خود سے ہم کلام رہنے کے لئے ایک، کسی سے بے بات الجھنے کے لئے دو---تو تڑاخ و تلخ گوئی کے لئے تین، جن سے آنکھیں چار ہو چکی ہیں اِن کے لئے چار---پانچوں گھی اور سر کڑاہی میں ڈالنے کے لئے پانچ، خالص نجی اور خفیہ باتوں کے لئے سکس---ہفتہ بھر مسلسل بکواس کرنے کے لئے سات۔ آٹھوں پہر جاگنے کے لئے آٹھ اور جو کام خوشی و شوق سے کرنا ہو لیکن دکھاوے کے لئے No. No کرنے کو نو دبائیں۔ امید ہے' آپ نے پوری سروس رٹ لی ہوگی۔

آیئے پیارے بے کل، بے چین و بے قرار؟ ناظرین مع غیر حاضرین! آپ کا میز پوش و میزبان انجام خطاوی آپ کی زہر آلود نظروں کے سامنے ہے۔ انتہائی عجلت یعنی خالص ایمرجنسی میں یہ محفل مشاعرہ لت پت کی جا رہی ہے کیونکہ شاعرانِ بے لگام و بے ہنگم کی تعداد حدود پار کر چکی ہے۔

ایک شاعر: کیا کہا' حدود آرڈیننس کو پار کر گئی؟

دوسرا شاعر: حدِ بے ادبی ملحوظ رہے۔

انجام خطاوی: شاعروں جیسا حلیہ بنا کر خود کو پیش کرنے والوں کو متشاعر کہا جاتا ہے جن کی آج بہتات ہے۔ اس مشاعرے کو بلا مشاہیرہ بطور حشر برپا کرنے میں شاعرانِ بے لگام کی بے وزن دولتیوں کا بڑا گہرا دخل ہے۔ دراصل 'رسم کڑوی' فی زمانہ ناپید تھی اور یہ صرف دورِ غیر حاضر کی پیداوار ہے۔ جن شاعرانِ بے لگام پر کڑا وقت پڑا ہو یا جن کے نام کا آخری ٹکڑا، 'وی' کی طرز پر ہو وہ اس مشاعرے میں نازل ہو سکتے ہیں لہٰذا بہت سے شاعرانِ بے لگام خود ساختہ نام و نمود کی خاطر کود پڑے ہیں۔ برداشت ہے تو برداشت کر، ورنہ ہارن دے کر پاس کر۔

شاعرانِ بے لگام: واہ واہ' کیا کلام ہے۔

انجام خطاوی: اس رسمِ کڑوی مشاعرے کے ضابطہ بداخلاقی کا لحاظ رہے۔ پیارے بے کل و بے چین ناظرین مع غیر حاظرین! آج کے اس رسمِ کڑوی مشاعرے میں صاحبِ صدر کے گھٹیا ترین و انتہائی ذلت آمیز منصب کے لئے جس شخصیت کا ذکرِ ملامت ہے وہ نہایت بے حس و ڈھیٹ ترین شاعرِ بے ہنگم و بے لگام ثابت ہوتے رہے ہیں۔ صاحبِ صدر ہونے کی سب سے بڑی خصوصیات یعنی خراٹے دار نیند میں غوطہ زنی کی واردات کے ماہر و رسیا ہیں اور کسی مشاعرے کے دوران انہیں بیدار نہیں پایا گیا۔ جب ان سے اجازت لے کر مشاعرے کی کارروائی کی کوشش کی جائے تو یہ امید ہی فضول ہے کہ یہ اجازت دیں گے لہٰذا مشاعرہ کا تسلسل قائم رکھا جا سکتا ہے چاہے یہ اجازت دیں یا نہ دیں۔ اب رہ گیا ان کا خالص غیر ادبی و رسمی تعارف تو اسے آپ صرف وقت کے زیاں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جب دورانِ صدارت یہ ٹن پائے جاتے ہیں تو فیصلہ محال ہے کہ نیند میں غلطاں ہیں یا چڑھائے ہوئے ہیں۔ دونوں صورتوں میں

ان کی حالت غیر ہوتی ہے۔مشاعرے کے انجام پر سب سے زیادہ بے لگام و بے ہنگم شاعر کو صاحبِ صدر کڑا پہنانے کی رسم ادا کریں گے۔مشاعرے کا بے باکانہ آغاز کے لئے پہلے میں ناچیز و حقیر بلکہ تقریباً فقیر آپ کی زد میں ہے۔جو دے اس کا بھی اور جو نہ دے اس کا تو واقعی بھلا ہے۔

ایک شاعر: مانگ کیا مانگتا ہے اے سائل نانہجار؟

انجام خطاوی: صاحب صدر سے اجازت---لیکن ناظرین مع غیر حاضرین! آج کے مشاعرے کی صدارت کے لئے بے ادب دُنیا میں جن کا ڈنکا بج رہا ہے وہ خود ہی جبراً صدارت کے لئے مصر ہیں اور سر دھنے نازل ہیں عالی جناب شاعرِ تن باز، احمق دراز لہٰذا اجازت کا فضول سا تکلف کئے بغیر اپنا کلام ٹھوکنا چاہتا ہوں۔

ایک شاعر: نازل ہو نازل ہو۔شوق سے ٹھوکیں تاکہ پھر دنیا آپ پر تھوکے۔

انجام خطاوی: عرض کیا ہے---

ہو سکے گا نہ ہم سے کوئی معاملہ
چاہے ناہید و نرگس یا ہو نائلہ

ایک شاعر: آج تو ساری مشوکاں داناں لے لیتا اے۔

دوسرا شاعر: بڑی اونچی فلم نکلے ہو۔

خان صاحب: خو چہ وئی وئی کنہ یہ تو بڑا شہ معلوم اوتی اے۔

انجام: نہ صرف شہ ہے بلکہ مات ہے۔آگے تو چلئے۔ہو سکے گا نہ---چاہے ناہید---

اِس قدر جھک گئے تیرے دیدار میں
اب تو باقی رہے گا نہ کچھ فاصلہ

خان صاحب: خو چہ یہ تو اَم لوگ سے بی آگے جکتی اے۔

ایک شاعر: واہ کیا جھکان ہے۔

انجام: آداب---انجام تو دیکھئے---

اب تو انجام کا بھی نہیں ڈر ہمیں
ہو گئی ہم سے کیسی خطا کا ملہ

ایک شاعر: واہ جی' تسی تے وڈے اشتیاری نکلے۔بلے بلے بھئی۔

انجام: آداب آداب جتنا داب سکے داب۔اب اس رسمِ کڑوی مشاعرے کا شاہی طمنچہ جس شاعرِ بے لگام کے منہ پر رکھنے جارہا ہوں وہ ہمیشہ سے تعارف کے محتاج ہی رہے ہیں بچپن سے آج تک کیونکہ بچپن میں اپنا نام ہی مشکل سے ادا کرتے تھے۔بڑے ہوئے تو بڑے مسائل پیدا ہوئے والدین کے لئے' بے چارے بھگت چکے ان کو گھوارے سے اپنی قبر تک' لہٰذا کوئی فرق نہیں پڑے گا میں ان کا نام لوں' نہ لوں وہ نازل ہوئے بغیر تو کسی پل چین سے نہیں رہ سکتے---مرزا ناک چنے چباوی۔ان کا تخلص کیا ہے یہ آج تک خود ان کی سمجھ نہ آیا۔بہرحال برداشت پر ہے ناز تو برداشت کیجئے۔

مرزا: صاحبِ صدر دن میں آپ چنے بیچتے ہیں۔تو سنئے---

ناکوں چنے چبواؤں گا محبوب کو ہر دَم
گر کر گلے لگاؤں گا محبوب کو ہر دَم

ایک شاعر: ابے کیا نالے میں گر پڑے تھے؟

دوسرا شاعر: نہیں' نالہ ان پر آگرا ہوگا۔

انجام: حدِ بے ادب' حدِ بے ادب ابھی ان کا کلام چل رہا ہے۔

مرزا: بندر نے بھی دکھلایا نہ ہو گا جو طویلہ
کرتب میں وہ دکھلاؤں گا محبوب کو ہر دَم

ایک شاعر: ابے اس کی دُم پر پیر رکھو۔دُم دبا دُم، دُم دبا دُم۔

مرزا: بھائی دُم نہیں' دَم پر۔شعر قرض ہے۔

ایک شاعر: کون سے بنک کا ہے؟

مرزا: جب قرض چڑھے گا میرے سر پر جو زیادہ
اچھی طرح نچواؤں گا محبوب کو ہر دَم

ایک شاعر: دُر فٹے منہ---!

مرزا: کیا آپ کے دل پر لگی جا کے،تو پھر لگائیں ٹھمکا۔

انجام: شاعرانِ بے لگام اپنی حدود کو سامنے رکھیں۔

مرزا: میری ہد ہد تو ہر وقت میرے سامنے ناچتی ہے کیونکہ میرا دروازہ اسکے سامنے ہی کھلتا ہے۔

انجام: مرزا آج تو اپنی ساری پولیں کھول رہے ہیں۔

مرزا: کیوں' کیا آپ کو بھی خطرہ ہے کہ کہیں آپ کی نہ کھل جائیں پولیں؟

انجام: بس بس میاں' نکل لے اب تو پتلی گلی سے---یہ تھے مرزا ناک چنے چباوی۔اب جگر، گردے، پھیپھڑے سنبھال کر بیٹھئے۔

ایک شاعر: کیا کسی قصائی کو بلایا ہے؟

انجام: اب آرہے ہیں حضرت کریلا نیم چڑھاوی

کریلا: اماں چڑھاوی نہیں، چڑھوی۔

انجام: اسے کہتے ہیں' کریلا وہ بھی نیم چڑھا۔ جناب کریلا نیم چڑھوی۔

کریلا: عرض کرے ہے کریلا، بغیر اجازت صدرِ مشاعرہ کیونکہ وہ تو اب ملنے سے رہی---

اب کیا چھپائیں آپ سے' پالے ہیں ایسے روگ
کہتے ہیں کریلے کو سبھی نیم چڑھا لوگ

ایک شاعر: ارے بھئی یہ مطلع ہے کہ مقطع؟

کریلا: ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔دراصل آج مطلع ابر آلود تھا تو یہ دونوں کا مرکب ہے اسے منقطع بھی کہہ سکتے ہیں' جاہل لوگ اسے مُنکا بھی بولتے ہیں۔

ایک شاعر کچھ زیادہ ہی نیم چڑھا ہے۔

خان: (نسوار دیتے ہوئے) خو چہ نسوار کاتی اے، بالکل اصل اے۔

کریلا: خان! ایسی چیزیں آپ کو ہی راس آسکتی ہیں۔ویسے بھی نسوار کا کریلے سے کیا میل؟---

ہم نے تو کمر باندھ لی محبوب کے آگے
چاہے رقیب کرتا پھرے دنیا بھر میں سوگ

ایک شاعر: واہ بھئی واہ، رقیب روسیاہ کو کیا چماٹ ماری ہے۔کریلے سے کون جیت سکتا ہے؟

کریلا: آداب، بہت زیادہ داب، (گھٹنا پکڑتے ہوئے) ہائے یہ درد کافی پرانا ہے۔

صاحبِ صدر! کیا آپ نے افیم چڑھائی ہے؟---شعر عرض ہے---

پیتا ہوں میں تو روز کریلے کا خود ہی جوس
انجام تو معلوم ہے' آغاز بھی ہے روگ

ایک شاعر: واہ بھئی واہ' کیا شیر مارا ہے۔ ببر شیر ہے۔ یہ آپ کا شیر ہے یا انجام کا؟

دوسرا شاعر: راج ببر کا بڑا بھائی لگتا ہے یہ تو---!

انجام: پیتا ہوں میں تو روز کریلے کا خود ہی جوس---جی ہاں' یہ تھے اپنے بے معنی کلام لئے کریلے وہ بھی نیم چڑھے۔ اب سلسلۂ کلام کو ساکت و جامد کرنے آرہی ہیں ایک بہت بُڈھیا اور انتہائی بے باک شاعرہ جنہیں آپ نے اکثر ریڈیو پر دیکھا اور ٹی وی، کیبل، اخبارات، رسائل و جرائد پر سونگھا ہوگا۔ نہایت چھچھورے، اوباش، تماش بین قسم کے شائقین جن کا شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا' ان کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لئے اپنا ندیدہ پن فخریہ طور پر ظاہر کرنے چلے آتے ہیں۔ ایک بار ان کے کسی سچے پرستار نے وفورِ جذبات سے بے قابو ہو کر بھری محفل میں ان کے گلے میں (رُکتے ہوئے) جوتوں کا ہار ڈال دیا تھا جس پر دنیائے ادب ابھی تک سکتے میں ہے اور آج تک فیصلہ نہیں کر پائی کہ یہ خود ساختہ شاعرہ ہیں، دیکھنے کی چیز ہیں یا بس یوں ہی اپنے گلے کا استعمال کرتی ہیں کیونکہ انکا گلا کافی کشادہ خوشحال ہے۔ وطنِ عزیز کے سارے ہی چینلز ان کی شاعری سے زیادہ ان کو اہمیت دیتے ہیں اور اس لئے یہ آپ کو ہر جگہ پڑی ملتی ہیں لہٰذا میں آپ کی برداشت کی داد دیتے ہوئے درمیان سے ہٹنے ہی میں عافیت سمجھتا ہوں۔ بڑے لشکارے و ناز و انداز سے آرہی ہیں محترمہ زہر آلودہ زہر!

زہر: آداب بجالاتی ہوں۔

سب بیک آواز: وعلیکم آداب۔

زہر: صاحبِ صدر! اگر ہوش میں ہیں تو شعر ملاحظہ ہو---

میرا جلوہ کہیں دیکھا، گلا ایسا کہیں دیکھا
میرا جوڑا کہیں دیکھا، ملا ایسا کہیں دیکھا

خان: (پھڑکتے ہوئے) وئی وئی، خوچہ بی بی جان! تم کیدر رہتا اے؟ کسم نسوار کا' ام نے ایسا تو کبی نہیں دیکا۔ ابی ام تو آپ کو دِکنا چاتی اے بوت ٹیم تک۔

زہر: آداب، ابھی نہیں۔ ذرا صبر سے کام لیجئے۔ ابھی نہیں۔

ایک شاعر: واقعی زہر ہو تو ایسا۔

زہر: آداب، ابھی نہیں، بہت آداب مگر ابھی نہیں۔ عرض کیا ہے جسے اکثر طول بھی دیتی رہتی ہوں، مزید بصد شوق ملاحظہ ہو---

زہر آلودہ سی نظریں لئے پھرتی ہوں دنیا میں
ستم اتنا کہیں دیکھا، برا ایسا کہیں دیکھا

ایک شاعر: واہ جی واہ' کیا ستم آپ نے یہ توڑا ہے؟

خان: خوچہ وئی وئی، اک ستم اور میری جان ابی ام باکی اے۔

دوسرا شاعر: کیا عمدہ کہا ہے، ایسا برا کون دیکھتا ہے؟

زہر: آداب' بہت آداب لیکن ذرا صبر سے کام لیں گے۔ آگے ملاحظہ ہو، مزید آگے دیکھیں۔ تھوڑی سی توجہ اور دیں مجھ پر۔

ایک شاعر: جی ہاں' ہمہ تن گوشت ہیں۔ ہم تو ٹکٹکی باندھ کر آئے ہیں۔

زہر: بچہ بچہ، بوڑھا بوڑھا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے لوگ تو سارے جانے ہیں

گل خان: خوچہ وئی وئی ام تو جانتی ہے۔ آپ امارا تاریف کرتا اے بی بی جان! لیکن کسی کو بولنا نہیں، امارا اورت بوت جلدی شک کرتا اے۔

دوسرا شاعر: واہ جی واہ' کیا زہر چڑھا ہے۔ تخلص بھی اور کلام بھی' اسی لئے آجکل خالص زہر کا کال پڑا ہے۔

زہر: آداب لیکن ذرا ٹھہر کر اطمینان سے---شعر ملاحظہ ہو---

پڑے رہتے ہیں سب ہی دھت میرے اشعار کو سن کر
زہر ایسا کہیں دیکھا، چڑھا ایسا کہیں دیکھا

یہ میں نے دوگنا مقطع کہا ہے۔ اس کو دو وکھایا دو مقطع کہتے ہیں جاہل اسے دو منکا کہتے ہیں۔ شاعری میں نت نئی اصناف داخل ہو رہی ہیں۔ صنفِ نازک و کرخت تو ہمیشہ سے رہی ہے' صنفِ درمیانہ بھی کافی اندر تک داخل ہے۔

ایک شاعر: واہ صاحب! جو بات ہے' زہر آلود ہے۔

انجام خطاوی: بے کل و بے چین ناظرین مع غیر حاظرین! ابھی یہ' رسم کڑوی مشاعرہ' جوں کا توں ہے، کہیں بھاگ گئے گا ہر گز نہیں ورنہ ہم مشاعرہ لے کر آپ کے گھر نازل ہو جائیں گے اور پورا کا پورا مشاعرہ آپ پر مسلط کر کے رہیں گے۔ آخر آپ کے ذوق کی قیمت بھی تو آپ ہی ادا کریں گے لہٰذا ہم آپ کے ساتھ ہیں بریک سے پہلے اور بعد بھی۔ اپنا بریک آئل لازمی چیک کرتے رہیں' کم ہو تو فوری ڈالیں ورنہ نتیجہ میں کلیجہ منہ کو آسکتا ہے' ڈھیشوں۔' کتا مارکہ' بریک آئل یاد رکھیں--- ڈھیشوں تابڑ توڑ تعمیراتی ادارہ پیش کرتا ہے چند نئے اور انہوں نے منصوبے، الدھڑام پلازہ، زمیں بوس ٹاور اور مہندم اسکوائر جیسے کامیاب شاہکاروں کے بعد سمندر پار سرمایہ کاروں کے لئے تیتر ٹاؤن میں تصوراتی پلاٹس اور خوابیدہ بنگلے جس میں آپ کے تیتر و بٹیر انتہائی عیش و آرام سے آخری سانسیں لے سکتے ہیں۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ آئے چوکھا۔ خرکار بینک کی کسی بھی شاخ پر لٹک کر بلیک میں قرعہ اندازی کا فارم آنکھ بند کر کے خریدیں اور آدھی رقم ڈوبنے کا غم نہ کریں اگر آپ کا قرعہ نہ نکلے کیونکہ اس طرح آدھی تو بچی۔ فالتو دولت کے یہی چونچلے ہیں اور بینک اسی طرح عوام کو لوٹنے کی خدمات مہیا کرتے ہیں۔ نہ پانی، نہ بجلی، نہ گیس، نہ ٹرانسپورٹ کا غم تو پھر سوچیں، زندگی کتنی پرسکون ہوگی۔

پیارے بے کل و بے چین ناظرین وغیر حاظرین! ویلکم بیک یعنی پچھلے دروازے سے خوش آمدید۔ آپ کے سامنے محوِ بے لگام ہیں اس وقت محترمہ زہر آلودہ زہر جو مشاعرے میں زہر گھولنے پر مکمل عبور رکھتی ہیں اور نہ جانے کب آپ کی زندگی میں زہر گھولنے میں کامیاب ہو جائیں۔

زہر: حد درجہ تعریف کا شکریہ---

پڑے ہوتے ہیں سب ہی دھت میرے اشعار کو سن کر
زہر ایسا کہیں دیکھا، چڑھا اتنا کہیں دیکھا

ایک شاعر: واہ جی' کیا زہر گھولا ہے۔ کہیں صدر صاحب فوت نہ ہو جائیں۔

دوسرا شاعر: کیوں بھئی ایمبولینس تو تیار ہے نا؟

زہر: اس قدر کمزور صدر کیوں لایا جاتا ہے؟ صدر تو وہ ہے جس پر کسی کے کلام کا اثر ہی نہ ہو۔ دنیا بک بک کرتی ہے تو کرے' صدر آرام سے پڑا سوتا رہے۔ جب صبح تنبو والا آ کر ٹھوکریں مارے تو پتہ چلے کہ صدر کیا ہوتا ہے۔

انجام: شکریہ! آپ نے صدر کی شان میں جو نقشہ بازی کی۔

زہر: آداب---لیکن ابھی نہیں' مشاعرے کے بعد۔

انجام: پیارے بے کل و بے چین ناظرین وغیر حاظرین! بے وقت کا بریک آ چکا ہے۔ اگر میں عورت ہوتا تو یہی کہتا کہ ہمارے ساتھ ہرگز نہ رہئے گا کیونکہ ہمارے علاقہ میں پانی نہیں آتا۔ ہم لوگ کولا سے نہاتے ہیں۔ جب ہماری ویگن یا بس کے پاس سے کوئی کولا ٹرک گزرے ہے تو ہم چند لیٹر بوتلیں آسانی سے مار لیں ہیں۔ آپ کی پڑوسن، دھوبن اور بھنگن کا پسندیدہ' دھوکا کولا شرو اڑ اڑاڑم--- پیارے بے کل و بے چین ناظرین وغیر حاظرین! آیئے وہیں سے ازار بند باندھیں جہاں سے ٹوٹا تھا۔ آپس کی بات ہے' مہنگائی کا دور ہے لہٰذ پیوند کاری سے کام چلتا ہے۔ اب آپ کی قوت برداشت کا کڑا امتحان ہے۔ اس مشاعرے کے بے حد بے لگام شاعر آپ پر کودنے کے لئے لنگوٹ کس چکے ہیں۔ یعنی استاد تیوری چڑھا پوری! ازل سے تکلیف میں ہیں۔ بچپن میں متعدد بار اسکول سے نکالے گئے اور یوں ان کا دل اس قسم کی لغویات سے اچاٹ ہو گیا۔ بس ذرا ان کے نام سے پکاریں' پھر دیکھیں کرشمہ۔

ایک شاعر: حضور! میں نے تو کرشمہ کا پورا بے باک کرشمہ دیکھا ہے۔

اُستاد تیوری: (چڑھاتے ہوئے) یہ مشاعرہ ہے یا مناظرہ---صاحبِ صدر! کلام پیش کروں یا نہ کروں؟

انجام: ضرور کریں۔

استاد:---

اس قدر میں نے کیا اس کا ذکر دُنیا سے
کہ ہے مغرور میری جور وفکرِ دُنیا سے

ایک شاعر: کیا فوت ہو گئیں؟

استاد: جی ہاں' ان کا نام تھا فوت بیگم ولد قضائے الٰہی---

اب وہ بھی ہیں آرام سے اور میں بھی ہوں آرام سے
کیا موت ڈرائے گی مجھے ان سے زیادہ
برسوں رہا ہے سامنا بس فوت ہی کے نام سے

ایک شاعر: واہ واہ' کیا تیوری چڑھائی ہے موت سے۔

خان: خوچہ وئی وئی کنا ام کو تمارا اورت کا بوت دک اوا بے چارا جوان مر گیا۔

استاد: لیکن وہ تو پہلے ہی سے فوت تھی---کلام تو سنئے! ابھی مجھے دوسرے مشاعرے میں صدارت کے لئے بھی جانا ہے سونے کے لئے کیونکہ صدر کو آخر تک سونا ہوتا ہے---

تذکرے ہوتے رہے اس کی بدمزاجی کے
فوت بیگم جو ہوئی میری، شکر، دُنیا سے

ایک شاعر: کیا غضب کا شیر ہے۔

خان: خوچہ کدر اے (جیب سے پستول نکال کر) ام بھی فیر کرتی اے۔

ایک شاعرہ: یہ آپ نے کس قسم کے لوگ بلا لئے ہیں مشاعرے میں---کیا یہ مشاعرہ چڑیا گھر میں ہے؟

ایک شاعرہ: آئندہ کے لئے خیال تو اچھا ہے۔

استاد: بھئی آگے سنیں گے یا میں چلوں؟

انجام: استاد! آپ اپنی تیوری چڑھائے رہیں اپنے کلام سمیت:

اُستاد: میں نے جب تیوری اپنی چڑھائی بیگم پر
اِس قدر بکنے لگی لے کر مکر دنیا سے

خان: خوچہ یہ مکر کیا اے' ام کو نہیں پتہ؟

استاد: آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں۔

دوسرا شاعر: کیا خوب ڈھونڈ نکالا ہے آپ نے اس بندے---!

خان: اوئے خوچہ کیا بکتی اے۔ مکروفریب تو مارا چوٹا باچا کا نام اے۔ ام نے سوچا' توڑا موڈرن نام اے۔

انجام: پیارے بے کل و بے چین ناظرین وغیر حاضرین! ابھی آپ نے موقع دیا استاد کو پوری تیوری چڑھانے کا۔ اب یہ آپ پر فیصلہ ہے کہ انہوں نے کہاں تک چڑھائی ہوئی ہے۔ یہ ٹن پارٹی کے سربراہ کے حیثیت سے معاشرے میں پھنکارے جاتے ہیں---اچھا جی' اب آپ لوگ دم بخود ہو جائیں' نہ جانے اب آپ کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے کیونکہ آپ کو نسوار سنگھانے آ رہے ہیں انتہائی بے لگام و ریشہ خطمی خوچہ خان گل قباچہ جنہیں بچپن سے شاعری کی بے نسبت نسوار زیادہ چڑھی ہے۔ یہ جس مشاعرے میں جاتے ہیں۔ اس کے اختتام پر فرش کو فینائل سے دھلوانا پڑتا ہے۔

خان: خوچہ ام آپ لوگ کی بوت مشکوک اے کہ آپ ام لوگ کا سنتی اے۔ ام آپ لوگ کو بولتی اے کہ ام لوگ جو لکتی ام لوگ کو خود سمجھ نہیں آتی۔

انجام: حضور' ارشاد ہو' یقیناً ہمارے بھی کچھ پلے نہیں پڑے گا۔

خان: خوچہ اس کا نام نہیں لو ام نے اس خانہ خراب ارشاد کا نوکری چوڑ دیا اے۔ امارا شیر دیکو---

خوچہ گر تم پٹان اوتی
چہ میں میربان اوتی

ایک شاعر: واہ خان صاحب خالص جرگہ کا شیر ہے۔

خان: اوخو آگے کا بی سنو---

میں تیرا جان لیتی
تو میرا جان اوتی
تو بی بی جان بنتی
میں تیرا خان اوتی

ایک شاعر: واہ خان کیا غضب کی اسٹوری ہے۔

خان: خوچہ جان' ابی تو کافی آگے چلتا اے---

توڑا بچہ زیادہ اوتی
بڑا خاندان اوتی

ایک شاعر: خان صاحب! ذرا ہلکا ہاتھ رکھیں۔

خان: خوچہ امارا کانی اے' کسی چڑی چاپ کا

نی---

کبی مجھ سے جھگڑا کرتی
تو بلائے جان اوتی
خوچہ گر تم پٹان اوتی
چہ میں میربان اوتی

ایک شاعر: واہ خان جی، خالص نسواری کلام ہے۔

انجام: پیارے بے کل و بے چین ناظرین بمع غیر حاضرین، اِس بے باک و بے لگام مشاعرے میں عجیب وغریب بولیاں سننے کو مل رہی ہیں۔ اب ہم ایسے شاعر کو دعوت دے رہے ہیں جنہیں بچہ بچہ جانتا ہے کیونکہ ان کا کلام نا قابلِ برداشت اور ان کی بری عالمی شہرت کے صلہ میں نا قابلِ نشر واشاعت قرار دیا جا چکا ہے۔ برداشت پر ہے ناز تو برداشت کیجئے۔ انہوں نے اپاچی قبائل کے لئے کئی قومی وملی نغمات تخلیق کئے بلکہ ان قبائل کی تھاپ پر انہیں رو رو کر گایا جنہیں اپاچی قبائل برداشت کر سکتے ہیں تو آپ کیوں نہیں۔ پہلی بار جب یہ اپاچی قبائل کے ہتھے چڑھے تو انہوں نے خوف کے مارے بے تحاشا چیخنا اور زار وقطار رونا شروع کر دیا جس کو اپاچی قبائل کی ملکہ نے نغمہ سمجھا اور اس طرح ان کی جان بچی اور انہیں عالمی شہرت بھی ملی--- تو ملاحظہ ہو اپاچی ایوارڈ یافتہ شاعر استاد عجیب بھونکوی!

استاد عجیب بھونکوی: صدر صاحب! آپ کے سرہانے اب میں بھونکوں کہ نہ بھونکوں؟

ایک شاعر: بھونکیں، بھونکیں، ضرور بھونکیں۔

استاد عجیب: میں نے بھونکا جو کبھی آپ نے سمجھا نہ کبھی
لاکھ بھونکا جو کبھی آپ نے، دیکھا نہ کبھی

ایک شاعر: واہ، کیا لاچاری ومجبوری ہے۔

دوسرا شاعر: صاحبِ صدر تو سوتے رہیں گے آپ
چاہے لاکھ بھونکیں ان کے سر پر۔

استاد عجیب: میرے بھونکنے پہ ہے موقوف یہ دل کی رونق
بھونک کر ٹوٹ گیا دل میرا سنبھلا نہ کبھی

ایک شاعر: واہ، کیا لگاتار اور لاجواب بھونکا ہے آپ کے دل نے۔

خان: خوچہ ام کو دیک کر بوت زیادہ بونکتی اے۔ امارا تو گلی سے گذرنا بی مشکل اے۔

استاد عجیب: شکر ہے آپ بھی سمجھتے ہیں--- مزید بھونکا ہے---

آپ گذریں کہ نہ گذریں میں سدا بھونکوں گا
کہ عجب بھونکنے کا کام یہ روکا نہ کبھی

انجام: واہ بھونکوی واہ، آپ نے تو بھونکنے کا عالمی ریکارڈ توڑ دیا۔

ایک شاعر: استاد بھونکوی! وہ اپاچی قبائل کا ایوارڈ یافتہ نغمہ گا کر سنا دیں جس نے آپ کو عالمی شہرت دی۔

استاد عجیب: اب میں بھونکوں کہ نہ بھونکوں۔

دوسرا شاعر: بھونکیں، بھونکیں، بھونکیں۔

استاد عجیب: اس وقت نہ وہ ماحول ہے نہ اپاچی آرکسٹرا، نہ ڈنڈوں کا سرکس، نہ ہی آگ کا الاؤ، نہ موت کا خوف ناک رقص اور پھر سنسر کی وجہ سے یہ مشاعرہ ختم کرنا پڑے گا۔ اپاچی سنسر بورڈ نے تو مجھے تین دن تک درخت سے باندھ کر الٹا لٹکا ہوا تھا اور تب انہیں میرا رونا چیخنا چلانا بھی گانا لگا۔

انجام: استاد عجیب بھونکوی صاحب! شاعری پہلے ہی آپ کے احسانات کے بوجھ تلے پس چکی ہے۔ لہٰذا آپ کا مزید احسان یہ ہوگا کہ آپ اپنا بوریا بستر سمیٹ لیں کیونکہ وقت کی قلت نے ہمیں کافی ذلیل وخوار کر کے رکھ دیا ہے--- پیارے بے کل و بے چین ناظرین وغیر حاظرین! انتہائی بے لگام شعرائے بے نیل ومرام نے کر دیا ہے جینا حرام جو اس رسم کڑوی مشاعرے میں بلا مدعو کئے مسلط ہیں اور وقت ہے کہ ہمیں آڑے ہاتھوں لے رہا ہے لیکن یہ مشاعرہ اپنے بدصورت وبھونڈے اختتام کی طرف محوِ خرام ہے۔ اب میں صاحب صدر کی اجازت کے بغیر ایک بے سرے و بے لگام شاعر کو پیش کر رہا ہوں جنہیں یہ خبط سوار ہے کہ وہ گلوکار شاعر ہیں جو انکی وجہ شہرت ہے۔ ہمارے ملک کے میڈیا ساز جو بے ڈھنگے اور بے وقت کا راگ الاپنے میں لاثانی ہیں انہوں نے ایسے ہی بے سرے اور نام نہاد گلوکاروں کو میڈیا سے جکڑا ہوا ہے۔ دراصل میڈیا سازوں کو خود ہی علم نہیں کہ گائیکی کیا ہے۔ وہ چیخنے، چلانے، اچھلنے، کودنے اور بلبلانے کو گلوکاری سمجھتے ہیں۔ جو جتنا بے سرا اور بھونڈا ہے اس کو اتنا ہی بڑا فنکار ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بہرحال، دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔ اب ہم مجبوراً اس مشاعرے کا شاہی طمنچہ علامہ سردھنوی کے منہ سے لگاتے ہیں۔

علامہ: بغیر عرض کئے کلام حاضر ہے کیونکہ میں کوئی منگتا فقیر نہیں ہوں کہ آپ جیسے کنگلے شعرا وشائقین کے سامنے عرض کروں کہ عرض ہے، یہ گلہ نہیں، سمجھا ہے جتنا آپ نے، اتنا تو بے سرا نہیں۔ آپ جیسے بے سرے شائقین نے ہی مجھے علامہ سردھنوی بنا ڈالا ہے ورنہ ہم بھی ہوتے کام کے--- سونگھیئے اور سر دھنئے---

ہم سے گایا نہ گیا، ان سے بجایا نہ گیا
ایک بھی سر کوئی ہم سے تو لگایا نہ گیا

ایک شاعر: واجی، کی کمال کیتا اے، ایویں دھمال کیتا اے۔

خان: خوچہ ام کو بولوام تو بوت اچھی طرح بجا سکتی اے۔ کبی ٹرائی کے لئے ام تیار اے۔

علامہ: حضور اب تک جنہوں نے بجایا ہے تو سمجھیں کہ گانے کا باجا تو بج چکا اچھی طرح اب کیا کسر باقی ہے۔ آگے تو سر دُھنئے---

یوں ہی بدنام رہے ہم تو سدا گانے میں
لے اٹھانی تھی جہاں، ہم سے اٹھایا نہ گیا

ایک شاعر: واہ صاحب، واہ کیا لے ہے اور کیا اٹھانا ہے۔

خان: خوچہ ام بولتی اے کس کو کب اور کہاں سے اٹانا اے، امارے کو بولوام کام بالکل پکا کرتی اے۔

انجام: خان صاحب یہ مشاعرہ تو آپ ہی نے اٹھایا ہے جب تک آپ جیسے بے لگام و بے ہنگم شاعر نازل نہ ہوتے تو شاعری بے چاری ہمیشہ بری طرح شرمائی اور نادم سی رہتی۔

خان: خوچہ ام لوگ کو شرمانا بوت اچا لگتی اے لیکن بڑا اپسوس کا بات اے کہ ام لوگ یہ کام نئیں جانتی اے، اگر کوئی شرمائی ام کو سیکا تا اے تو ام اس کا بوت مشکوک اوگی۔

علامہ: حضور! کیوں آپ ہمیں مزید شرمسار کرتے ہیں---آگے سونگھئے وسر دھنئے---

دھکے دیتے رہے ہم اپنی ہی دھن میں دھن کو
شور جتنا بھی کیا' اور مچایا نہ گیا

خان: خوچہ تم لوگ امارا کام کیوں کرتی اے۔ جب دِکے کا بات آتی اے تو امیشہ یادرا کو ام تو اس کا ٹیکیداری کرتی اے۔ خوچہ' ام کو بولو۔

انجام: ہم سے گایا نہ گیا، ان سے بجایا نہ گیا۔ یہ تھے انتہائی بے سرے وبے ہنگم گلوکار نما شاعر جناب علامہ سردھنوی اور ان کے بعد صاحب صدر کو بیدار کرنے کے لئے طمنچہ مارنے سے پہلے اپنے پیارے وطن کی مایہ ناز ملکہء شاعری کو ہم نازل ہونے کی بھیک دیتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمتِ بے لگام کی سند عالمی مشاعروں میں گم ہو چکی ہے۔ جب بھی اسے تلاش کرنے کی کاوش ہوئی تو شائقین نے ہمیشہ منہ کی کھائی۔ انہوں نے اپنا تن، اپنا من، اپنا برتن، اپنا سالن غرض یہ کہ اپنا سبھی کچھ خودفراموشی کی کیفیت میں اپنی بے ہنگم شاعری کے سپرد کر دیا۔ یہاں تک نوبت آ چکی ہے کہ انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ یہ کس وقت کہاں ہیں۔ غالباً ان کو اس شعر کے تصوّر میں محسوس کیا جا سکتا ہے---

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر تو گھونسلہ چاہے
کہ بندہ خاک سے بن کر ہی تو تیار ہوتا ہے

بصد ذلت وخواری ہم انہیں پیش کرنے کے لئے خود انتہائی مجبور و بے بس پاتے ہیں کیونکہ ان کے بے شمار و بے لگام تابڑ توڑ قسم کے دیوان یکے بعد دیگرے ردی فروشوں کے ٹھڑوں پر بآسانی دستیاب ہیں جنہوں نے دنیائے بے ادب میں کہرام مچا دیا ہے۔ گنجی مُند والے نقادوں نے انہیں بے تحاشہ اپنے سروں پہ چڑھانے کی ان گنت ناکام کوششیں کیں اور اب یہ عالم ہے کہ کتب فروش خود کو ردی فروش کہلانے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ جگر، پھیپھڑے وگردے سنبھالیں کہ آپ کا جینا حرام کرنے نازل ہوا چاہتی ہیں اور جو اپنی بیمار روش کی بنا پر ہر جگہ نازل ہونا اپنی شان سمجھتی ہیں محترمہ نازک اندام بیماروی!

نازک: آداب بجواتی ہوں، نہایت فخر ہے کہ مجھے ذہنی بیماری نے اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ میری بیماری کو آپ میری شاعری سمجھتے ہیں۔ یہ آپ سب کی گھٹیا محبت کا ثبوت ہے جسے میں تازندگی سرمایۂ پھٹکار محسوس کرتی ہوں۔ میں بچپن میں جانوروں کی شاعرہ رہ چکی ہوں۔ آج آپ کے چرنوں میں اپنی بدنام زمانہ غزل پیش کرتی ہوں جسے زمانہ شاعری کی بہتی ہوئی ناک کہتا پھرتا ہے۔ شاید یہ بے رومال زمانہ ہے---

خود بخود پھیل گئی بات اس انگڑائی کی
اس نے کتے کی طرح میری پذیرائی کی

ایک شاعر: (قدموں میں لوٹنے کی کوشش میں) واہ جی واہ' ہیں کی کراں۔ میری تے کتے جئی بھی اوقات نئیں سی۔

دوسرا شاعر: واہ وا واہ وا' دوبرر دوبرر پھینکیں۔ یہ انگڑائی تھی یا گگلی۔

نازک: آداب بجواتی ہوں جب موقع ملے۔ خود بخود پھیل......اس نے کتے......اور مزید ملاحظہ فرمائیں---

جب بھی کیچڑ میں وہ لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے بڑھیا میرے اس نائی کی

خان: خوچہ وئی وئی! یہ کون سا نائی اے' ام اس کا اجامت بنائے گی۔

ایک شاعر: یہ سب کیچڑ کی کرامات ہیں۔

نازک: بس یہی بات شاید آپ کے علم میں نہ تھی۔ جب بھی کیچڑ---بس یہی بات---! آداب بجواتی ہوں۔ مجھے انتہائی بے شرمی وڈھٹائی کے ساتھ یہ کلام پیش کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اور کام ہم سے نہ ہو سکے گا۔ مزید پیش کرتی ہوں---

میں اس کا نام نہ لوں، لوگ بو سے پہچانیں
بات کہنے کی نہیں، بات ہے قصائی کی

ایک شاعر: واہ واہ مشاعرہ تو اس کلام پر لٹ گیا۔

نازک: دراصل بات ہی کچھ ایسی ہے کہ مشکل سے کہہ پائی ہوں۔ کیا خیال ہے کہ اس کا نام لوں یا نہ لوں؟

خان: خوچہ بی بی جان! تم اس کا نام ضرور لو۔ کسم نسوار کا' اس کو نئیں چوڑے گی۔

ایک شاعر: خان! صبر سے کام لیں ایسا وقت کسی پہ بھی آ سکتا ہے۔

انجام: محترمہ! اب اس کا نام لینے کی کیا ضرورت ہے آپ کی بات ہم جان چکے ہیں۔ بس اب تو آپ صرف اجازت لیں کیونکہ یہ بات اس مشاعرے کی انتہا کو جا پہنچی ہے جہاں ہمیں خود لڑھکتے ہوئے خوابیدہ صدرِ مشاعرہ کو ہڑکانا پڑے گا۔ پیارے بے کل و بے چین ناظرین بمع غیر حاظرین! اب ہم سب مل کر صاحبِ صدر کو بیدار کراتے ہیں اور اس رسمِ کڑوی مشاعرے کا اختتامی ٹوکرہ ان کے سر پر رکھتے ہیں۔ اب ان کی تعریف کرنا کچھ عجیب سا لگتا ہے کیونکہ یہ انتہائی یتیم ومسکین صورت مخلوق ہوتی ہے جو اہل مشاعرہ کے بے رحم وکرم پر اپنی رات کالی کرتی ہے۔ یہ اپنے گھر سے تو پہلے ہی نکالے جا چکے ہوتے ہیں اور جب صبح دم واپس اپنے علاقے میں گھستے ہیں تو محلہ داروں کو ان پر جمع دار ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ اب ان کی مزید کیا تعریف کروں، ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔ جنابِ احمق دراز نے اپنی سطحی و بے ہنگم شاعری سے شعرا کے ہجوم میں کھلبلی سی مچا دی ہے۔ ان کے ناقدین میں تو جیسے صفِ ماتم بچھ گئی ہے اور کتب فروش حیران ہیں کہ ردی فروش ان سے آگے نکل گیا۔ میڈیا کے کارندے ان کے سامنے کشکول لئے پھرتے ہیں جیسا کہ مزاروں پر دیکھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ آنکھ بچا کر صاحبِ صدر تعویذ گنڈوں کا کام بھی کرتے ہوں لیکن سانوں کی لینا' ہمیں تو ان کی شاعری سے لچر پن کی حد تک عشق مجازی ہے---آیئے ہم سب مل کر زور لگائیں انہیں بیدار کرنے کے لئے۔

ایک شاعر: صاحبِ صدر! سحری کا وقت ہو گیا ہے۔ خاموش و با ادب اٹھ جائیں اور اپنا کلام ذہن پر وارد کرنے کی سوچیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ

کلام سوچیں اور ہم سب سوچکیں۔
انجام: کیا اچھا کہا ہے، بس جی بس' صدر صاحب! اب اٹھ جائیے ورنہ کرین منگوانی پڑے گی۔
احمق دراز: (آنکھیں ملتے ہوئے اٹھتے ہیں) آں ہوں'ہاں۔ میں کہاں ہوں' کیا مشاعرہ ابھی چالو ہے؟ نہایت کوفت محسوس ہوتی ہے جب مجھے نیند سے اغوا کیا جاتا ہے اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ صدارت کا طوق بھی گلے میں پڑا ہوتا ہے۔ ایسے میں حافظہ ہمیں داغ مفارقت دے جاتا ہے۔ بہرحال---

جو بچا تھا وہ لٹانے کے لئے آئے ہیں
آخری گیت سنانے کے لئے آئے ہیں

شیر ملاحظہ ہو۔
شعراء: ارشاد' ارشاد---خطا فرمایئے' خطا فرمایئے۔
خان: خوچہ اس ارشاد کا نام مٹیں لو'ام نے اس کا نوکری چھوڑ دیا اے۔
صدر: پٹ کے یوں ہم نے گال سہلائے
جیسے برکھا کی رت چلی آئے
شعرا: واہ صاب کیا پٹائی کی رت ہے۔
صدر: میں آپ کی داد کے ہرگز لائق نہیں کیونکہ پٹنا تو میرا محبوب مشغلہ ہے---شیر حاضر ہے---

رازداری سی رازداری ہے
مانگ کر ہم ادھار پچھتائے

خان: خوچہ ام لوگ کس لئے اے۔ جب بولو آپ کو سود پر اُدار دیتی اے۔
صدر: دراصل بچپن سے میں حساب میں کمزور ہوں اور جسمانی طور پر بھی---شیر سونگھئے---

کتنے اشعار ہم نے چوری کئے
پھر بھی احمق دراز کہلائے

انجام: واہ' کیا سچا شعر ہے۔ اعتراف جرم ہو تو ایسا کہ بھری محفل میں۔
صدر: جی ہاں' سچ تو وہ ہے جو سر چڑھ کے بولے۔ شیر پیش ہے---

اب اجازت ہی مانگی ہے مجھے
بس صدارت کو آج بھر پائے

انجام: (شعرا کا شور اور کھڑے ہو جانا دیکھ کر) تشریف کا ٹوکرہ ابھی یہی دھرہ رہنے دیں۔ ابھی رسم کڑوی باقی ہے۔ ہم سب اعلان کے منتظر ہیں کہ صاحب صدر نے نیند میں غوطہ زنی کرتے ہوئے کیا فیصلہ کیا کہ کڑا کس شاعر کو پہنایا جائے گا۔
صدر: اس رسم کڑوی میں 'کڑا' کچھ الہامی کیفیت کا حامل ہے اور نیند میں مجھے الہام ہوا ہے کہ یہ کڑا کس کو پہنایا جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان پر کیا گذرتی ہے جنہیں آج یہ کڑا پہننا پڑے گا۔ یقیناً ان پر یہ نہایت کڑا وقت ہے۔ بہرحال کڑا تو کڑا ہے اور ہمارے سامنے ہی پڑا ہے اور چاہے وہ لاکھ چڑھائیں تیوری، مگر آج تو سب کے سامنے پہنایا جائے کڑا استاد تیوری چڑھاپوری کو۔
استاد تیوری: (شور سنکر نہایت غصہ کے عالم میں) یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ بھری محفل میں خواتین کے سامنے آپ ہمیں یعنی استاد تیوری چڑھاپوری کو کڑا پہنائیں۔ آخر یہ نامراد خیال آپ کے ذہنوں میں آیا کس طرح؟ ہمیں تو ویسے بھی ایک مشاعرے کی صدارت کرنے کی جلدی ہے۔
انجام: حضور محترم (استاد تیوری سے) آپ جیسے بے لگام و بے ہنگم شاعر کا ہی یہ حق ہے کہ آج کی رسم کڑوی کا دولہا آپ ہی کو بنایا جائے کیونکہ آپ کی بیگم بھی فوت ہو چکی ہیں۔ اب صدر صاحب کے فیصلہ کے مطابق یہ کڑا آپ ہی کو پہنایا جائے گا۔
استاد تیوری: صاحب صدر نے یہ فیصلہ کس بنیاد پر صادر فرمایا ہے کیونکہ تمام وقت تو نیند میں غلطاں تھے۔
انجام: آپ کو صاحب صدر کا یہ فیصلہ ماننا ہی ہو گا۔ یہ کڑا اب صرف آپ ہی پر پڑا۔
استاد تیوری: ہمیں یہ فیصلہ ہرگز قبول نہیں۔ اس لئے ہم یہ کڑا بخوشی خان گل قباچہ کی نذر کرتے ہیں اور اجازت لیتے ہیں۔ ہمیں زیادہ ذلت بھی راس نہیں آتی۔ (یہ کہتے ہوئے باہر نکلتے ہیں)۔
خان: اوئے خوچہ کس کا مجال اے جو خان گل کو ''کڑا'' پہنانے کی اِمت کرتی اے۔ خوچہ ام خان کا باچا خان گل اے۔ یہ امارا خاندان، امارا براداری کا عزت کا سوال اے۔
انجام: خان صاحب! یہ صرف آپ کے لئے نہیں بلکہ ہم سب کے لئے آج کے رسم کڑوی مشاعرے کا سب سے بڑا ایوارڈ ہے جو آپ کو دیا جا رہا ہے۔
خان: ایواد میواڈ کو ام مٹیں جانتی۔ یہ امارا برادری کا معاملہ اے'ام اپنا جرگہ کا اجازت کا بغیر کوئی ذلیل کام مٹیں کرے گی۔
انجام: پیارے بے کل و بے چین ناظرین بمع غیر حاظرین! آپ کے سامنے یہ کس قدر ہولناک سین چل رہا ہے یعنی کتنی بھرپور توجہ وانہماک سے ہمارے وطن کے انتہائی بے لگام و بے ہنگم و بے ہودہ متشاعروں کے لئے یہ رسم کڑوی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا اور اس کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ غالباً یہی انجام ہوتا ہے دل لگانے کا۔ خیر اب یہ کڑا کسی نہ کسی کو تو پہننا ہی پڑے گا۔
ایک شاعر: ایسا کریں کہ آپ خود ہی یہ کڑا پہن کر اپنے انجام کو پہنچ جائیں۔
انجام: پیارے بے کل و بے چین ناظرین بمع غیر حاظرین! میری تجویز یہ ہے کہ کیوں نہ ہم سب مل کر یہ کڑا صدر کو ہی پیش کریں کیونکہ یہ بیہودہ نتیجہ بھی انہیں کا اخذ کردہ ہے اور یہ بخوبی آپ کے علم میں ہے کہ ایسے بے ہنگم مشاعرہ کو برداشت کرنا بھی تو صدر پر ایک کڑا وقت ہے۔ تو کڑے پر کڑا کیسا پڑا کہ ہو گیا جوڑا کڑا---لہٰذا آپ سب کی پرزور تائید پر ہم مل کر یہ کڑا صدر صاحب کو پہناتے ہیں۔ نیند میں انہیں کیا پتہ چلے گا کہ انہیں کیا پہنایا گیا، پتہ چلے گا ان کے محلہ داروں اور اہلِ خانہ کو۔ محلّہ دار تو انہیں تیسری مخلوق سمجھیں گے اور اہلِ خانہ تو انہیں پہلے ہی سے دماغی عارضہ کا شکار سمجھتے ہیں۔ تو آیئے صدر کو نیند کی حالت میں کڑا پہنائیں (کڑا پہناتے ہوئے) رسمِ کڑوی زندہ باد اور اہلِ مشاعرہ یہ ہے انجام مشاعرہ' یار زندہ' دُرگت باقی!

☆☆

☆ عمران قریشی

بعد مرنے کے کیا ہوگا

اِس دِن بھلا چنگا بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا اچانک فون آ گیا کہ ایک دوست کے والد محترم انتقال کر گئے ہیں۔ ہمارے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے اس لئے نہیں کہ ان کے والد محترم کو ہم نے مارا تھا بلکہ صرف اور صرف اس لئے کہ اب ہمیں افسوس کے لئے جانا پڑے گا۔ یوں تو انتقال بذات خود کوئی اچھا واقعہ نہیں مگر ہماری تو جان پر بن جاتی ہے۔ خدانخواستہ اس لئے نہیں کہ ہمیں انسان سے بہت محبت ہے یا پھر ہم کسی کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے یا ہم بڑے نرم دل واقعی ہوئے ہیں بلکہ اس میں فوت ہونے والے سے زیادہ دخل ہماری نااہلی کا ہے کہ ہمیں آج تک وہ طریقہ نہیں آیا جس سے مناسب طریقے سے افسوس کر سکیں کیونکہ مرنے والے نے مر کے کوئی چھوٹا کام نہیں کیا ہوتا لہٰذا یہ لازم ہو جاتا ہے کہ تعزیت بھی مناسب اور اچھے الفاظ میں کی جائے اس لئے ہم فوتگی سے زیادہ شادی پر جانا خوشی سے قبول کر لیتے ہیں۔ گو کہ شادی بھی جنازے کی ایک جدید قسم ہے، اگر آپ اسے نیم جنازہ بھی کہہ لیں تو بے جا نہ ہوگا۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ یہاں میت گھوڑے یا گاڑی پر ہوتی ہے۔ دولہا اس دن خود نہاتا ہے جبکہ میت کو نہلانا پڑتا ہے۔ یار دوست اور عزیز احباب وہاں بھی پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ لوگ کلمہ شہادت کی بجائے گولے اور پٹاخے کی آوازوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ خوش گپیاں اور چہلیں کرتے ہیں اور پیٹوں پر ہاتھ پھیر پھیر کے روٹی کھلنے کا انتظار کرتے ہیں۔ دونوں جگہوں پر ایک عدد مولوی کا عمل دخل بھی لازمی ہے جبکہ منہ دکھائی کی رسم بھی دونوں موقعوں پر ہوتی ہے۔ حساب وہاں بھی ہوتا ہے اور یہاں بھی مگر شادی کے چند سالوں بعد۔ خوانخواستہ میرا یہ ہرگز مقصد نہیں ہے کہ شادی اور موت کے درمیان موازنہ کیا جائے یا پھر دونوں کے درمیان کوئی حد فاضل متعین کروں اور نہ ہی اس احقر کی یہ کوشش ہے کہ لوگ شادی سے زیادہ مرجانے کو ترجیح دیں۔ یہ ناچیز تو شادی سے بھی اتنا ہی ڈرتا ہے جتنا موت سے۔ میرے لئے تو یہ دونوں فعل کچھ ناپسندیدہ سے ہیں۔ یہ سب باتیں تو ایک جملہ معترضہ تھا جو یونہی راہ چلتے چلتے درمیان میں آ گئیں۔ اگر ان سے کسی کا بھلا ہوتا ہے تو قارئین کا کیا جاتا ہے۔

جی، تو میں اب اپنے اصل موضوع کی طرف واپس آتا ہوں کہ مجھ میں اظہار تعزیت کا بہت فقدان ہے۔ شادی کا ذکر اس لئے کر دیا کہ کم از کم وہاں تعزیت تو نہیں کرنی پڑتی۔ یہ کام ہمارے لئے کتنا جان لیوا ہے، اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم کسی کو مرنے ہی نہ دیتے، اگلا لاکھ چاہے جتنی مرضی مرنے کی کوشش کرے۔ ہم تو عزیزوں اور دوست احباب میں فوتگی کو اپنے خلاف سازش گردانتے ہیں اور اکثر اسی امکان کے پیش نظر ان کو صحت مند رہنے کے ٹوٹکوں اور دعاؤں سے نوازتے رہتے ہیں۔ اگر اس کے باوجود یا ہمارے بتائے ہوئے ٹوٹکوں کے باعث فوتگی ہو بھی جائے تو اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ ہمیں وہاں نہ جانا پڑے۔ اس لئے نہیں کہ ہم نے مرنے والے سے کوئی قرض لے رکھا ہوتا ہے، وجہ ہے تو وہی ہے کہ ہمیں افسوس کرنا نہیں آتا۔ ایسے موقع پر ہم اظہار ہمدردی سے بری طرح نابلد ہیں۔ انسان کسی کو گلے لگا کر کہے بھی تو کیا؟ تسلی دے تو کیسے؟ وہ غمگین شکل لائیں بھی تو کہاں سے؟

ایک تو ہماری یہ کمزوری اور اوپر سے قریبی دوست کے والد کی موت۔ عجیب شش و پنج کا عالم تھا کہ جائیں یا نہ جائیں۔ گھر والوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے بغیر فیس کے مشورے سے نوازتے ہوئے کہا کہ شادی پر انسان جائے نہ جائے مگر موت پر ضرور پہنچنا چاہئے۔ شادیاں تو ہوتی رہتی ہیں مگر موت بار بار نہیں آتی۔ گھر والوں کے اس استدلال پر بے دریغ ایمان لانے کو جی چاہتا تھا۔ اوپر سے یہ بھی ارشاد ہوا کہ کسی کا دکھ بانٹنا بھی عین عبادت ہے۔ یہ جان کر گھر والوں کی ذہنیت پر دکھ ہوا کہ ان کی ہمدردیاں بجائے میرے ساتھ ہونے کے مرحوم کے ساتھ ہیں۔ یوں بھی اگر دیکھا جائے تو دکھ کوئی

ریوڑیاں تو نہیں ہے کہ انہیں بانٹ لیا جائے۔ گھر والوں نے نہ صرف مشورے سے نوازا بلکہ ساتھ میں ایک جامع اور مفصل لیکچر کا اہتمام بھی کیا۔ جس میں میری سماجی اور معاشرتی پہلوؤں میں عدم دلچسپی پر روشنی ڈالی گئی۔ آخر میں یہ قرارداد بھی پاس کی گئی کہ میں دنیا داری کی کوئی تمیز نہیں رکھتا اور ایک دنیاوی سی رسم پوری کرنے سے یوں ڈر رہا ہوں جیسے مجھے محاذِ جنگ پہ بھیجا جا رہا ہے۔ لیکچر کے اختتامیے میں مجھے مرد بننے کی تلقین کی گئی کہ ''مرد بنو مرد---'' یہ آخری جملہ میری دم توڑتی مردانگی پر ضرب کاری ثابت ہوا اور اسی لئے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم تعزیت کے لئے ضرور جائیں گے' چاہے مرحوم کے سامنے ہماری سبکی ہو جائے۔

کمرے میں آ کر تعزیت کا متن سوچنے لگے کہ بات کیسے شروع کی جائے اور کیسے ختم کی جائے تا کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ دکھ سمویا جا سکے مگر یہ کوشش لاحاصل رہی۔ خفگی میں اپنا ہی ہونٹ کاٹ کھایا اور دانت کچکچاتے ہوئے ان ادیبوں پر خوب لعن طعن کی جنہوں نے آج تلک ایسے دقیق موضوع پر کوئی کتاب مرتب نہیں کی۔ اب آپ خود ہی ملاحظہ کیجئے کہ کیسے چھوٹے چھوٹے موضوع پر کتابیں موجود ہیں جو ہم اپنی آنکھوں سے اکثر بکسٹالوں پر دیکھ چکے ہیں۔ نرسوں کے لطیفے' ڈاکٹروں کے لطیفے' گھریلو چٹکلے' کھانا پکانے کی ترکیبیں' موٹاپا کم کیجئے' میرج گائیڈ وغیرہ وغیرہ۔ مگر آج تک کسی نے یہ مزاحمت گوارا نہیں کی کہ تعزیت نامے کے عنوان سے کوئی کتاب نہ سہی کتابچہ ہی لکھ دے تا کہ تعزیت کنندگان کو اظہارِ تعزیت میں آسانی ہو اور میرے جیسا شخص اپنی پسند کی تعزیت نکالے' ایک دو مرتبہ اسے دوہرائے اور پھر سوگوران کے گلے لگ کے جوں کی توں ان کے کان میں انڈیل دے۔ یا پھر ہماری تعلیمی گائیڈوں کی طرز پر کوئی کتاب ہو۔ مثلاً گائیڈ ٹو تعزیت یا پھر ''میک تعزیت ایزی''۔ کتاب کا نام چاہے انگریزی میں ہو یا اُردو میں' بس تعزیتیں معیاری ہونی چاہئیں۔

اَب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا کہ بذاتِ خود ہی ہمت کرنی پڑے گی۔ ذہن پر زور دیا تو معلوم ہوا کہ افسوس کرنا اتنا مشکل بھی نہیں جتنا میں نے سمجھ رکھا ہے۔ چند جملے ہی تو بولنے ہیں جو اس سے پیشتر فوتگیوں پر ہم اکثر بزرگ اصحاب سے سن چکے تھے۔ مثلاً ''مجھے آپ کے والد کی وفات کا سن کے نہایت افسوس ہوا بڑے نفیس اور ملنسار انسان تھے''--- بہت افسوس ہوا ہمت سے کام لیں' سب کو ایک دن چلے جانا ہے۔ بس اس کا بلاوا تھا آ گیا--- ''کل تک تو بھلے چنگے تھے۔ مجھے بازار میں ملے' کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ بس صبر کیجئے صبر'' --- ''بڑے مخلص اور خوش دل انسان تھے مگر موت کے سامنے کس کی چل سکتی ہے۔ اچھا ہوا چلتے پھرتے چلے گئے' کم از کم کسی کے محتاج تو نہیں ہوئے۔ اللہ کسی کا محتاج نہ کرے''--- ''اگر بیماری سے مرے ہوں تو کہہ دیجئے بس بیماری تو ایک بہانہ ہے جی ان کی آئی تھی چلے گئے۔ یہ تو چلو چلی کا میلہ ہے۔ صبر کریں اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کریں''--- ''اگر کوئی زیادہ پڑھا لکھا شخص ہو تو وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ شیکسپئر نے کیا خوب کہا ہے کہ یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب اداکار' ہر کوئی اپنا اپنا کردار ادا کرتا ہے اور چلا جاتا ہے''--- واہ--- واہ--- واہ میں تو یک دم اچھل پڑا۔ ایک تو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا اور اب یوں لگتا ہے جیسے ہم جدی پشتی یہی کام کرتے رہے ہیں۔ میں نے خود کو داد دی۔ دِل کو ایک طمانیت کا احساس ہوا کہ افسوس کرنا کوئی مشکل کام نہیں بس اس کے لئے کسی کا مرنا شرط ہے۔ تعزیت کے اظہار کے لئے الفاظ تو بے شک اکٹھے ہو گئے تھے مگر جب تک ساتھ میں شکل بھی گواہی نہ دے انسان کا جھوٹ صاف پکڑا جاتا ہے۔ شکل تو انسان کے جذبات کا آئینہ ہوتا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا شیشے کے آگے جا کھڑا ہوا۔ چند ایک غمگین سے پوز بنائے اور فیصلہ خود پہ چھوڑ دیا مگر اس واجبی سی شکل کے ساتھ کوئی بھی پوز میل نہ کھاتا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ دانستہ افسردگی طاری کی گئی ہے۔ پھر خیال آیا زبردستی سے کام نہ چلے گا معاً ذہن میں یہ خیال کوندا کہ جذبات کا تو براہ راست تعلق دماغ کے ساتھ ہے اور دماغ تو اپنے پاس بھی ہے۔ یہ خیال آتے ہی ذہن میں بدبو کے خیال کو تقویت دی مگر اس سے جو چہرے کے خدوخال وضع ہوئے' ان میں افسردگی کم اور گندگی زیادہ تھی ہاں البتہ کہیں کہیں ناگواری بھی پائی جاتی تھی اس چہرے سے تو کسی صورت بھی کام نہ چل سکتا تھا۔ اگر یہ چہرہ بنا کر میں وہاں چلا جاتا تو اس بات کا احتمال تھا کہ کوئی بھی تبخیرِ معدہ کا مریض یہ سمجھ کر خواہ مخواہ میں ندامت محسوس کرتا کہ میں اس خفیہ حرکت کو پا گیا ہوں۔ پھر یہ خیال کیا کہ میں مر گیا ہوں مگر سامنے آئینہ اس بات کی نفی کر رہا تھا لہٰذا شکل میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہ آ سکی۔ یقین مانیے عجیب مخمصے کا عالم تھا۔ پھر یہ سوچا کہ میں ایک شاعر ہوں اور میری محبوبہ مجھ سے بے وفائی کر کے چلی گئی ہے۔ اس فکر سے جو چہرہ حاصل ہوا گو کہ وہ کافی حد تک کسی مرگ پہ لے جانے کے قابل تھا مگر اس پر افسردگی اور غم سے زیادہ ندامت چھائی ہوئی تھی جیسے محبوبہ کو میں نے خود بھگایا ہے۔

قریب تھا کہ میں یہ مشق ترک کر دیتا کہ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور یہ تصور کرنے لگا کہ اب سے کچھ دیر بعد میری شادی ہونے والی ہے۔ یقین مانیے جب میں نے آنکھیں کھولیں تو چہرہ کچھ اس درجہ سوگوار تھا کہ میں خود گھبرا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے سر مقتل لا کھڑا کیا گیا ہے۔ یہ چہرہ تعزیت کے لئے ہر لحاظ سے موزوں تھا لہٰذا اس چہرے کو باہمی رضامندی سے منظور کر لیا گیا۔

واہ بھائی' واہ! آج تو تم نے ''ماہرین تعزیت'' کو بھی مات کر دیا ہے۔ میں نے قابلِ ستائش نظروں سے آئینہ میں خود کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ کام جسے

ہم ایک عرصہ سے ہوا سمجھتے آئے، آج رائی کا پہاڑ ثابت ہوا۔ یہ بھی خیال آیا کہ دوست کے یہ والد محترم آج سے چند سال پہلے کیوں نہ انتقال کر گئے۔ پھر اپنی نادانی پر خود ہی ہنسی آئی کہ کیا واہیات سوچ ہے۔ آخر میں مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کی کہ جن کی وجہ سے آج مجھے یہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

تیاری مکمل ہو جانے کے بعد امتحان گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ سارا رستہ ذہن میں تعزیتی کلمات دہراتا رہا مبادا کہیں وہاں پہنچ کر بھول نہ جاؤں۔

مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہاں پہنچنے تک مجھے ہر چیز حرف بہ حرف یاد تھی۔ بڑے دروازے کے ساتھ ہی ایک بڑی سی الف لیلوی طرز کی دری بچھی ہوئی تھی جو شاید کسی زمانے میں اڑتی ہو گی مگر اب بڑے بڑے چھیدوں کے باعث صرف پھڑ پھڑا کر ہی تسکین کر لیتی تھی۔ دری پر چند لوگ پاس پکتی دیگ پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے۔ میں میلے میں گم شدہ بچوں کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ دراصل میں کوئی شناسا چہرہ دیکھ رہا تھا کہ جس کو اپنا یاد کیا ہوا سبق سنا سکوں مگر یہاں تو کوئی نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ میرے کندھے پر کسی نے دھیرے سے ہاتھ رکھا، مڑ کے دیکھا تو میرے دوست کا چھوٹا بھائی کھڑا یوں مجھے دیکھ رہا تھا کہ جیسے ان کے باپ کو میں نے ہی مارا ہے۔ میرے کچھ سمجھنے یا بولنے سے پہلے وہ مجھ سے لپٹ گیا اور اپنی تھوتھنی میری گردن کے قریب گھسیڑتے ہوئے اس زور سے دھاڑا کہ میں اندر تک لرز کے رہ گیا۔ یاد کیے ہوئے تمام الفاظ کرائے کے بدمعاشوں کی طرح مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ اب اپنی تھوتھنی میری گردن سے لگائے سل زدہ پٹاخوں کی طرح ٹھس ٹھس کرنے میں مصروف تھا۔ یقین مانیے اس کی اسی حرکت سے ہمیں گدگدی سی محسوس ہو رہی تھی اور مزاج قہقہے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ ایسے مناظر ہم اکثر انڈین فلموں میں ہیرو اور ہیروئن کے درمیان دیکھ چکے تھے جو اگر پاکستان میں ہوتے تو سنسر بورڈ والوں کی دسترس سے کسی طور بھی نہ بچ پاتے۔ ہم نے قہقہے کو دباتے ہوئے اسے تسلی دی اور تعزیت کے لئے منتشر الفاظ دوبارہ سے یکجا کرنے لگے۔

''صبر کرو صبر۔۔۔اس کی یہی مرضی تھی۔۔۔اس کی دی ہوئی چیز تھی، اس نے واپس لے لی۔۔۔اللہ اور دے گا، صبر کرو صبر۔''

اس نے مجھے اپنے آپ سے یکلخت جدا کرتے ہوئے حیرانی سے دیکھا۔ پھر شاید میرے آخری الفاظ کو اپنی ثقل سماعت کی خرابی جان کر پھر مجھے یوں اپنے سینے سے لگا لیا جیسے مائیں اپنے شیر خوار بچے کو ڈکار دلوانے کے لئے لگاتی ہیں۔

''یا خدا! یہ ہم کیا بکواس کر رہے تھے۔''

میں نے دل میں سوچا۔ اس کمبخت کو بھی کس نے کہا تھا کہ یوں گلے آن پڑے۔ ساری ریاضت پر پانی پھیر کے رکھ دیا ہے۔ اب ہم پھر وہیں کھڑے تھے جہاں پر اب سے چند گھنٹے پہلے تھے۔

''بھائی جان! ہم یتیم ہو گئے۔'' وہ ٹھس ٹھس کی ٹھمریاں کے درمیان بولا۔

''صبر کرو صبر۔۔۔تم کوئی پہلے یتیم نہیں، دنیا بھری پڑی ہے یتیموں سے۔ ان کی طرف دیکھو، حوصلہ کرو۔'' میں نے اس کی پشت تھپکتے ہوئے کہا۔

میری تسلی سے اس کی ٹھس ٹھس میں کافی افاقہ ہوا۔ اس کی صدیوں سے پیاسی ممتا کو یک دم قرار آ گیا۔

''وہ تمہارے بھائی جان کہاں ہیں؟'' میں نے اس کی حالت اعتدال پر آتے دیکھ کر کہا۔

''وہ اندر ہی ہیں آپ چلے جائیں۔'' اس نے ڈبڈباتی آنکھوں سے میری رہنمائی کی۔

اندر پہنچا تو دیکھا عورتیں میت کے ارگرد جابجا کھمبیوں کی طرح اگی ہوئی ہیں اور مرحوم کے بھاگنے کی تمام رستے مسدود کر رکھے ہیں۔ میں دوست کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی ذہن میں منتشر ہو جانے والے الفاظ بھی مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے تمام الفاظ کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے میں کامیاب ہوا۔ اب اگر دوست بھی مل جاتا تو۔۔۔

میں اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ کوئی چیز میرے پہلو سے اس زور سے ٹکرائی کہ میں لڑکھڑا کے قریبی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک چنگھاڑ سنی جو یقیناً میری نہ تھی۔ اس چنگھاڑ کے ساتھ ہی ایک دیو ہیکل عورت تمام عورتوں کو پھاندتی ہوئی مرحوم کے اوپر جا پڑی۔ شکر ہے کہ مرحوم زندہ نہ تھے ورنہ مر گئے ہوتے۔ یہ عفریت مرحوم کی بڑی بہن تھیں۔ جن کی گزشتہ کئی سالوں سے بعض خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے مرحوم کے ساتھ بول چال بند تھی۔ انہوں نے مرحوم پر گر کے اٹھنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس ڈیل ڈول کی عورت کا خود سے اور بغیر کسی مدد کے اُٹھنا نہایت مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ محترمہ نے چند لمبے لمبے سانس کھینچ کر سانس درست کیا اور راگ کلیان ٹھاٹھ میں اپنے بین کا آغاز کیا۔ مرحوم کے ساتھ ایک عرصہ سے بول چال بند ہونے کی وجہ سے محترمہ کے پاس باتوں کا کافی ذخیرہ موجود تھا جس کا اظہار انہوں نے نہایت چابکدستی کے ساتھ اپنے بین میں کیا۔ میں محترمہ کی مہارت کی اس وقت داد دیئے بنا نہ رہ سکا جب انہوں نے انتروں اور استھائیوں میں نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس حادثے کا تمام تر ذمہ مرحوم کی بیوی کے سر تھوپ دیا۔ محترمہ نہ صرف راگوں سے واقف تھیں بلکہ گلا بھی خوب پایا تھا۔ بھابی کو مورد الزام ٹھہرانے کے بعد انہوں نے کئی اور گلے شکوے بھی الاپے اور بار بار مرحوم سے بولنے کا بھی تقاضا کرتی رہیں۔ جب کہ میں جانتا تھا کہ مرحوم اپنی زندگی میں بھی کبھی اپنی بڑی بہن کے سامنے نہیں بولے، اب کیا بولیں

---محترمہ کی یہ باتیں مرحوم کی بیوہ کی راگنیوں پر تازیانہ ثابت ہوئیں اور ہوں نے ایک ہلکی پھلکی ٹھمری میں مرحوم کی موت کا ذمہ دار ان کی بہن کو ٹھہرا یا۔ مرحوم کی ایک چھوٹی بہن جو قریب ہی کسی پائے سے لگی بیٹھی تھی' بہن پر لگے الزام کا جواب پیش کیا مگر اختتام سے پہلے ہی ان کا اپنا گلا بیٹھ گیا۔ محترمہ کو ہیں لٹا کر پانی کے چھینٹے مارے گئے اور ہاتھ پیر ملے گئے۔ ہوش میں آتے ہی ہ دوبارہ رن آف میں کود پڑیں۔ ان سب کی دیکھا دیکھی باقی ماندہ عورتیں نے ھی دھیرے دھیرے گنگنانا شروع کر دیا تھا اور ایک ٹھیٹھ کلاسیکل محفل دیکھتے ی دیکھتے کورس میں بدل کر رہ گئی۔ چند ہی لمحوں میں سوگواری کی یہ محفل نندوں ور بھابی کی لڑائی میں بدل گئی مگر شاباشی ہے ان پر کہ انہوں نے محفل کے آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے لڑائی بھی کی تو وہ بھی "بین ہی بین" کے انداز میں' براہِ راست ایک دوسرے کو مخاطب نہ کیا۔ ورنہ اندیشہ تھا کہ میرے دوست کو یتیمی کے ساتھ ساتھ مسکینی کا داغ بھی دیکھنا پڑتا۔ محفل اپنے بام عروج پر پہنچ چکی تھی کہ اچانک وہ محترمہ ایک چیخ کے ساتھ انٹا غفیل ہو گئیں۔ ان کی بے ہوشی تو پانی کے ایک چھینٹے کی مار ثابت ہوئی مگر وہ عورت جس پر وہ محترمہ گریں تھیں' کافی کوشش کے بعد بھی ہوش میں نہ آسکیں۔ اسی اثناء میں مرحوم کی ساس بھی پہنچ گئیں۔ مرحوم کی بیوہ نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اب پلہ انہی کا بھاری رہے گا۔ مرحوم کی ساس شکل سے ہی کافی پہنچی ہوئی معلوم پڑتی تھیں' ان کے چہرے پر استادوں والی متانت اور سنجیدگی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب دیپک راگ سے کم کیا الاپیں گی۔ اس سے پہلے کہ وہاں چار سو آگ ہی آگ نظر آتی' میں نے وہاں سے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا۔ میری بات سچ ثابت ہوئی جب میں نے جاتے جاتے مرحوم کی ساس کے بین سنے جس میں انہوں نے عرشِ معلٰی اور نندوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

مَیں جب یہ رقت آمیز مناظر لئے باہر نکلا تو سامنے ہی دوست کو آتے پایا۔ نہ ہی موقع رہا اور نہ فاصلہ اتنا کہ ہم الفاظ کو اپنے ذہن میں مجتمع کر سکتے' وہ آناً فاناً دھڑام سے میرے اوپر آ سکا اور مجھے کچھ ایسی سختی سے اپنے ساتھ بھینچا کہ وہ چند الفاظ جو میں نے کھینچ تان کے جوڑے تھے' کسی سیاسی پارٹی کے جلوس کی طرح منتشر ہو گئے۔ میں گھٹی گھٹی آواز میں یوں گویا ہوا۔

"صبر کرو یار! --- اس کی یہی مرضی تھی۔ اچھا ہوا چلتے پھرتے چلے گئے ورنہ تم لوگوں کے محتاج ہو جاتے --- خدا اولاد کا محتاج بھی نہ کرے کسی کو۔"

وفورِ جذبات میں یا پھر انتقاماً میرے دوست نے مجھے کچھ مزید سختی سے بھینچا حتیٰ کہ میری پسلیاں کڑکڑا گئیں۔ آنکھوں میں پانی آ گیا اور وہ یہی سمجھتا رہا کہ میں اس کے غم کا برابر کا شریک ہوں۔ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا اسے تسلی دی اور اس سے وہی سوال کیا جس کا جواب وہ شاید ہر آنے والے کو دے چکا ہو گا۔ کہ "ہوا کیا تھا؟"

اس سوال کا جواب اسے فر فر زبانی یاد تھا۔ کہ کس طرح والد صاحب صبح اُٹھے' نماز ادا کی اور سیر کو چلے گئے۔ سیر سے واپس آئے' ناشتہ کیا اور بیٹھے بیٹھے سینے میں درد کی شکایت کی۔ کچھ دیر کو لیٹے اور پھر ہمیشہ کے لئے لیٹ گئے۔

"آہ' آہ ---" ایک قریب بیٹھے شخص نے آہ بھر کر کہا۔ "انسان تو فانی ہے۔ جتنا دانہ پانی لکھا تھا' کھا گئے۔" اس کی نگاہیں سامنے پکتی دیگوں پر تھیں' سب نے چلے جانا ہے جی۔

"جی بالکل کچھ پہلے چلے جائیں گے اور کچھ کھا کر جائیں گے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

یوں لگا جیسے اس کا دل کا چور پکڑا گیا ہو۔

"جی --- جی بالکل وہ ہکلا گیا۔"

مگر میرے چہرے پہ سنجیدگی دیکھ کر وہ میری طنز کو نہ پا سکا۔

میں نے دوست سے جنازے کا وقت پوچھا اور اجازت لے کر گھر آ گیا۔ سارے راستے میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہا کہ تم نہایت چغد واقع ہوئے ہو۔ تم جو بڑی لکھاری بن پھرتے ہو' کیا اپنے دوست کے لئے چند تعزیتی جملے نہیں لکھ سکتے؟ بھائی ضمیر! آپ خواہ مخواہ میں ناراض ہو رہے ہیں' اگر صرف جملے لکھنے کی بات ہوتی تو خدا قسم' ایسے جملے لکھتا کہ دوست کو اپنے باپ کے مرنے تک کا احساس نہ ہوتا مگر کیا کروں کہ ایسے موقعوں پر ہم سے بولا نہیں جاتا۔ اب کافی حد تک جھجک دور ہو گئی ہے' باقی رہی سہی کسر محلے میں فوتگیوں پر جا جا کر پوری کر لیں گے' ہماری یہ جھجک کوئی سات آٹھ فوتگیوں کی مار ہے --- میرے اس جواب پر ضمیر کافی مطمئن دکھائی دیتا تھا مگر خوف زدہ بھی تھا کہ کہیں ان فوتگیوں میں اس کی موت بھی تو شامل نہیں مگر وہ کیا جانے کہ اپنے ہی ضمیر کی موت کا خود سے افسوس کرنا کتنا مشکل اور کٹھن کام ہے۔

مرحوم کا آخری دیدار کیا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ مسکرا رہے ہوں۔ پس مرگ یہ طنزیہ مسکراہٹ میرے لئے تھی۔ شاید وہ سب کچھ جو مجھ پہ بیت گیا تھا' وہ بھی اس سے آگاہ تھے یا پھر اپنوں کے دوغلے کردار پر ہنس رہے تھے یا پھر سوچ رہے تھے کہ جان چھوٹی لاکھوں پائے۔ اس مسکراہٹ کے پس منظر میں ضرور کچھ پوشیدہ تھا۔ وہ کیا تھا' یہ تو وہ ذات ہی بہتر جان سکتی ہے۔ جنازہ اٹھا' پڑھا گیا او تجہیز و تدفین کے مراحل بھی باخوبی انجام پا گئے۔ مرحوم کے پروردگار کے گھر سدھار جانے کے بعد جان کنی کا ایک نیا سلسلہ چل نکلا۔ دفنانے کے فوراً بعد گورکن صاحب نے اس مسئلہ کو یو۔ این۔ او میں اٹھانے کی دھمکی دی کہ وہ چھ سو روپے سے کسی طور پر کم نہ لیں گے۔ لوگوں نے بہت سمجھایا کہ آخر تم نے بھی ایک دن مرنا ہے مگر وہ بضد رہے کہ لیں گے تو چھ سو روپے ورنہ ایک دھیلہ کم نہ لیں گے۔ ڈر تھا کہ وہ ضد میں آ کے کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ جاؤ اپنا مردہ یہاں سے لے جاؤ' کسی سستے سے قبرستان میں دفن کر دینا۔ پھر مرحوم

بچارے قبرستان در قبرستان دھکے کھاتے پھرتے۔۔۔ہم نے دوست کو سمجھایا کہ اس کے منہ نہ لگے اور چھ سو روپے ادا کر دے۔ غرض کے اس نے موقع کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے چھ سو روپے نکلوا لئے۔ میں نے جب ازراہ ہمدردی دوست سے یہ کہا۔

''بڑا ہی بدتمیز آدمی ہے' مردوں اور انسان میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتا۔ مردوں کے بیچ میں رہ رہ کے مردہ دل ہو گیا۔ تم نے کسی نزدیکی قبرستان میں بندوبست کر لیا ہوتا۔''

اس کا جواب سن کر از روئے ایمان میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میرا موت پہ سے جی اٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

''وہاں تو صرف جگہ کے چھ ہزار روپے مانگتے تھے۔ چھ ہزار روپے' یعنی کہ جس کے نصف تین ہزار روپے ہیں۔''

قارئین بھی شاید مسکرا کے اور کچھ زندہ دل ان باتوں پہ قہقہہ لگا کر خاموش ہو جائیں مگر یہ حقیقت ہے اور میرا یہ مضمون لکھنے کا اصل مقصد بھی یہی تھا کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ مرنا بھی کتنا مشکل ہو گیا ہے۔ ہم نے اپنے قبرستان میں بھی ڈیفنس' گلبرگ اور کاچھو پورہ پیدا کر لئے ہیں۔ سنا تھا کہ مر کے سب انسان برابر ہو جاتے ہیں مگر اس دن معلوم ہوا کہ یہ لوگوں کی خام خیالی ہے۔ جو تفریق ہم نے اسی دنیا میں پیدا کر دی ہے' وہ قبر تک ساتھ جاتی ہے۔ کیا کوئی دیہاڑی کمانے والا مزدور چھ ہزار تو درکنار چھ سو روپے والے قبرستان میں دفن ہونے کا سوچ سکتا ہے۔ غریب موت سے نہیں ڈرتا' وہ ان خرچوں سے ڈرتا ہے جو بعدازاں اس کے ورثاء کسی طور برداشت نہ کر پائیں گے۔ آج کے دور میں مرنا اتنا سستا تو نہیں۔ مرنے کے لئے بھی سرمائے کی ضرورت ہے اور موت کوئی بتا کر نہیں آتی کہ انسان اس واسطے پیسے جمع کر چھوڑے۔ اگر وقت اور لوگ اس تیزی سے بدلتے رہے تو وہ دن دور نہیں کہ اس شخص کو خوش قسمت جانا جائے گا کہ جس کے بارے میں یہ محاورہ بولا جائے کہ ''قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے۔'' کم از کم قبر تو اپنی ہے یا پھر محاورہ کہ ''قبر تیار ہے مردے کا انتظام ہے'' ذرا سی تبدیلی کے ساتھ یوں بولا جائے کہ مردہ تیار ہے مگر قبر کا انتظار ہے۔''۔۔۔آج کا غریب تو چاہے جتنے مشکل حالات ہوں' جتنی چاہے گھریلو پریشانیاں ہوں' خودکشی کا بھی نہیں سوچتا۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی خودکشی اکیلے کی نہیں بلکہ سارے خاندان کی خودکشی ہے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اس روئے زمین پر ایسے لوگ بھی آباد ہیں جو اپنے مرنے والوں کی لاشیں ننگے آسمان تلے رکھ دیتے ہیں۔ تاکہ چیل' کوے' گدھ اسے نوچ نوچ کر کھا جائیں گے بس فرق ہے تو صرف اتنا کہ یہاں نوچنے والے اپنے ہی بھائی بند ہیں۔ صرف بات یہاں تک محدود ہوتو پھر بھی انسان مرنے کا سوچ سکتا ہے مگر ہمارے ہاں تو فوتگی پر کنبے کے کنبے پلتے ہیں' کئی کئی مہینے گھر مہمانوں سے بھرے رہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ لوگ چلے جانے والے کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیتے بلکہ کچھ اس طرح اپنے بن کر رہتے ہیں کہ میزبان کو اپنا گھر پرایا محسوس ہونے لگتا ہے۔

ایک اور لعنت جو ہم میں رواج پا چلی ہے' وہ چہلم اور اس جیسی دوسری رسموں کی بذریعہ کارڈ اطلاع ہے۔ مرنے والے کے چہلم کے باقاعدہ شادی کی طرز پر کارڈ چھپوائے جاتے ہیں اور پھر رشتہ داروں اور عزیز احباب کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اس کارڈ پر شادی کے کارڈ کی ہر چیز ہوتی ہے ماسوائے اس کے کہ مرحوم کا چہلم کس سے ہونا قرار پایا ہے۔۔۔ پھر اسی حساب سے کھانے کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ چہلم بھی اچھی خاصی خوشی مرحوم چالیس دن گزر جانے کے بعد بھی واپس نہیں آیا لہٰذا ان کی موت کنفرم ہوئی۔ اس طرح کا چہلم تو دراصل بیٹھنے کا ایک بہانہ ہوتا ہے۔

اکثر قارئین کا خیال ہوگا کہ یہ اونچے گھرانوں کے چونچلے ہیں اور ابھی بڑے محدود پیمانے پہ ہیں۔ مگر یہ یاد رہے کہ ہم میں رسم و رواج وبا کی طرح پھیلتے ہیں اور انہیں فیشن بنتے دیر نہیں لگتی۔ ہمارے ہاں کئی بڑے کام محض فیشن سمجھ کے اپنا لئے جاتے ہیں۔ کبھی شادی اور دوسرے فنکشنوں پر ویڈیو فلم صرف امیروں کے ہی چونچلے سمجھے جاتے ہیں مگر اب کوئی شادی بھی بغیر ویڈیو فلم کے مکمل نہیں ہوتی۔ وہ دن دور نہیں جب چہلم پر بھانڈ بھی آیا کریں گے اور مرحوم کے نیک و صالح کاموں پر نہایت لطیف اور پرمزاح انداز سے پھبتیاں کسیں گے۔ بدیوں پر طنز کریں گے' نیک نامی اچھالیں گے' اعمالوں کے بخیے ادھیڑیں گے' سامعین میں موجود ان لوگوں کہ لطیفے گھڑیں گے جن کے ماتھے اور دل دونوں کالے ہو چکے ہیں۔ جزا و سزا پر جگتیں کریں گے۔

پہلا بھانڈ: یار! دیکھ کر بتا کہ اپنے سیٹھ صاحب اس وقت کہاں ہیں؟

دوسرا بھانڈ: (آنکھیں موندتے ہوئے) وہ تو اس وقت جنت میں آرام کر رہے ہیں۔

پہلا بھانڈ: (حیرانی کے ساتھ) جنت میں؟

دوسرا بھانڈ: ہاں' ربّ نے ان کے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔

پہلا بھانڈ: گناہ معاف کر دیئے ہیں' وہ کیوں' بھائی؟

دوسرا بھانڈ: اللہ میاں فرماتے ہیں کہ یہ اپنی سزا دنیا میں ہی بھگت چکا ہے۔

پہلا بھانڈ: کچھ سمجھ میں نہیں آیا' سزا بھگت چکا ہے؟

دوسرا بھانڈ: سزا ہی ہوئی نا' جناب! سیٹھ صاحب نے ایک ہی عورت کے ساتھ تیس پینتیس سال گزار دیئے۔

ہم لوگ سامنے بیٹھ کر قہقہے لگائیں گے۔ ہا' ہا' ہا اور کچھ دیر کو یہ بھول جائیں گے کہ ہم نے بھی آخر ایک دن مرنا ہے۔ ☆☆

☆ محمد محبوب ملک

جینی اور جن

جینی کو آج کل بڑی عجیب وغریب صورتحال کا سامنا تھا۔ وہ یہ کہ جینی کسی بھی کام کو سرانجام دینے کا قصد کرتی تو وہ خود بخود ہو جاتا۔ مثلاً ابھی وہ سوچ ہی رہی ہوتی کہ کچن میں جا کر اپنے لیے ناشتہ تیار کرے کہ اسے کچن سے ناشتے کے لوازمات کی خوشبو آتی۔ وہ جلدی سے کچن میں پہنچتی تو اسے وہاں ناشتہ تیار ملتا۔ اگر پانی گرم کرنے کے لیے چولہے پہ چڑھاتی تو وہ چولہے پہ رکھنے سے پہلے ہی بھاپ اڑا کر اپنے گرم ہونے کا اعلان کرتا۔ جب دو دن تک یہی صورتحال رہی تو جینی سمجھ گئی کہ یہ تمام شرارتیں کوئی جن بھوت کرتا ہوگا۔

جینی عام لڑکیوں سے ہٹ کر تھی، وہ کسی بھی چیز سے خوفزدہ ہونے کی بجائے مقابلے کو ترجیح دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ مٹھیاں بھینچے بڑبڑا رہی تھی۔ اس جن بھوت کی بھی ایسی کی تیسی۔ ایک بار سامنے تو آئے، مزہ نہ چکھا دیا تو کہے۔

"جان! غصہ کیوں کرتی ہو، یہ لو میں حاضر ہو جاتا ہوں۔"

اچانک فضا میں ایک مردانہ آواز گونجی، ساتھ ہی ایک خوبصورت لڑکے کے روپ میں جن حاضر تھا۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے، کیوں مجھے پریشان کر رہے ہو؟" اس کے ظاہر ہوتے ہی جینی ڈرنے کی بجائے اس پہ یوں برس پڑی جیسے سر منڈاتے ہی اولے پڑتے ہیں۔

"تکلیف یہاں ہوتی ہے۔" ---جن نے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ "اور تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہارے تقریباً سارے کام تو میں ہی کر دیتا ہوں۔"

"ارے چلو جاؤ اپنی راہ لو۔" جینی نے بگڑ کر کہا۔

"محترمہ! یہ جن آپ کا ہوا۔ اب میری زندگی کی ہر شاہراہ پہ تمہاری تصویر ہے۔ جدھر کی بھی راہ لوں، تمہارا سامنا ہے۔ تم نے سنا ہوگا کہ جب کوئی جن کسی پہ عاشق ہو جائے تو مر کر ہی پیچھا چھوڑتا ہے۔ میں بھی ان میں سے ہوں۔"

"بڑے عاشق دیکھے، ناک کے راستے ساری عاشقی نہ نکالی تو کہنا۔" جینی نے چہرے کے آگے سے لٹ سنوارتے ہوئے کہا۔

"دیکھو، میں ذرا اصول پرست جن ہوں۔ میں چاہوں تو جادو کے زور پہ تمہیں حاصل کرلوں مگر میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے سچی محبت کرو۔" جن نے اپنا لہجہ ذرا سخت کرتے ہوئے کہا۔

"جن صاحب! میری چند شرطیں ہیں۔ اگر پوری کر دیں تو میں بہ رضا ورغبت تم سے شادی پہ تیار ہو جاؤں گی۔" جینی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے تم شرطیں بتاؤ۔" جن نے چوڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یہ حسین لڑکے کا بہروپ ختم کر کے عام میٹرک پاس ٹائپ لڑکے کا بہروپ بھرنا ہوگا، پھر پورا ایک سال کوئی بھی ملازمت کرو۔ "اس دوران میں تم سے جو بھی فرمائش کروں، اسے پوری کرو۔ مزید یہ کہ جادو کے سر پہ تم کوئی کام نہیں کرو گے سوائے بہروپ بھرنے کے اور اگر تم نے خلاف ورزی کی تو جرمانہ کے طور پر معاہدہ طویل یا ختم کر دیا جائے گا حتی کہ میرے محلہ دار تمہیں میرے فلیٹ کے قریب بھی نہ دیکھیں۔ بولو، یہ سب منظور ہے؟" جینی نے شرطیں بتاتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے سب منظور ہے۔ میں تمہارے فلیٹ میں سوائے تمہارے اور کسی کو بھی نظر نہیں آؤں گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ ابھی جاؤ اور کل شام تک میرے لیے ایک ڈبہ پیک موبائل لاؤ۔" جینی نے گویا آرڈر دیا۔

"مگر ابھی تو میں نوکری کی تلاش میں جاؤں گا؟" جن نے کہا۔

"میں اپنی بات دہرانے کی عادی نہیں۔" جینی نے قطعیت سے کہا۔

"ٹھیک ہے، میری سرکار! لو پھر میں چلا نوکری ڈھونڈنے۔ ملتے ہیں بریک کے بعد۔" یہ کہہ کر جن غائب ہوگیا۔

"اُونہہ، تمہیں بھی جن کے پتر سے بندے کا پتر نہ بنایا تو نام نہیں۔" جینی نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن جن پھر آن دھمکا۔ اس کا حلیہ دیکھ کر جینی کو ہنسی آگئی۔ مٹی میں اٹا ہوا عام سا چہرہ، پاؤں میں گھسی ہوئی چپل، گریبان کا

بٹن ٹوٹا ہوا' بال بکھرے۔

''کیا ہوا' جن صاحب! کسی سے لڑائی ہوگئی تھی؟'' جینی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''میری جان! کیا بتاؤں' سارا دن شہر کی سڑکوں اور دفتروں میں جوتیاں چٹخاتا پھرا مگر کوئی اچھی سی ملازمت تو کیا ملی' اُمید بھی نہیں البتہ کل ایک چائے والے کے کھوکھے پر ٹرائی ماروں گا۔ اسے برتن دھونے کے لیے ایک بندہ چاہیے۔ ابتدا تو کروں پھر اور دیکھا جائے گا۔''

''موبائل لائے ہو؟'' جینی نے ذرا سخت لہجہ اپنایا۔

''وہ---وہ جی یہ سیکنڈ ہینڈ لایا ہوں۔ صرف چند دن ٹھہر جائیں' پھر میں نیا لا دوں گا۔'' جن نے قمیص کی جیب سے ایک پرانا موبائل نکالا۔

''یہ کہاں سے خریدا' تمھارے پاس تو پیسے نہیں تھے؟'' جینی نے تفتیش کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ---م---مَیں نے جادو کے زور پہ تھوڑی سی رقم حاصل کی تھی تاکہ گزارہ ہو سکے اور موبائل بھی اسی لیے سیکنڈ ہینڈ خریدا تاکہ آپ کو شک نہ ہو۔'' جن نے نظریں جھکاتے ہوئے بتایا۔

''یہ چھوٹی غلطی ہے اسی لیے تمہیں چھوٹی سزا ملے گی اور وہ سزا یہ ہے کہ تم روزانہ نو بجے آ کر میرے سامنے ٹی وی کا خبرنامہ سنا کرو۔'' جینی نے سزا سنائی۔

''واہ' بھلا یہ بھی کوئی سزا ہے؟''

جن نے دل میں آسان سزا پہ جھومتے ہوئے کہا۔ جبکہ اس کے دل کے تاثرات جینی نے اس کے چہرے پہ پڑھ لیے تھے۔

''تمہیں جب سزا ملے گی نا' تو پھر لگ پتہ جائے گا۔''

پھر جب جن صاحب نے خبرنامہ ملاحظہ فرمایا تو چند منٹ بعد ہی کانوں کو ہاتھ لگاتا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اُف' اتنی سچائیاں مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتیں' مجھے معاف کردو' میں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔''

مگر جینی نے جب گھور کر دیکھا تو بیچارہ سہم کر پھر بیٹھ رہا' بالآخر آدھے گھنٹے کے طویل جان لیوا وقت کے بعد خبرنامہ ختم ہوا تو جن نے طویل اطمینان کا سانس لیا۔

''اب اگر تم نے جادو سے کوئی بھی کام لیا تو سزا اس سے بڑھ کر ملے گی اور کان کھول کر سن لو' ایک ہفتہ کے اندر مجھے ڈبہ پیک موبائل چاہیے۔'' جینی نے وارننگ دیتے ہوئے کہا۔

''جو حکم' میری آقا!'' جن نے جھکتے ہوئے کہا اور غائب ہوگیا۔

ہفتے بعد اس کی شکل نظر آئی۔ اب کے حلیے میں بڑھی ہوئی شیو کا اضافہ بھی ہو چکا تھا۔

''موبائل لائے ہو؟'' جینی نے بغیر سلام دعا کے پوچھا۔

''جی' یہ حاضر ہے۔''

جن نے بڑی سعادت مندی سے ایک ڈبہ پیک موبائل آگے بڑھا کر جینی کو تھمایا۔

''مجھے پورے ہفتے کی ڈیٹیل بتاؤ' تم نے کیا کام کیا اور کہاں جھک مارتے رہے؟''

''میں پورا ہفتہ ایک ہوٹل پہ بطور باورچی کام کرتا رہا۔ ہوٹل کے مالک نے مجھے ایک مہینے کی تنخواہ ایڈوانس دے دی ہے۔ جس سے میں موبائل لایا ہوں۔'' جن نے تفصیل بتائی۔

''اور یہ کھانا پکانا وہ بھی پورے ہوٹل کا ایک عام میٹرک پاس لڑکے کو تو آتا ہی نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے پھر جادو سے ماہر باورچی کا رول کیا؟'' جینی نے اندھیرے میں تیر چلایا جو کہ نشانے پہ بیٹھا۔

''مم---مَیں---وہ---وہ آپ کے پاس ایسے کون سے موکل ہیں جو سب بتا دیتے ہیں؟'' جن نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''اب تمہاری سزا یہ ہے کہ آج ساری رات سٹار پلس دیکھو۔'' جینی نے سزا سنائی۔

''اوہ---شکر ہے خبرنامے سے جان چھوٹی۔'' جن نے اطمینان کا سانس لیا۔

لیکن بھی قم قم اور بدھائی ہی دیکھا تھا کہ چیختا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''اوہ' جینی--- مجھے آخری بار معاف کردو۔ اف' اسے بند کردو۔ میرے باپ کے باپ کی بھی توبہ' آئندہ خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ خدا کے لیے ٹی وی بند کردو۔''

جن نے چیختے چلاتے واویلا کیا مگر جینی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بالآخر جب جن کی رو رو کر ہچکی بند ہوگئی تو جینی نے سزا کو تبدیل کر دیا۔

''اب اگر تم نے ایسی حرکت کی تو معاہدہ ختم یا اس کی مدت میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ بتاؤ کہ ساتھ والے فلیٹ میں جو کرن نام کی لڑکی رہتی ہے' اسے جانتے ہو؟''

''جی' میں اس محلے کے تمام افراد کو جانتا ہوں۔'' جن نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ جاؤ' اس وقت وہ سو رہی ہو گی اور سوتے میں وہ میک اپ نہیں کرتی لہٰذا جب تک وہ اٹھ کر میک اپ نہیں کر لیتی' تم اُ

کھڑے دیکھتے رہو۔''

جینی نے اِک دلچسپ سزا سنائی۔

''یہ سن کر جن غائب ہو گیا مگر چند لمحوں بعد ہی وہ خوفناک چیخیں مارتا ہوا ظاہر ہوا۔

''وہ---ک---ک---کرن---''

اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا اور وہ لہرا کر فرش پر آ رہا۔ جینی نے اس کے منہ پہ پانی کے چھینٹے مارے تب اس نے نیم وا آنکھیں کھول کر پہلے دائیں بائیں کچھ دیکھا' پھر ایک جھرجھری لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اُف' خدا! اتنی پیاری صورت (طنز) اس سے تو خوبصورت میری بہن ہے حالانکہ وہ میری چڑیل سی بہن ہے۔'' جن نے لرزتے ہوئے بتایا۔

''کیا سزا معاف نہیں ہو سکتی؟'' لہجے میں التجا تھی۔

''معاف تو نہیں' چلو نرم کر دیتی ہوں۔ ہماری گلی کے اختتام کے سامنے جو نسوار والا پٹھان ہے' اس کے پاس کھڑے ہو کر صرف ایک ڈبی سگریٹ پیو۔ جاؤ جلدی۔'' جینی نے نئی سزا سنائی۔

دوسرے ہی لمحے جن پھر غائب تھا مگر حسب سابق دو منٹ بعد ہی پھر حاضر ہو گیا اور ساتھ ہی جینی کے قدموں میں سر رکھ کر معافی کی التجا کرنے لگا۔

''ٹھیک ہے' میں نے معاف کیا لیکن یہ بتاؤ کہ ہوا کیا؟'' جینی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے اسے جاتے ہی ہاتھ ملا کر جو سلام لیا تو خان میرا ہاتھ پکڑ لیا جب میں نے کہا کہ خاں صاحب میں ایسا لڑکا نہیں تو کمبخت بولا کہ میں نے سوچا پوچھنے میں کیا حرج ہے۔ پھر وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا کہ مجھے اپنی جان و آبرو خطرے میں محسوس ہوئی اور میں واپس بھاگ لیا۔''

''مجھے امید ہے کہ تم آئندہ ایسی غلطی نہیں کرو گے لہٰذا اب یہاں سے دفعہ ہو جاؤ اور جس دن تمہیں تنخواہ ملے تب شکل دکھانا۔'' جینی نے مصنوعی سخت مزاجی سے اسے بھگایا۔

''ٹھیک ہے' جان! چلتا ہوں۔ تمہیں حاصل کرنا بھی میری ضد ہے جو میں ضرور پوری کروں گا۔''

''ہونہہ' تمہیں میں جن کے پتر سے بندے کا پتر تو بنا ہی دیا ہے، اب بندے کے پتر سے کھوتے کا پتر بھی بناؤں گی، کام کروا کروا کر۔'' جینی نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے' جان! جو دل چاہے کہو' میں اب تمہارا ہی ہوں۔ اب چلتا ہوں، اپنا خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر جن غائب ہو گیا۔

جینی سوچ رہی تھی کہ جن کافی ڈھیٹ لگتا ہے لہٰذا بہت ہو گیا' اب اسے بھگانے کی ترکیب کرنی ہی چاہیے۔ ادھر جن سوچ رہا تھا کہ اِس عشق پہ لعنت ڈالے اور واپسی کی راہ لے مگر پھر اسے جینی کا بے پناہ حسن اور جنوں کی عزت کا خیال آ جاتا۔ اگر وہ اپنے عہد کو توڑتا تو تمام جن برادری کی عزت کا جنازہ نکل جاتا لہٰذا وہ ہر ممکن ڈھٹائی سے لگا رہا۔

اسے اب چھ ماہ ہو چکے تھے۔ ان چھ ماہ میں جینی کے فلیٹ کا نقشہ بھی بدل چکا تھا۔ نیا ٹی وی' فریج' صوفہ سیٹ' قالین' نفیس پردے۔ اب اسے صرف ایک کمپیوٹر اور وائرلیس فون کی ضرورت تھی تاکہ وہ گھر میں انٹرنیٹ کی سہولت استعمال کر سکے۔ ایک بار پھر جن اپنی تنخواہ کے ساتھ حاضر تھا۔

''جن صاحب! مجھے P6 کمپیوٹر اور کارڈلس فون چاہیے۔'' جینی نے ذرا رکھائی سے کہا۔

پھر جن صاحب کمپیوٹر خریدنے گئے تو لگ پتہ گیا۔ دس ہزار اس کے پاس تھے اور باقی چار ہزار اسے جادو کی رقم پھر ملانی پڑی۔ اس کا خیال تھا کہ جینی صرف گھر بیٹھی فرمائشیں ہی کر رہی ہے' اسے مارکیٹ ریٹ معلوم نہ ہوں گے۔ کمپیوٹر دیکھ کر جینی مصنوعی خوشی چہرے پہ لے آئی۔

''تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو--- ہے نا؟'' جینی نے جتلاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں' جان! تمہیں میری محبت کا ابھی اندازہ ہی نہیں۔'' جن نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو جن صاحب! اس محبت کی قسم کھا کر سچ بتاؤ کہ تم نے بقایا رقم کہاں سے حاصل کی؟''

''ک---کون سی بقایا رقم؟'' جن نے بوکھلاتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے پاس دس ہزار سے زیادہ رقم نہ تھی اور میری جان! یہ نان برانڈ کمپیوٹر نہایت ہی مہنگا ہے۔ اب سچ بتانا کہ تم نے جادو سے کتنے پیسے اور ملائے؟''

''یہی کوئی تیس ہزار! قسم سے صرف تیس ہزار' باقی دس تو میرے پاس تھے لیکن تمہارے پاس آخر وہ کونسے موکل ہیں کہ تمہیں سب پتہ چل جاتا ہے؟''

''بکواس بند کرو اور اب میرا فیصلہ سن لو۔ تمہیں تین آپشن دیتی ہوں۔ ان تینوں کو ہی تمہیں قبول کرنا ہو گا ورنہ معاہدہ کینسل!'' جینی نے اکڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں' نہیں معاہدہ کینسل مت کرو، میں مرجاؤں گا۔ مجھے آپشن

بتاؤ؟'' جن نے تڑپتے ہوئے کہا۔

''آپشن نمبر ایک کہ تمہیں ایک ہفتہ مسلسل سٹار پلس دیکھنا پڑے گا۔ آپشن نمبر دو کہ تمہیں نصیبو لال' عطا اللہ اور اکرم راہی کے گانے ایک ہفتے میں تمام یاد کرنے ہوں گے۔ آپشن نمبر تین کہ تمہیں ایک ہفتے میں مکمل پشتو پنجابی زبان سیکھنی پڑے گی اور یہ تینوں آپشن ہر قسم کی جادو کی آمیزش سے پاک ہوں گے۔ بولو! اگر یہ تینوں آپشن بطور سزا منظور ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ بائے بائے!'' جینی نے شوخی سے ہاتھ ہلایا۔

''مجھے عشق کی بازی جیتنے کی خاطر یہ تینوں آپشن قبول ہیں۔'' جن نے بیچارگی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لہٰذا میں آرام کرنے لگی ہوں' تم ٹی وی کے قریب بیٹھو اور آہستہ آواز میں پروگرام سنو اور دیکھو غلطی سے بھی مجھے ہاتھ مت لگانا ورنہ جل کر راکھ ہو جاؤ گے کیونکہ میں نے مقدس آیت کا تعویز گلے میں پہنا ہوا ہے۔'' جینی نے اسے خبردار کیا۔

''محترمہ! جس دن آپ نے یہ بندوبست کیا تھا' مجھے اُسی دن پتہ چل گیا تھا۔'' جن نے اداسی سے جواب دیا۔

پھر جینی اپنے بستر میں کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اِس کو کل سے ہلکا ہلکا بخار تھا۔ کچھ دیر تو وہ سٹار پلس کے پروگرامز کی ہلکی سی آواز سنتی رہی' پھر اس نے کروٹ بدلی اور سو گئی۔ صبح کافی دیر بعد جب اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے غیر محسوس انداز میں کروٹ واپس بدلی اور دیکھا کہ جن صاحب فلم عندلیب سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' جینی یکدم دھاڑی۔

اس کی آواز سن کر جن یکدم گھبرا کر صوفے سے نیچے گر گیا۔

''تم نہایت ہی بے ایمان جن ہو۔ یہاں سے دفعہ ہو جاؤ اور ان تینوں کے تمام گانے یاد کر کے مجھے سناؤ اور یہ یاد رکھو کہ تم پہلے مرحلے میں ناکام ہو۔''

جینی کا موڈ دیکھ کر جن چپ چاپ غائب ہو گیا۔

پھر چار دن بعد اس کی شکل نظر آئی۔ وہ بہت پرجوش تھا۔

''میں کامیاب ہو گیا۔ سنو جان! میں نے تمام گانے یاد کر لیے اور اسی خوشی میں میں نے حد سے زیادہ کھانا بھی کھا لیا۔ پیٹ میں کچھ گڑبڑ بد ہضمی اور گیس کی صورت میں لگ رہی ہے۔ بہرحال' تم یہ گانا سنو.....

بی بی شیرینی چُنی تیری مل ملدی
منجی دے تھلے سوہنے پھلاں والی اگ بلدی

دیکھا میں نے اکرم لال اور نصیبو راہی کا گانا اِکھٹا ہی یاد کر لیا اور باقی تمام بھی ایسے ہی اکھٹے یاد کیے ہیں تاکہ جلدی جلدی یاد ہوں۔''

''اُف' بند کرو یہ سب۔ تم اس مرحلے میں بھی فیل ہو۔ جاؤ' پہلے پشتو سیکھنے کی کوشش کرو تاکہ تم سے فائنل کیا جا سکے۔''

جینی نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔ جس پہ ایک بار پھر جن غائب ہو گیا لیکن ابھی اسے گئے چند گھنٹے ہی ہوئے ہوں گے کہ ایک بار پھر وہ نمودار ہوا مگر اس کا حلیہ بالکل مجنوں سے مشابہ تھا۔ کپڑے لیروں لیر' بال مٹی سے اٹے اور الجھے ہوئے' جگہ جگہ سے زخم نمایاں تھے۔

''یہ کیا ہوا؟'' جینی نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا بتاؤں' باجی' میری ماں' میری بہن! مجھے معاف کر دو۔ میں باز آیا ایسے عشق سے۔'' جن نے نہایت شکستہ اور کرب بھرے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے' معاف بھی کر دوں گی مگر یہ سب کیا ہے' کچھ بتاؤ تو؟''

''تمہیں کیا بتاؤں۔ میں' دِلربا! تمہارے سامنے میرا حال ہے۔'' جن نے گنگناتے ہوئے کہا۔ پھر یوں گویا ہوا ''میں نسوار والے پٹھان کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ میں نے شوقیہ پشتو سیکھنی ہے۔ وہ فوراً راضی ہو گیا۔ اسی دوران اس کی دکان پہ پٹھان گاہکوں کا رش بھی ہو گیا۔ میں پشتو کے چند الفاظ رٹ رہا تھا کہ بدہضمی کے باعث میرے پشت سے ایک ہلکا سا دھماکا ہوا مگر سب پٹھان یوں چونکے جیسے بم دھماکا ہو۔ پھر کسی نے مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ ظالموں نے ایسی ایسی جگہ پیٹا کہ بتا بھی نہیں سکتا۔ بس مجھے اب اجازت دو' میں چلتا ہوں۔

''جناب جن صاحب! آپ نے کچھ ماہ تعلق رہا' صرف اس کے لحاظ سے میں آپ سے صرف دوستی رکھوں گی۔ تمہارا جب دل چاہے' صرف مجھ سے ملنے چلے آنا۔ میں تمہیں ایک دوست کی طرح ہمیشہ ملوں گی اور یہ اپنا تمام سامان بھی اگر چاہو تو لے جاؤ۔'' جینی نے گویا اس پہ رحم کیا۔

''ہائے' مس جینی! جہاں آپ کو کھونے کا افسوس ہے' وہیں آپکی دوستی پہ فخر بھی ہوا۔ میری طرف سے یہ تمام بطور تحفہ قبول کریں اور مجھے دیں اب اجازت!'' جن نے خلوص سے کہا۔

''ٹھیک ہے' تم جا سکتے ہو۔ اپنا خیال رکھنا' خدا حافظ!''

جن نے خوشی سے ایک اُلٹی قلابازی لگائی۔ اسی لمحے وہ واپس خوبصورت جوان کے روپ میں آیا اور اگلے ہی لمحے وہ غائب ہو گیا۔

☆☆

☆ محمد فاروق انجم

بے چارہ

جس قدر باہر کا موسم خوشگوار تھا، اِس کے برعکس ہمارے دفتر کا موسم گرمیوں کی اُس آندھی کی طرح تھا جو آتے ہی ہر چیز کو مٹی سے بھر دیتی ہے۔ کھڑکیوں کے پٹ اِس آندھی میں یوں بجنے لگتے ہیں جیسے کوئی زچ ہو کر اپنا سر پھوڑ رہا ہو یا یوں کہہ لیں کہ تھکا ماندہ شوہر جیسے ہی اپنے گھر کی دہلیز میں قدم رکھتا ہے، بیگم کی طرف سے سودا سلف کی طویل لسٹ اُسے تھما دی جاتی ہے کہ اندر سسرال والے براجمان ہیں اور شوہر اِسی لسٹ کو اپنے ماتھے پر بار بار مارتے ہوئے فقط افسوس کرتا ہے کہ وہ جلد گھر کیوں آ گیا؟

ہمارے آفس کے باس صبغت بیگ کا جیسے ہی پہلا قدم دروازے کے اندر پڑتا تھا تو سمجھ لیجئے کہ کسی باغ میں طوطے درختوں کی ڈال پر بیٹھے اپنے کام میں مصروف ہوں، اور اچانک ایک فائر ہو جائے اور سارے طوطے درختوں سے نکل کر اُڑ جائیں، کچھ ایسا ہی حال ہمارا بھی ہوتا تھا۔ فرق یہ ہوتا تھا کہ ہم اِن طوطوں کی طرح اُڑتے نہیں تھے، بس سہم جاتے تھے۔ صبغت بیگ کا پاؤں ہمارے لئے کتنا بھاری پاؤں ثابت ہوتا تھا، یہ ہم جانتے تھے یا پھر وہی جان سکتا ہے جو "پاؤں بھاری" جیسی صورتِ حال سے گزرا ہو۔

ہمارے باس صبغت بیگ کا قد اتنا تھا کہ ہم اِسے لمبا نہیں کہہ سکتے تھے اور نہ ہی ناٹا کہہ سکتے تھے۔ آپ اِسے درمیانہ قد کہہ سکتے ہیں۔ اِس کے چہرے پر مونچھیں یوں تھیں جیسے دیوار پر دو تلواریں لٹکائی ہوں۔ آنکھوں کی رنگت سرخ، گویا کسی گاؤں کی نئی نویلی دُلہن نے چاؤ میں سرخ لب اسٹک کا بے دریغ استعمال کیا ہو۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ اِن کی آنکھوں کی سرخ رنگت خاندانی ہے، اِس سے اِن کی پڑدادا کے غصے اور جلال کا بھی پتہ چلتا تھا--- اِس کی گردن بہت موٹی تھی۔ جن لوگوں نے وہ کہانی پڑھی ہے کہ جب سزائے موت کے قیدی کی گردن میں پھانسی کا پھندہ پورا نہ آیا تو بادشاہ نے اِس کی گردن پھانسی کے پھندے میں دے دی تھی جس کی گردن اِس پھندے کے سائز کے مطابق تھی، تو باس کی گردن دیکھ کر پہلا خیال یہ ہی پیدا ہوتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو اِس وقت پھانسی سے بچا تھا۔ چہرہ ایسا کرخت اور درشت کہ یہ خیال کرنا قطعاً مشکل نہیں تھا کہ اِس بندے کو مسکرائے کم از کم ایک صدی تو بیت ہی گئی ہوگی، گو کہ اِس کی عمر اتنی نہیں تھی۔ جب بولتا تو ایسی بھاری آواز حلق سے نکلتی جیسے ہاتھی کی چنگھاڑ ہو۔ ماتھے پر سلوٹ بھی آگ کے شعلے کی مانند تھی۔ وہ چلتا یوں تھا جیسے کہیں نہیں رُکے گا۔ کسی کے لئے نرم گوشہ اِس کے دِل میں نہیں تھا۔ بات بات پر اپنے آفس میں کام کرنے والے کی تذلیل کر دینا اِس کے لئے ایسے ہی تھا جیسے جارحانہ انداز میں کرکٹ کھیلنے والے بیٹسمین کے لئے کسی بھی گیند پر چھکا مار دینا ہو۔

صبغت بیگ نے غصے اور اِس کے رویئے سے سبھی اجیرن تھے۔ جن کو کسی دوسری جگہ نوکری مل گئی، وہ ایک ٹہنی سے دوسری ڈال پر اُڑ کر بیٹھ جانے والے پرندے کی طرح ہو گئے تھے اور جن کو ابھی کہیں نوکری نہیں ملی تھی وہ اُڑنے کے لئے تیار تھے۔ میرا اِس دفتر سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اِس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میری اِس دفتر میں کوئی شراکت داری تھی، صبغت بیگ مجھے بہت پسند کرتا تھا اِس کا کوئی راز میرے ہاتھ میں تھا، ایسا قطعاً نہیں تھا۔

زمانہ سکول میں میرا شمار اِن طالب علموں میں ہوتا تھا جو کلاس میں آخری بینچ پر براجمان ہوتے ہیں لیکن چھٹی کی گھنٹی سب سے پہلے سنتے ہیں۔ میں نے مڈل ابا کی بھاگ دوڑ سے پاس کیا تھا۔ جب میں نے مڈل کا امتحان دیا تھا تو ابا نے ہیڈ ماسٹر صاحب کا گھر تلاش کرنے میں بڑی بھاگ دوڑ کی تھی۔ اِس ملاقات کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب کا گھر تلاش کرنے میں بڑی بھاگ دوڑ کی تھی۔ اِس ملاقات کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب اور ابا کے تعلقات بہت اچھے ہو گئے تھے اور میں نے نویں بھی پاس کر لی تھی۔ دسویں تھرڈ ڈویژن میں پاس کی تو اِس میں میرے چچا کا بہت ہاتھ ہے۔ اُنہوں نے ہی ہاتھ بڑھا کر میری خاطر ایک صاحب کو کچھ دیا تھا--- مجھے ایسے کالج میں داخلہ ملا تھا جہاں مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا

گیا۔ داخلے کے لئے پہلے میرے ابا نے پرنسپل صاحب سے ہاتھ ملایا' بات نہ بنی تو چچا جان نے بھی اِن سے ہاتھ ملایا۔ تب بھی بات نہ بنی تو چچا جان تین' چار معزز ہاتھ لے گئے اور یوں مجھے ہاتھوں ہاتھ کالج میں داخلہ مل ہی گیا۔ گیارھویں جماعت پاس کرنا میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا' مسئلہ تو پروفیسر صاحب کے لئے بن گیا جو بڑے خلیق اور رحم دِل تھے۔ کبھی میرے پیپرز دیکھتے اور کبھی میری معصوم صورت دیکھتے تھے۔ آخر اُنہوں نے سوچا کہ پوری کلاس میں سے ایک کو فیل کر دینا رحم دلی نہیں اور یوں میں پاس ہو گیا۔ اِس کے بعد میَں نے بی اے کیسے کیا' اِس کی ایک الگ داستان ہے جو میَں نہیں چاہتا کہ آپ پر منکشف ہو کیونکہ ایسی حقیقت کھل جانے پر تو الیکشن کی چڑھی ہوئی سیڑھی سے کچھ لوگ پھسل جاتے ہیں اور جو چڑھنے کی کوشش میں ہوں' وہ پہلے ہی ''پوڈے'' پر رہ جاتے ہیں اس لئے یہ قصہ رہنے ہی دیں۔

بی اے کرنے کے بعد جو میَں نے سب سے پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ میَں نے ایک نیم پلیٹ لکھوائی اور گھر کے دروازے پر آویزاں کر دی۔ اِس کے بعد ہر کوئی پڑھنے لگا تھا ''میر ریمس بی اے'' --- کہتے ہیں کہ جتنا گڑ ڈالا جائے اِتنا ہی میٹھا ہوتا ہے۔ میری بی اے کی سند اِتنی میٹھی نہیں تھی یعنی کہ اِس جگہ بھی ایک ایسی ڈویژن پونچھ کی طرح میرے ساتھ تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میری سند پر جو ''بی اے'' کے نمبر لکھے ہوئے تھے' مجھے تو یہ اُمید ہے کہ لکھنے والا بھی ایک بار شرمندہ سا ضرور ہوا ہوگا اِس لئے میَں نے جہاں بھی نوکری کرنے کی کوشش کی' وہاں سے مجھے ایسے ہی واپس کر دیا جاتا جیسے کپڑوں میں دھلا نوٹ لوٹا دیا جاتا ہے۔ بڑی عجیب بات تھی کہ مجھے کسی بھی جگہ اِنٹرویو دینے کے لئے اِس جگہ پہنچ کر اپنی باری میں دیر لگ جاتی تھی' واپس آنے میں مجھے کچھ وقت نہیں لگتا تھا بلکہ ایک جگہ تو مجھے اِنٹرویو لینے والا خود دروازے تک چھوڑ کر گیا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں جب مجھے کہیں بھی نوکری نہ ملی تو تب بھی ابا کی ایک پرانی واقفیت کام آ گئی۔ ابا کے دوست کا بیٹا صبغت بیگ کی نوکری چھوڑ رہا تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ جاتے جاتے یہ نیکی اُن کا بیٹا کر سکتا ہے کہ وہ مجھے نوکری پر فائز کرا جائے۔ نوکری صبغت بیگ کے پرسنل سیکرٹری کی تھی۔ جو کئی دِنوں سے خالی تھی' کوئی بھی اِس سیٹ پر نہیں جاتا تھا۔ میَں تو یہ سنتے ہی پھولے نہیں سما رہا تھا کہ مجھے ایک کمپنی میں نوکری مل رہی ہے۔ اِس طرح پہلی بار مجھے اپنی سند دِکھائے بغیر نوکری مل گئی۔ دو دِن کے لئے صبغت بیگ شہر سے باہر تھا' اِس لئے میَں بہت خوشی سے اِس سیٹ پر براجمان ہو گیا تھا البتہ میَں یہ محسوس کرتا رہا تھا کہ اِس آفس میں کام کرنے والا ہر شخص مجھے بڑی عجیب نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا۔

تیسرے دِن جیسے ہی صبغت بیگ نے اپنا پہلا قدم دفتر میں رکھا' یوں لگا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ میَں ڈائری پر جھکا ہوا تھا۔ جیسا مجھے ابا کے دوست کے بیٹے نے بتایا تھا' ویسا میَں نے کام کیا ہوا تھا۔ اپنے کمرے میں جاتے ہی باس نے سب سے پہلے مجھے طلب کر لیا۔

''آج کیا پروگرام ہے---؟'' باس نے میرے اندر جاتے ہی پوچھا۔

''کس کا' سر---؟''

میَں نے متحیر نگاہوں سے باس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔'' باس نے اپنی قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور اپنا سارا غصہ اپنے سینے میں دبا کر کہا۔

''تمہارا---''

میَں مسکرایا۔ ''میرا کوئی پروگرام نہیں ہے' سر! میَں گھر سے کام پر آ گیا ہوں' شام تک یہاں رہوں گا۔''

''کون لایا ہے تمہیں یہاں' کس نے لیا ہے تمہارا اِنٹرویو---؟''

یکدم باس کی دھاڑ اِس کے کمرے میں ہی نہیں بلکہ باہر تک سنائی دی گئی۔ میری مثال ایسی ہی ہو گئی تھی جیسے میَں سڑک کے کنارے کھڑا ہوں اور ایک آندھی کی طرح دوڑتی بس میرے سامنے سے کمان سے نکلے تیر کی طرح گزرے اور ایسی تیز ہوا چلے کہ میرے سر کا ایک ایک بال کھڑا ہو جائے۔ باس کی آواز سن کر میَں گھبرا گیا۔ اِسی گھبراہٹ میں میَں پیچھے ہٹا تو کرسٹل کا بڑا گلدان جو دیوار کے ساتھ ہی کھڑا تھا' میرا ہاتھ لگنے سے نیچے گرا۔ اِدھر وہ کرسٹل کا گلدان ٹوٹا اور اُدھر باس کی بولتی بند ہو گئی جبکہ اِس کی آنکھیں جیسے پھٹ گئی ہوں۔ وہ زمین پر بکھرے ہوئے کرسٹل کے گلدان کو دیکھے جا رہا تھا۔ باہر بھی کام کرتے ہوئے ہر شخص کی آنکھ ایک بار ہماری طرف اُٹھی ضرور تھی۔ سب حیران تھے کہ میَں کیا بلا ہوں جس نے باس کی بولتی بند کرا دی ہے؟ --- شیشے کا دروازہ تھا۔ باس کے کمرے میں کیا ہو رہا ہے' سب نظر آتا تھا۔ جس نے بھی گلدان ٹوٹا دیکھا' سہم کر اپنے کام میں جت گیا تھا۔

''س' سوری سر---!'' میَں نے بمشکل کہا۔

باس اپنی جگہ سے کرسٹل کے ٹوٹے ہوئے گلدان کے پاس آ گیا۔ اِس نے حسرت بھری نگاہوں سے ایک بار پھر ٹکڑوں کی طرف دیکھا اور اِس کے بعد وہ میری جانب متوجہ ہو کر چیخا۔ ''تم نے یہ گلدان توڑ دیا۔ جانتے ہو میَں یہ اسپین سے لے کر آیا تھا۔ اِس کی قیمت کیا ہے' اگر تم سن لو تو کئی ماہ تک مجھ سے تنخواہ کا تقاضا نہ کر سکو--- کون گدھا تمہیں یہاں لے کر آیا ہے؟''

باس بھلے مجھ پر گرجا اور برا تھا لیکن ایک بات کی مَیں تعریف ضرور کروں گا کہ باس کے پھیپھڑے بہت جاندار تھے۔ ایک ہی سانس میں مجھے سب کہتے ہوئے اِس کی سانس ایک بار بھی کہیں سے نہ تو ٹوٹی تھی اور نہ ہی کہیں سے کمزور پڑی تھی---اِس کے بعد اِس آدمی کی تلاش شروع ہوئی جو مجھے یہاں تک لے کر آیا تھا۔ پتہ چلا کہ ابا کے دوست کا بیٹا ہے جو ابا کے سر پر احسان کا ٹوکرا رکھ کر نوکری چھوڑ کر جا بھی چکا تھا۔ باس مجھ پر بہت برسا۔ اِس کے بعد اِس نے جو اُس گلدان کی قیمت بتائی اور وہ بھی یورو میں' اِسے سن کر مجھے لگا کہ جیسے میری بھی حالت اِس دروازے جیسی ہوگئی ہے جو زنگ آلود ہو جانے سے جام ہو جائے۔ میری ہڈی کا کوئی بھی جوڑ کام نہیں کر رہا تھا۔ باس نے فیصلہ کیا کہ اِس کرسٹل کی قیمت مجھے دینی ہوگی۔ طریقہ کار یہ ہوگا کہ مجھے آدھی تنخواہ ملے گی اور آدھی گلدان کی مد میں کٹ جائے گی۔ ایک لمبا منصوبہ تھا اور مَیں کہیں بھی نوکری نہیں کر سکتا تھا۔

اِس گلدان کی جگہ ایک دوسرا اُسی طرح کا گلدان آ گیا تھا جس سے میں بچ کر ہی گزرتا تھا۔ جب ایک ماہ بعد مَیں نے اپنی پہلی آدھی تنخواہ اماں کے ہاتھ پر رکھی تو اماں نے میری طرف گھور کر یوں دیکھا جیسے مَیں نے اُن کے ہاتھ پر پیسے رکھے نہ ہوں بلکہ اُٹھائے ہوں' ابا پاس ہی ٹہل رہے تھے۔

''تمہاری تنخواہ اِتنی تو نہیں تھی؟'' اماں نے پوچھا۔

''وہ---'' مَیں سوچنے لگا کہ کیا جواب دوں۔

''آدھی تنخواہ کہاں ہے؟''

اماں نے مجھے یوں پوچھا جیسے مَیں تنخواہ لے کر سیدھا تھانے میں آ گیا ہوں۔ مَیں سوچنے لگا کہ کیا جواب دوں' کیا سچ بتا دوں یا کوئی بہانہ کر دوں اگر سچ بتایا تو اِس کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں اور جھوٹ بتانے کی پاداش میں مجھے کن مراحل سے گزرنا پڑ سکتا ہے؟---ابا جذباتی آدمی ٹھہرے' میری اِس سوچ بچار کو زیادہ برداشت نہ کر پائے' آناً فاناً اُنہوں نے وہ جوتا اُٹھا کر میرے سر پر یکے بعد دیگرے مار دیا جو آج ہی مَیں غلطی سے اپنی بجائے کسی کا پہن کر مسجد سے گھر آ گیا تھا۔

''ماں پوچھ رہی ہے' تو بولتا کیوں نہیں ہے؟'' ابا نے غصے سے کہا۔

مَیں نے ابا کی طرف بڑی بے چارگی سے دیکھا۔ مجھے ایسی توقع نہیں تھی کہ مجھے جوتوں کا جھٹکا لگے گا۔ مَیں نے ابا اور اماں کو ساری بات تفصیل سے بتا دی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے اور جب مَیں چپ ہوا تو ابا نے ایک ایسا لیکچر دیا جس کے ایک لفظ کی بھی مجھے سمجھ نہیں آئی' یہ ضرور پتہ چلتا رہا کہ وہ مجھ پر بہت غصہ ہو رہے ہیں اور یہ تھی وہ بات کہ جس کی وجہ سے مَیں اِس جگہ سے نہیں جا سکتا تھا۔ ایک تو باس کا قرض دینا تھا اور دوسرا میری یہ پہلی اور آخری نوکری تھی۔ باس کے وبال کا سب سے زیادہ مَیں شکار ہوتا تھا۔ ہر روز مجھ سے گڑبڑ ہو جاتی تھی' عجیب کنفیوژن تھا۔

اُس دِن مَیں لنچ کے لئے باہر نکلا تو ہمارے آفس میں کام کرنے والا ایک شخص جس کا نام خادم تھا' اُس نے مجھے اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے باس کا ذکر شروع کر دیا۔

''ہم تو پھر بھی کبھی نہ کبھی اُڑ ہی جائیں گے لیکن تم تو اِس وقت تک نہیں جا سکتے جب تک باس کا قرض ادا نہ کر دو گے---مَیں نے تین جگہ نوکری کے لئے کوشش کی ہوئی ہے۔'' خادم نے کہا۔

باتیں گیلانی موبائلز کی

گاہک: کیسے ہو گیلانی؟
گیلانی: پیارہوں۔
گاہک: ایزی لوڈ دیں۔
گیلانی: باہر سے آدھا کلو پتھر اُٹھا لو۔
گاہک: سیکنڈ ہینڈ موبائل ہیں
گیلانی: نہیں جی' ہاتھوں والا موبائل ایجاد نہیں ہوا۔
گاہک: موبائل کی ڈوری دے دیں۔
گیلانی: ایسے ہی رکھ لو نہیں بھاگتا۔
گاہک: موبائل کی کیسنگ دیں گیلانی جی!
گیلانی: پہلے اپنے کپڑے تو تبدیل کرلو۔
گاہک: ہینڈ فری ہیں؟
گیلانی: جی' فری ہیں کسی کا گلا دبانا ہے؟
گاہک: وائس چینجر دکھائیں؟
گیلانی: ضرورت کیا ہے' تمہاری آواز تو ویسے ہی مردوں' عورتوں سے نہیں ملتی۔
گاہک: گیلانی صاحب! میموری کارڈ بھرتے ہو؟
گیلانی: جی ہاں' پانی سے۔
گاہک: اپنا موبائل نمبر تو دیں گیلانی جی!
گیلانی: لکھو' نوکیا 6300
گاہک: گیلانی صاحب! موبائل میں مائک اور سپیکر لگا دو۔
گیلانی: اذان دینی ہے کیا؟
گاہک: یہ چارجر کتنے پیسوں کا ہے؟
گیلانی: یہ پیسوں کا نہیں ہے' جناب؟
گاہک: تو مفت ہے کیا؟
گیلانی: نہیں جی' یہ روپوں کا ہے۔
گاہک: شاہ جی' آپ کیا بزنس کرو گے؟
گیلانی: یہی موبائل کا۔
گاہک: مجھے معافی دیں؟
گیلانی: اللہ سے مانگو۔

سیّد محمود گیلانی ڈھلی AK

''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' مَیں نے مرجھائے ہوئے انداز میں کہا۔

''تمہاری جان ایک طریقے سے چھوٹ سکتی ہے۔'' اُس نے مسکرا کر کہا۔

''وہ کیسے بھلا---؟'' مَیں نے پراُمید نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''اگر باس اوپر چلا جائے تو---'' وہ پھر مسکرایا۔

''باس کا اوپر بھی آفس ہے؟'' مَیں نے جلدی سے پوچھا۔

''اوپر سے مراد بالکل ہی اوپر---''

خادم نے اُنگلی کا اشارہ آسمان کی طرف کیا--- خادم نے یہ بات تو مذاق میں کہہ دی تھی لیکن میرے دِل پر یوں بیٹھ گئی جیسے دُور دَراز سے آیا مہمان میزبان کے گھر بیٹھ جاتا ہے۔ مَیں تو اِسی پر سوچنے لگا۔ ہر روز کی تذلیل اَب برداشت سے باہر تھی، کہیں اور نوکری تو کر نہیں سکتا تھا۔ اگر باس اوپر پیارا ہو جائے تو اِس کی جگہ آنے والا باس یقیناً اِس جیسا نہیں ہوگا۔ ہاں، یہ ہی ایک طریقہ ہے اِس باس کے قہر سے نجات کا، اِس باس کو اوپر جانا ہوگا۔ مَیں نے اِس بات کی گرہ باندھ لی اور اِس پر مزید سوچ بچار کرنے لگا کہ باس کیسے اوپر جائے گا؟ اِس چنگاری کو اِس وقت مزید ہوا ملی جب مَیں نے جاتے جاتے ایک چائے کی دکان پر لگی فلم کا یہ جملہ سنا۔ ''مَیں اُسے کوئی ثبوت چھوڑے بغیر ختم کر دوں گا''--- مَیں کیونکہ جلدی میں تھا اِس لئے رُک کر نہ تو اِس فلم کو دیکھ سکا اور نہ ہی یہ جان سکا کہ اِس فلم کا کیا نام ہے؟ وہ جملہ میرے دماغ میں اٹک گیا۔ اِسی رات مَیں نے فیصلہ کیا کہ مَیں خود بغیر ثبوت چھوڑے باس کو ختم کر دوں گا۔ یہ بات بھی اپنی جگہ ایک وزن رکھتی تھی کہ مَیں نے کبھی کسی چوہے کو بھی نہیں مارا تھا لیکن میرے پاس اِس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ سب کے سامنے مَیں روز ذلیل ہوتا تھا اور تھوک کے حساب سے ہوتا تھا۔ مَیں نے سوچا کہ اگر مَیں وہ فلم دیکھوں اور اِس کا طریقہ کار سامنے آ جائے کہ اِس نے کس طرح سے کوئی ثبوت چھوڑے بغیر اپنے دُشمن کو ختم کیا تھا، تو مجھے بہت مدد مل سکتی ہے۔ مَیں نے اِس فلم کی تلاش شروع کر دی اور ہر ویڈیو سنٹر پر جا کر پوچھا کہ مجھے وہ فلم درکار ہے جس میں ہیرو کہتا ہے کہ مَیں اُسے کوئی ثبوت چھوڑے بغیر ختم کر دوں گا۔ میری بات سن کر ہر ویڈیو سنٹر والا ہنس پڑتا تھا۔ مَیں نے جب اپنے اِس مقصد میں ناکامی دیکھی تو اِس فلم کی تلاش کا اِرادہ ترک کر دیا۔

ایک جنون سوار تھا۔ اِسی پر سوچتا رہتا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے ایک دِن پرانی کتابوں کی دکان پر چلا گیا۔ اچانک میری نگاہ ایک پرانی لیکن تین ٹیلی فون ڈائریکٹری جتنی ضخیم کتاب پر پڑی جس کا سرورق بھی بوسیدہ اور آدھا پھٹا ہوا تھا۔ وہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ تھی، اوپر نمایاں حروف میں لکھا ہوا تھا ''قتل'' اور اندر کے پہلے صفحے پر مصنف کی طرف سے لکھا تھا کہ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس نے دس قتل کئے لیکن کوئی بھی ثبوت نہیں چھوڑا اور پورے ملک کی پولیس اِسے تلاش کرتی رہی اور--- اِس کے آگے بھی صفحہ پھٹا ہوا تھا۔ مَیں نے فوراً وہ وزنی کتاب اُٹھائی اور کباڑیئے کے پاس لے گیا۔

''کیا قیمت ہے اِس کی---؟'' مَیں نے پوچھا۔

اُس نے ایک نظر میری طرف اور دوسری نگاہ کتاب پر ڈالی اور کہا۔

''ساڑھے چار سو روپے۔''

''ساڑھے چار سو---؟'' مَیں نے متحیر نگاہوں سے دیکھا۔

''ہاں جی---'' اُس نے کہا۔

''کچھ کم کرو، یہ تو بہت زیادہ ہے۔''

مَیں نے بڑی ہی معصوم صورت بنا کر کہا۔ ''میری اِلتجا پر توجہ دینے کی بجائے اُس نے اپنے لڑکے کو آواز دے کر کہا کہ یہ کتاب اُٹھا کر اُسی جگہ رکھ دے۔ مَیں نے فوراً اُسے روک کر اپنی جیب دیکھی، پورے ایکس روپے میری جیب میں تھے۔ مَیں نے اُس سے کچھ وقت لیا اور سیدھا اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا، اُس سے کئی طرح کی مِنت سماجت کرنے کے بعد مَیں اُس سے پیسے لینے میں کامیاب ہو ہی گیا اور جا کر وہ کتاب خرید لی۔ مَیں نے اپنے کندھے پر کتاب یوں رکھی جیسے مزدور سیمنٹ کی بوری رکھتا ہے۔ کتاب اُٹھائے جب مَیں گھر پہنچا تو میرا کندھا تھک چکا تھا۔ اماں نے مجھے متحیر نگاہوں سے دیکھا اور پوچھا۔

''یہ کیا ہے---؟''

''کتاب ہے، اماں!'' مَیں نے جواب دے کر اپنے کمرے میں چلے جانا چاہا۔

''کتاب ہے کہ راشن کارڈ کا سارا ریکارڈ کہیں سے اُٹھا لایا ہے تو---؟'' اماں نے میرے سامنے آ کر پوچھا۔

''اماں راشن کارڈ اَب کہاں بنتے ہیں؟''

مَیں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مَیں نے وہ ضخیم کتاب اپنے پلنگ کے سرہانے رکھی، پلنگ کی آواز سے مجھے پتہ چلا تھا کہ جیسے پلنگ کو محسوس ہوا ہو، اِس پر کوئی کتاب نہیں رکھی گئی بلکہ کوئی لیٹا ہے۔ مَیں اپنا کندھا دبانے لگا۔ کچھ دَم لینے کے بعد مَیں نے سوچا کہ رات کا کھانا کھانے کے بعد چائے کا بڑا مگ ہاتھ میں لے کر اِس کتاب کو پڑھنے کا

آغاز کروں گا۔ اِس طرح مجھے کوئی بھی ڈسٹرب نہیں کر سکے گا اور مَیں اطمینان سے قتل کرنے کا طریقہ سیکھ سکوں گا۔

رات کے کھانے پر اماں نے ابا کے سامنے مجھ سے وہ سوال کر دیا جو وہ ابا کی غیر موجودی میں بھی کر سکتی تھی' پوچھا۔ ''آج جو تو کتاب لے کر آیا ہے' وہ ہے کیا---؟''

اماں کی بات سن کر ابا کے کان کھڑے ہو گئے۔ ''کیسی کتاب---؟''

مَیں نے سوچا اور کہا۔ ''ایک ناول ہے۔''

''کام پر دھیان دے' پر تُو کیا کام پر دھیان دے گا۔ تُو تو جاتے ہی اپنا قرض اُتارنے میں لگ گیا ہے۔''

ابا نے کہا اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مَیں نے چپکے سے ایک بڑا مگ چائے کا بنایا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ساری رات جاگ کر مَیں وہ کتاب پڑھنا چاہتا تھا اور پھر جو بھی اس کے اندر قتل کرنے کی تدبیریں لکھی ہوئی تھیں' اِن میں سے ایک پر عمل کر کے باس کو ختم کر دینا چاہتا تھا---مَیں رات کے آخری پہر تک وہ کتاب پڑھتا رہا تھا۔ جب دِن نکلنے میں کچھ وقت باقی تھا تو مَیں دھڑام سے کتاب کے اوپر ہی جا گرا اور پتہ نہیں' مَیں نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا کہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ بات یہ تھی کہ کتاب کے پہلے سو صفحات پر سفید کپڑوں میں اگر چائے کے داغ لگ جائیں تو وہ کیسے اُتر سکتے ہیں' اِس بارے میں کئی مختلف طریقے لکھے ہوئے تھے۔ اِس کے بعد گھر میں اگر سالن بچ جائے تو اِسے دوبارہ استعمال دوسروں کو کیسے کرایا جا سکتا ہے' اِس پر سینکڑوں ٹوٹکے تھے۔ بینگن کا سالن اگر گھر کے کسی فرد کو پسند نہ آئے تو اِسے کھلانے کے دو سو چار طریقے درج تھے۔ زیادہ شور بے کو کم کیسے کیا جا سکتا ہے' کئی صفحات پر مشتمل اِس مسئلے پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ جو ہمسایہ کبھی کبھار بھی کوئی چیز کھانے کی آپ کی طرف نہ بھیجتا ہو اُسے اِس کام کے لئے کیسے مائل کیا جا سکتا ہے' اِس بارے میں ایسے نایاب نسخے تھے کہ اگر اِن میں سے چند پر ہی عمل کر لیا جائے تو گھر میں کھانے پینے کی چیزوں کی آمد جاری رہ سکتی تھی۔ اِس ضخیم کتاب پر گرنے سے قبل مَیں نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ اِس کتاب کا سرورق اور اندر کا پہلا آدھا صفحہ کسی انگریزی ناول کی تلخیص کا تھا جبکہ باقی تمام کتاب گھریلو ٹوٹکوں پر مشتمل تھی---چار سو پچاس روپے غارت کرنے کے بعد میں بہت افسردہ ہو گیا تھا۔ اَب تو میرا دِل چاہتا تھا کہ مَیں باس کو سامنے جا کر مار دوں۔

ٹھیک دو دِن بعد کی بات ہے کہ مجھے باس نے آفس میں ہی روک لیا۔ اپنے وقت پر سارا اسٹاف چلا گیا تھا۔ اِس وقت مَیں اور باس ہی تھے۔ باس اپنے کمرے میں کسی فائل پر کام کر رہا تھا جبکہ مَیں فضول بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کسی بکری کے بچے کو بھیڑیئے کے پاس باندھ دیا گیا ہو۔ اچانک میرے دماغ میں ایک خیال آیا کہ اِس وقت میں اور باس ہیں۔ اگر مَیں ب اس کے سر پر کوئی بھاری بھرکم چیز مار کر اُسے اِسی جگہ ڈھیر کر دوں اور سامان بکھیر کر اِسے واردات قرار دے دوں تو ابھی باس سے نجات مل سکتی ہے۔ اِس خیال سے مَیں اپنی جگہ سے اُٹھا اور کوئی سخت چیز دیکھنے لگا۔ مَیں مختلف میزوں پر جھک کر کسی آہنی چیز کی تلاش میں تھا کہ اچانک باس کی غراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے---؟''

مَیں یکدم ڈر کر چونکا۔ میرے پیچھے ہی باس کھڑا تھا' میری سانس اوپر نیچے ہو گئی تھی۔ مَیں نے فوراً بہانہ لگایا۔

''سر! چوہا---''

شغل+مغل

- ایک مندر میں بُری نیت رکھنے والے غائب ہو جاتے تھے۔ ایتا بھر گیا' وہ غائب ہو گیا۔ ہرینک گیا وہ غائب ہو گیا۔ اکشے گیا' وہ غائب ہو گیا۔ ایشوریہ گئی---بھگوان غائب ہو گیا۔
- ایک سکھ کو ہسپتال کی ایک نرس سے محبت ہو گی۔ اس نے خط میں لکھا کہ ''آئی لویو! سسٹر''
- لڑکا: زندگی کی راہ میں ہم دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے۔
- ☆ لڑکی: اور جب تھک گئے تو رکشہ کروا لیں گے۔
- آپ کو کبھی عقل سے پیدل چلنے کا بھی اتفاق ہوا ہے؟
- ☆ جی' کبھی کبھی آپ کے ساتھ بھی تو چلنا پڑتا ہے۔
- اس خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر آپ کیا سوچ رہے ہیں؟
- ☆ کاش! مَیں نے شادی نہ کی ہوتی۔
- محبت کرنے والے سائے سے بھی کیوں ڈرتے ہیں؟
- ☆ کیونکہ یہ سایہ عموماً بزرگوں کا ہوتا ہے۔
- شادی سے پہلے مرد کا دِل محبوبہ کے لئے دھڑکتا ہے لیکن شادی کے بعد؟
- ☆ پھر مزید محبوبہ کے لئے دھڑکتا ہے۔
- مجنوں لیلیٰ کی گلی کے کتے سے بھلا کیوں پیار کرتا تھا؟
- ☆ کیونکہ اُس کو معلوم تھا کہ عورت بے وفا ہے اور کتا وفادار!
- جب سے مَیں آپ کے گھر آیا ہوں' مکھیاں ہی مکھیاں دیکھ رہا ہوں۔
- ☆ دراصل جب بھی کوئی گندی چیز مکھیوں کو نظر آتی ہے تو یہ اکٹھی ہو جاتی ہیں۔
- ایک شخص نے تانگے والے کو روکا اور پوچھا کہ لاری اڈے تک جانے کا کرایہ کتنا لو گے؟
- ☆ دس روپے---!
- اور سامان کا کتنا کرایہ لو گے؟
- ☆ سامان مفت لے چلو گا۔
- اچھا' تم میرا سامان لے چلو مَیں پیدل ہی آتا ہوں۔

محمد صابر مغل عبدو پوری

''کہاں ہے---؟'' باس نے پوچھا۔

''ابھی اِدھر گیا ہے۔'' مَیں نے کہا۔

''ٹھیک ہے' پندرہ بیس منٹ تلاش کرو اور پھر چوکیدار سے کہہ کر آفس بند کرا دینا۔''

باس نے کہا اور چلا گیا۔ مَیں نے تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے سوچا کہ ایک چانس ملا تھا' وہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ ہی سوچتے ہوئے مَیں اِسی منزل کی بالکونی میں چلا گیا۔ سامنے دیوار پر پھلوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ مَیں نے اپنے بازو پھیلا کر ایک طویل انگڑائی لی اور اچانک میرا ہاتھ ایک گملے سے ٹکرا گیا' گملا نیچے جا گرا۔ مَیں پھر اندر آ گیا۔ اپنا بیگ اُٹھایا اور چوکیدار کو آواز دے کر اِس سے دفتر بند کرایا اور سیڑھیاں اُتر کر نیچے چلا گیا۔ جب مَیں اِس عمارت کا مین دروازہ عبور کر کے باہر نکل رہا تھا تو مَیں چونک کر رُک گیا۔ بہت سے لوگ جمع تھے' ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ مَیں نے کوشش کی کہ دیکھ سکوں کہ کیا ہوا ہے لیکن رش ہی اِتنا تھا کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ اِس کے بعد ایک کار تیزی سے اِس جگہ سے نکلی اور لوگوں کا رش بھی بکھرنے لگا۔

''کیا ہوا' بھائی صاحب---؟'' مَیں نے ایک سے پوچھا۔

''اوپر سے ایک گملا گرا جو سیدھا ایک آدمی کے سر پر لگا ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔

''اچھا---'' مَیں نے کہا اور ابھی دو قدم ہی چلا تھا کہ جیسے مجھے کسی نے نیند سے جگا دیا ہو۔ مَیں نے گھوم کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ سیمنٹ کا بنا ہوا ٹھوس گملا اوپر سے نیچے گر کر بھی نہیں ٹوٹا تھا۔ ''بھائی صاحب! یہ گملا لگا کس کے ہے؟'' مَیں نے جلدی سے اِسی آدمی سے پوچھا جس کا دھیان اوپر تھا اور وہ اُونچائی ناپ رہا تھا۔

''اِس کے لگا ہے' کیا نام ہے اِس کا---؟'' وہ یاد کرتے ہوئے بولا۔

''کون---کون---کون---'' مَیں نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

''وہ جن کا ایکسپورٹ اور امپورٹ کا کاروبار ہے۔'' وہ آدمی بولا۔

''صبغت بیگ صاحب---؟'' مَیں نے پہلے سے بھی زیادہ بے چینی سے پوچھا۔

''ہاں---ہاں' وہی---''

اُس نے کہا اور مَیں حیران رہ گیا کہ میرا اچانک ہاتھ لگا' وہ گملا باس کے سر پر لگ گیا۔ وہ آدمی اپنا ہی اندازہ لگاتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ اِس گملے پر کوئی کوا بیٹھا ہوگا اور جیسے ہی وہ کوا اُڑا ہوگا' گملا نیچے آ گرا۔ اَب وہ صاحب اِس دروازے سے باہر آ رہے تھے اور اوپر سے گملا نیچے آ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ صاحب گملے کے نیچے آئے' گملا اُن کے سر پر جا پڑا۔''

''جن کے سر پر گملا لگا ہے' وہ ٹھیک تو ہیں؟'' مَیں نے پوچھا۔

''بھائی! مجھے کسی نے آگے ہی نہیں ہونے دیا' مَیں کیا دیکھتا---؟'' وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولا' اِس جواب میں اُس کا افسوس جھلک رہا تھا۔

مَیں نے اِسی وقت گھر کی راہ لی۔ مجھے بڑی شدت سے کسی فون کال' اطلاع کا انتظار تھا جو مجھے باس کے بارے میں کسی سے ملتی لیکن ایسی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ ظاہر ہے' سارا اسٹاف چلا گیا تھا۔ ساری صورتِ حال کا تو صبح ہی پتہ چلنا تھا۔

اِس دِن مَیں شلوار قمیص میں دفتر گیا تھا۔ مَیں نے سوچا کہ تعزیت کے لئے یہ لباس ٹھیک ہے۔ جتنا مضبوط گملا تھا' اِس کا سر پر لگنا اور پھر بچ جانا ممکن نہیں تھا---مَیں آفس پہنچا تو سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ باس کے کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ مَیں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ سب میری جانب حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ مَیں شلوار قمیص میں کیوں ملبوس ہوں؟ مَیں اِس انتظار میں رہا کہ شاید کوئی مجھے باس کے بارے میں کوئی ناگہانی اطلاع دے لیکن کسی نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا۔ مَیں نے سوچا کہ شاید ابھی باس قومے میں ہوں گے۔ ہر فون کی گھنٹی سن کر مجھے یہ ہی لگتا تھا کہ باس کی کوئی خبر آ گئی ہے۔ مجھے ایک فائل باس کی میز پر رکھنی تھی۔ مَیں نے کہا کہ چلو' یہ فائل ہی اندر رکھ آؤں۔ اِسی دوران شاید باس کی کوئی اطلاع آ جائے۔ باس اپنے وقت سے ایک گھنٹہ لیٹ تھے۔ مجھے اُمید تھی کہ اَب وہ کبھی نہیں آئیں گے---مَیں فائل رکھ کر جیسے ہی مڑا میری چیخ نکل گئی اور اِس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ کرسٹل کے دوسرے گلدان سے جا لگا' چھناک کی آواز پھر آئی اور وہ گلدان ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا۔ باس جو ابھی اپنے کمرے میں آیا تھا' اُس نے یکدم اِسی جگہ رُک کر ایک نظر گلدان کی طرف اور دوسری نگاہ مجھ پر مرکوز کر دی۔ پہلی بار مَیں نے باس کا گنجا سر دیکھا' وہاں فقط ایک آلو دِکھائی دے رہا تھا۔ مجال ہے کہ گملا لگنے سے خون کی ایک بوند بھی نکلی ہو۔ مَیں نے ایک بل کھایا اور بے ہوش ہو کر فرش پر جا گرا۔

اَب مَیں اپنی ساری تنخواہ کرسٹل کے دونوں گلدانوں کی مد میں کٹواتا ہوں' دفتر میں باس اور گھر میں ابا اور اماں کی سنتا ہوں۔

☆☆

موبائل مسکراہٹیں

☆ ہارون حسرت

قدیم زمانے میں جب کوئی آدمی بازار میں اکیلا چلتا ہوا اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوگا تو اُسے دیوانہ یا پھر نیم دیوانہ تو ضرور سمجھا جاتا ہوگا مگر آج کل ایسا نہیں سمجھا جاتا کیونکہ جب کوئی آدمی بازار سے اکیلا چلتا ہوا باتیں کرتا نظر آئے تو اُسے غور سے دیکھنے پر معلوم ہوگا کہ اُس کے کانوں میں تاریں لگی ہوئی ہیں اور وہ موبائل پر کسی سے باتیں کرتا جا رہا ہے--- موبائل کے آنے سے پہلے ٹیلی فون تھے اور جس گھر میں ٹیلی فون ہوتا تھا' وہ گھر محلے کے دیگر گھروں پر اسی طرح حکمرانی کرتا تھا جس طرح امریکہ پس ماندہ ممالک پر کرتا ہے کیونکہ سارے محلے کے فون اِسی گھر میں آتے تھے جہاں فون لگا ہوتا تھا اور جو آدمی اِس گھر کے افراد کی نافرمانی کرتا تھا' اُس کا فون سننا بند کر دیا جاتا تھا اور یوں وہ اپنے عزیز واقارب سے کٹ کر رہ جاتا تھا۔ ویسے میرے خیال میں ٹیلی فون ہولڈر گھر کو دوسرے گھروں پر حکمرانی کرنے کا حق بھی حاصل تھا۔ وہ اِس طرح کہ بعض اوقات جون کی گرم دوپہروں میں وہ سو رہے ہوتے تھے تو اچانک فون کی بیل بج اُٹھتی تھی۔ وہ ٹیلی فون کے موجد گراہم بیل کو کوستے ہوئے فون اُٹھاتے تو دوسری طرف سے آواز آتی کہ آپ کے گاؤں کی دوسری طرف رحموں موچی کا گھر ہے' برائے مہربانی وہاں سے کسی کو بلا دیں' ہم تھوڑی دیر میں دوبارہ فون کرتے ہیں اور پھر بغیر جواب سنے فون بند کر دیا جاتا تھا--- اب فون اٹینڈ کرنے والا آدمی دوبارہ گراہم بیل کو کوستا ہوا بادل نخواستہ گاؤں کی دوسری طرف واقع رحموں موچی کے گھر پہنچتا تو باوجود دستک کے دروازہ نہیں کھلتا تھا کیونکہ سب جون کی گرم دوپہروں کو گھروں میں دبک کر سوئے ہوتے تھے۔ ایسی صورت میں ٹیلی فون ہولڈر گھر کے افراد کو دیگر گھروں پر حکمرانی کا حق تو حاصل تھا' نا! مگر اب موبائل کے آنے سے حاکم ومحکوم دونوں کی جان چھوٹ گئی ہے۔ موبائل وہ واحد چیز ہے جس کی قیمتوں میں مسلسل کمی ہو رہی ہے اور حکمران طبقہ عوام کی خوشحالی کا اندازہ موبائل کی فروخت سے لگا رہا ہے۔ تادمِ تحریر پاکستان موبائل کے استعمال میں دُنیا بھر میں پانچویں نمبر پر ہے۔ ہوسکتا ہے' آنے والے چند مہینوں میں پہلے نمبر پر چلا جائے۔

موبائل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اِس کی موجودگی میں کوئی شخص بوریت محسوس نہیں کر سکتا۔ اوّل تو اپنے کسی عزیز سے بات چیت کر سکتا ہے۔ اگر بیلنس کم ہو تو ایس ایم ایس کر سکتا ہے بلکہ بچوں نے آج کل ایس ایم ایس کو ایک گیم کا درجہ دے دیا ہے۔ اگر ایس ایم ایس کے لئے بھی بیلنس نہیں ہے تو گیم کھیل سکتا ہے' گانے سن سکتا ہے--- مذہبی لوگ موبائل کے بہت خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے فارغ اِنسان کے ہاتھ میں تسبیح ہوتی تھی مگر آج کل فارغ اِنسان کے ہاتھ میں موبائل آ گیا ہے جس میں فارغ اِنسان کے لئے گیمز' گانے' ویڈیو تو موجود ہے مگر تسبیح موجود نہیں ہے۔ موبائل سے نالاں ہونے کے باوجود مولانا حضرات نے آج کل ٹیلی فونک اور بذریعہ موبائل خطاب کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے--- کچھ مولانا حضرات نے دوسری ایجادات کی طرح موبائل کو بھی اِسلام کے خلاف ایک سازش قرار دیا ہے۔ میرا ایک جاننے والا ماشاءاللہ باریش اور شرع کے مطابق چلنے والا دینی مدرسے کا طالب علم ہے۔ ایک دِن اُس نے موبائل کے متعلق ایک تحریر کاغذ پر لکھ کر اِس کی فوٹو کاپیاں کروائیں اور اِسے دیواروں پر لگانے لگا۔ تحریر میں موبائل کو شیطانی ایجاد اور دورانِ نماز خلل ڈالنے والی چیز قرار دے کر اِس سے بچنے کی تلقین کی گئی تھی۔ ابھی وہ اِن اشتہارات کو دیواروں پر لگا ہی رہا تھا کہ خود اُس کی جیب میں موبائل پر ایک انگلش دُھن بجنے لگی اور مجھے اِس بات کی سمجھ بھی آ گئی کہ آج کل کے اِن لوگوں کے واعظ میں اثر کیوں نہیں رہا۔

پہلے پہل تو موبائل کی قیمت اتنی زیادہ تھی کہ غریب آدمی خواب میں بھی موبائل نہیں خرید سکتا تھا مگر اب ہر وہ غریب آدمی جس میں آٹا' چینی اور گھی خریدنے کی سکت نہیں ہے' وہ بھی موبائل کا مالک ضرور ہے اِسی لیے ہمارے حکمران ملک کی خوشحالی ظاہر کرنے کے لئے موبائل کی

ریکارڈ فروخت کا سہارا لیتے ہیں۔ پہلے پہل تو کوئی بزنس مین ہی موبائل رکھ سکتا تھا مگر اب ہر ریڑھی بان بلکہ سویپر کے پاس بھی موبائل موجود ہے۔

جہاں موبائل نے ہر بزنس مین اور سرکاری ملازموں کی مشکلات آسان کی ہیں' وہیں پر عاشقوں کی مشکلات بھی آسان کردی ہیں۔ پہلے تو عاشق دُنیا سے چھپ کر اپنے محبوب کو ملنے جاتے تھے یا پھر صفحات کے صفحات بھر کر بطور لو لیٹر بھیجا کرتے تھے جن کے پکڑے جانے اور بطور ثبوت پیش ہو جانے کا خطرہ رہتا تھا مگر اب موبائل آ گیا ہے۔ عاشق رات کو لحاف میں منہ دے کر باتیں کرتا ہے اور دوسری طرف اِس کی محبوبہ لحاف میں منہ دے کر سنتی ہے۔ فون سننے کے بعد نمبر ڈیلیٹ کر دیا جاتا ہے کیونکہ نمبر تو دِل پر لکھا ہوتا ہے' اِسے موبائل میں Add کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی --- یہ ایک ایسا طریقہ ہے جسے والدین پکڑ نہیں سکتے اور پھر موبائل کمپنیوں نے پانچ روپے فی گھنٹہ یا چار روپے فی گھنٹہ والی سکیمیں بھی تو عشاق کے لئے ہی متعارف کروائی ہیں ورنہ اِتنی مصروف زندگی میں اتنی فرصت کسے ہے کہ چار پانچ منٹ سے زیادہ بات کر سکے--- مجھے یقین ہے کہ اگر ہیر رانجھا' لیلیٰ مجنوں اور دیگر عشاق کے دور میں موبائل ایجاد ہو چکا ہوتا تو وہ ناکام ہرگز نہ ہوتے--- علاوہ ازیں یہ سکیمیں اِن لوگوں کو بھی بہت کام دیتی ہیں جنہوں نے دور دراز رشتہ داروں سے لڑنا جھگڑنا ہوتا ہے۔ اِن سکیموں کے آنے سے موبائل لڑائیاں عام ہوتی جا رہی ہیں۔ ویسے موبائل لڑائی اتنی زیادہ خطرناک نہیں ہوتی کیونکہ اِس میں ہاتھا پائی اور ڈنڈے لاٹھی کی بچت ہو جاتی ہے' صرف فریقین کو گلا ہی پھاڑنا پڑتا ہے۔ اور تو اور جب سے موبائل آیا ہے' ماؤں نے اپنے شیر خوار بچوں کو لوری سنانی بھی چھوڑ دی ہے۔ بس جب بچہ روتا ہے تو موبائل پر ٹیونز لگا کر چھوٹے بچے کے اوپر موبائل رکھ دیا جاتا ہے اور بچہ موبائل ٹیونز سنتے سنتے سو جاتا ہے اور لوری جسے ماہرین موسیقی قدیم ترین صنف گائیکی بھی تصور کرتے ہیں' موبائل کے آنے سے ختم ہوتی جا رہی ہے۔

موبائل نے جہاں دیگر شعبہ جات کو سہولیات دی ہیں' وہاں شعبہ ڈکیتی اور رہزنی کو بھی فائدہ دیا ہے کیونکہ ہر ڈاکو اور چور کو علم ہے کہ غریب سے غریب آدمی کی جیب میں بھی زیادہ نہیں تو کم از کم ہزار روپے والا موبائل تو لازمی ہو گا لہٰذا ڈاکو رقم وغیرہ بعد میں چھینتے ہیں اور موبائل پہلے اپنی تحویل میں لیتے ہیں۔

موبائل کے وجود میں آنے کے ساتھ مس کال کی صورت میں ایک عذاب بھی ساری دُنیا پر نازل ہوا ہے۔ اِس وقت آدمی کی حالت دیدنی ہوتی ہے جب وہ خاصا مصروف ہو اور اچانک موبائل بج اُٹھے۔ آدمی اپنی مصروفیت ہنگامی بنیادوں پر چھوڑ کر جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے لیکن ابھی ہاتھ جیب سے باہر بھی نہیں آتا اور بیل بند ہو جاتی ہے۔ بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی عمر رسیدہ خاتون کو ایس ایم ایس کرو کہ ''مس کال می'' تو وہ جواب میں مس کال کی بجائے کال کر لیتی ہے اور کال کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے زعم میں عمر رسیدہ ہنے کے باوجود خود کو ''مس'' سمجھتی ہے اور ایم ایس ایس کا مطلب سمجھتی ہے کہ ''مس! مجھے کال کرو''--- کچھ منچلے لڑکے اپنی طرف سے فرضی نمبر ڈائل کر کے کال کرتے ہیں۔ چونکہ اب موبائل کا استعمال اتنا بڑھ گیا ہے کہ کسی بھی کمپنی کا کوڈ ملانے کے بعد کوئی سے سات ہندسے پریس کر کے کال کرو تو وہ بھی کسی نہ کسی کا نمبر ہوتا ہے اور اگر کال ریسیو کرنے والی لڑکی ہو تو اُس کی جان چھوٹنی مشکل ہو جاتی ہے اور اگر ریسیو کوئی لڑکا کرے تو بہت خود اعتمادی سے پوچھتے ہیں کہ ''یہ فلاں صاحب کا نمبر ہے؟'' ریسیو کرنے والا نفی کرتا ہے تو فوراً ''رانگ نمبر'' کہہ کر موبائل بند کر دیا جاتا ہے۔

رینٹ اے کار اور رینٹ اے موٹر سائیکل کی طرح اب رینٹ اے موبائل کا کاروبار بھی شروع ہو چکا ہے اور محمد صفدر آنسو اِس کاروبار سے خوب منافع کما رہے ہیں۔ سب سے پہلے پاکستان میں جاز کمپنی آئی جس کا نام تو جاز تھا مگر اِس کی سم کی قیمت اور بات کروانے کے چارجز سب ناجائز تھے۔ پھر جیسے جیسے دوسری موبائل کمپنیاں مقابلے پر آتی گئیں' جاز کے ریٹ بھی ناجائز سے جائز ہوتے چلے گئے اور آخر کار 5 روپے فی گھنٹہ پر آ گئے۔ پھر یوفون' پاکٹل اور ٹیلی نار میدان میں آ گئیں اور سب سے آخر میں وارد بھی آن وارد ہوئی۔

اب تو لوگوں کو موبائل استعمال کرنے کا کافی شعور آ گیا ہے مگر شروع شروع میں جب صحیح استعمال نہیں آتا تھا تو نت نئے لطیفے جنم لیتے تھے۔ ہمارے ایک عزیز نے نیا موبائل خریدا اور اپنے ایک دوست کو کال کی پانچ چھ منٹ بات کرنے کے بعد جب ضروری باتیں ختم ہو گئیں اور کال منقطع کرنے کا وقت آیا تو اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ کال منقطع کس طرح کی جاتی ہے اور اپنے مخاطب سے پوچھتے ہوئے بھی شرم محسوس ہو رہی تھی۔ جب کوئی چارہ نہ چلا تو تھک ہار کر اپنے مخاطب سے کہنے لگا۔

''یار! مجھے کال منقطع نہیں کرنی آتی۔ پلیز' تم کال منقطع کر دو۔''

اِسی طرح میری ایک جاننے والی خاتون نے موبائل خریدا۔ اُسے خود تو گزارے لائق موبائل کا استعمال آتا تھا مگر اُس کی والدہ موبائل کو بالکل نہ سمجھتی تھیں۔ ایک دِن جب وہ باتھ روم میں تھی تو موبائل بج اُٹھا۔ اُس کی والدہ نے بجتے ہوئے موبائل کو اُٹھا کر بغیر بٹن پریس کیے کان

سے لگا کر ''ہیلو ہیلو'' شروع کر دی۔ محترمہ جب باتھ روم سے باہر آئیں تو والدہ کو خوب دیہاتی ہونے کے طعنے دیئے اور بتایا کہ جب موبائل کی بیل آئے تو گرین بٹن کو پریس کرتے ہیں' اس طرح آنے والی بیل کی آواز ختم ہو جاتی ہے تو پھر کان سے لگا کر بات کرتے ہیں۔ اُس کی والدہ نے یہ بات اپنے پھٹے پرانے دوپٹے کے پلو سے باندھ لی۔ جب دوبارہ ایسی ہی پوزیشن میں موبائل کی بیل بجی تو بوڑھی والدہ کو گرین بٹن پریس کرنے کا تو بھول گیا مگر اتنا یاد رہا کہ جب بیل کی آواز بند ہو جاتی ہے تو پھر کان سے لگا کر بات کرتے ہیں لہٰذا جب بیل بجتے بجتے بند ہو گئی تو پھر اُس نے موبائل کو کان سے لگا کر ''ہیلو ہیلو'' کرنا شروع کر دیا اور ایک بار پھر اپنی دھی رانی سے دیہاتی ہونے کے طعنے سنے--- اِسی طرح میرے ایک اور جاننے والے نے نیا نیا موبائل خریدا۔ اِس کی بیگم اُسے بیلنس ختم ہونے پر کہتی کہ آج موبائل میں پیسے بھی ڈال دو' جسے اُس کے بوڑھے والدین حیرانی سے سنا کرتے تھے۔ ایک دِن اِس کی والدہ نے پوچھا کہ بیٹا! موبائل میں پیسے کس طرح ڈالے جاتے ہیں' کیا اِس کو کھول کر اِس میں پیسے رکھ کر پھر بند کیا جاتا ہے یا کیا طریقہ کار ہوتا ہے؟--- میرے ساتھ میرا آٹھ دس سالہ بھتیجا تھا اور مَیں شاپنگ کی غرض سے سرگودھا شہر کو جا رہا تھا۔ راستے میں پولیس کی وین ملی جس پر لکھا ہوا تھا کہ ''پولیس موبائل وین تھانہ کینٹ'' میرے بھتیجے نے جب موبائل کا لفظ پڑھا تو مجھ سے پوچھنے لگا۔

''انکل! کیا پولیس کا موبائل اتنا بڑا ہوتا ہے اور اِس کے پیسے بھی ہوتے ہیں؟''

میرے جاننے والے ایک ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ موبائل کے آنے سے مریض بھی اتنے سہل پسند ہو گئے ہیں کہ کلینک پر آنا بھی پسند نہیں کرتے۔ پرسوں جب مَیں کلینک پر بیٹھا تھا تو ایک مریض کی کال آئی۔ موصوف بڑے پریشان معلوم ہو رہے تھے' میرے فون اٹینڈ کرنے پر فوراً بولے۔

''ڈاکٹر صاحب! مَیں اتنی ٹینشن میں ہوں کہ سو نہیں سکتا۔''

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن اپنے پیشے کے تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے مَیں نے نرمی سے کہا۔

''اللہ کے بندے! تم یہاں آؤ گے' مَیں تمہیں چیک کروں گا' پھر دوا دوں گا اور موبائل پر تو مَیں آپ کی اتنی خدمت کر سکتا ہوں کہ آپ کو لوری سنا دیتا ہوں اور لوری سن کر سو جاؤ۔''

مَیں ایک دِن موبائل پر وائس چینجر لگا کر دوستوں کو تنگ کر رہا تھا۔ وائس چینجر ایک ایسا آلہ ہوتا ہے جو موبائل پر مرد کی آواز کو عورت کی آواز بنا کر آپ کے مخاطب کو پیش کرتا ہے۔ اِس آلے کے ذریعے بہت سے لوگ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو اُلو بنا کر اُن سے موبائل کارڈز اور ایزی لوڈ حاصل کرتے ہیں لیکن مَیں تو صرف کچھ کنوارے دوستوں کو پریشان کرنے کے لئے وائس چینجر کا استعمال کیا کرتا تھا۔ اِس طرح مَیں نے کئی کنوارے دوستوں کو کمپنی باغ میں بلایا اور وہ کمپنی باغ میں آ کر کسی لیڈی کا انتظار کرتے پائے گئے لیکن آخر کار تھک ہار کر واپس چلے گئے۔ ایک دِن ایسا ہوا کہ اُونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا۔

ہوا یوں کہ ایک دِن جب موبائل کو وائس چینجر لگا ہوا تھا کہ میری بیوی کی کال آ گئی۔ مَیں نے کال ریسیو کرتے ہوئے ''ہیلو'' کہا تو بیگم صاحبہ نسوانی آواز سن کر آپے سے باہر ہو گئیں۔ مَیں نے لاکھ کہا کہ مَیں خود بول رہا ہوں مگر وہ تو ہتھے سے اُکھڑ گئی اور کہنے لگی۔

''تم جو بھی ڈائن اور چڑیل بول رہی ہو' مَیں تم سے خوب نمٹ لوں گی۔''

گھر آنے پر بھی بیگم نے صفائی کا موقع دیئے بغیر واویلا شروع کر دیا اور جنگ بندی کی شرط صرف یہ تھی کہ اِس چڑیل کا نام بتاؤ جو تمہارے موبائل پر بول رہی تھی۔ بڑی مشکل سے موبائل پر وائس چینجر لگا کر اُسے آواز چیک کروائی تب جا کر جنگ بندی عمل میں آئی۔ اِس دِن کے بعد مَیں نے وائس چینجر ندی میں پھینک کر سچے دِل سے توبہ کر لی کیونکہ جتنے لوگوں کو مَیں نے ستایا تھا' اِس کی سزا مجھے مل چکی تھی۔

ہمارے ایک جاننے والے جو کہ ''آداب عرض'' کے قاری ہیں' اُنہوں نے ایک دِن اپنا موبائل توڑ دیا۔ اصل میں یوں ہوا کہ اِن کا نمبر ''آداب عرض'' میں اِن کی غزل کے ساتھ شائع ہوا جسے پڑھنے کے بعد ایک لڑکی نے اِنہیں کال کر کے اِن کی غزل کی خوب تعریف کی۔ لڑکی کی آواز نے اِن کے کانوں میں کچھ ایسا رس گھولا کہ وہ لڑکی کی آواز کے سحر میں کھو کر دیوانے ہو گئے۔ اُنہوں نے اندازہ لگالیا کہ جس لڑکی کی آواز

نئی وزارتیں

☆ سوچ بچار اور غور و فکر دِماغ کے لیے مضر ہیں--- وزارتِ ٹینشن

☆ خواتین کے ڈائجسٹوں میں چھپنے والی لو اسٹوریاں' غیرت کے لیے سخت مضر ہیں--- وزارتِ شرم و حیا

☆ وڈیو گیمز اور موبائل فونز پڑھائی کے اوقات میں مضر ہیں--- وزارتِ اوقات

☆ محبت' صحت' والدین کی عزت اور مال دولت کے لیے مضر ہے' طبیعت زیادہ خراب ہو تو شادی کر لیں۔ تمام sms والدین کی پہنچ سے دور رکھیں--- وزارتِ عشق' حکومت دِل

☆ ہر راہ چلتی لڑکی کی چاہ اور چاہت دِل کے لیے مضر ہے--- وزارتِ دھڑکن

☆ تمام بیہودہ میسجز بچوں کی پہنچ سے دُور رکھیں--- وزارتِ اخلاقیات و اقدار

عاشر نثار احمد' حیدر آباد

میں اتنی مٹھاس ہے، اس کی شکل تو حوروں کو بھی مات کرتی ہوگی اور ویسے بھی لڑکی نے بتایا تھا کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ اندازِ گفتگو اور انگریزی الفاظ کے کثرتِ استعمال سے اُس کے ڈاکٹر ہونے کی تصدیق بھی ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دِنوں کے بعد ملاقات طے ہوگئی لیکن ہمارے دوست نے سوچا کہ ملاقات سے پہلے کیوں نہ ایک عام مریض کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحبہ کے کلینک پر جا کر دیدار کرلوں لہٰذا وہ اِس کے شہر روانہ ہو گئے۔ جب دیئے گئے ایڈریس پر پہنچے تو چکر کھا کر گرتے گرتے بچے کیونکہ موصوفہ ڈاکٹر تو تھیں لیکن 150 کلوگرام وزن کی 40 سالہ خاتون تھیں۔ ہمارے دوست نے اِسی وقت موبائل کو توڑا اور آئندہ سے موبائل رکھنے سے توبہ کرلی۔

ایس ایم ایس کا سلسلہ پورے ملک میں زور وشور سے جاری ہے۔ ایک اندازے کے مطابق گزشتہ سال کے دوران ایک اَرب سے زیادہ رقم کے ایس ایم ایس پاکستان میں ہوئے ہیں حالانکہ ہم ایس ایم ایس کو ایک معمولی سی چیز سمجھتے ہیں۔

ایس ایم ایس کرنے والے بعض دوست بہت ہوشیار ہوتے ہیں اِس لیے جب تک آپ پورا ایس ایم ایس نہیں پڑھ لیتے، اِس وقت تک کوئی بھی ردِعمل ظاہر نہ کریں۔ ایس ایم ایس کو اِس جگہ تک چیک کریں جہاں نیچے Sender کا نام آتا ہے، پھر کوئی ردِعمل ظاہر کریں۔ بصورت دیگر آپ کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوگا جیسا ہمارے ایک دوست کے ساتھ ہو۔

میرے ایک جاننے والے جو کراچی سے شائع ہونے والے ایک مشہور ماہنامے کے مدیر بھی ہیں، اِن کو ایک ایس ایم ایس ملا جس میں لکھا تھا کہ ''تم گنجے تھے، گنجے ہو اور گنجے ہی رہو گے بلکہ تمہاری سات نسلیں بھی گنجے کی ہی ہوں گی---'' اِس سے اگلا ایس ایم ایس پڑھنے کی ہمت نہ ہوئی، فوراً کال کر کے ایس ایم ایس کرنے والے پر چڑھائی کردی۔ ایس ایم ایس کرنے والا قہقہے لگاتا رہا اور کہتا رہا کہ میں نے جو لکھا ہے، سچ لکھا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آپ سارا ایس ایم ایس دوبارہ پڑھیں اور پھر مجھ سے بات کریں۔ اُنہوں نے بادل نخواستہ دوبارہ ایس ایم ایس پڑھا تو واضح ہوا کہ اوپر والا سارا فقرہ لکھنے کے بعد نیچے لکھا تھا۔

''کتیا نے گنجے سے کہا اور میکے چلی گئی۔''

یہ پڑھنے کے بعد ایک خفیف سی مسکراہٹ ہمارے دوست کے ہونٹوں پر آ گئی۔ کچھ ایسا ہی ایک ایس ایم ایس مجھے بھی آیا جس میں لکھا تھا۔

''صدر مشرف راولپنڈی میں خودکش حملے میں جاں بحق۔''

میں نے اِسی وقت ٹی وی آن کیا لیکن ٹی وی پر معمول کے پروگرام چل رہے تھے جس پر میں نے دوبارہ اپنے دوست سے رابطہ کر کے خبر کی تصدیق چاہی۔ وہ قسم کھانے کے لئے تیار ہوگئے کہ میں نے جو لکھا ہے، وہ سچ ہے، تم پورا ایس ایم ایس دوبارہ پڑھو۔ میں نے حیرانگی سے دوبارہ ایس ایم ایس پڑھا تو موجودہ خبر کے نیچے کافی جگہ خالی چھوڑ کر لکھا تھا۔

''ہونے والوں کے ورثاء کو ایک ایک لاکھ روپے دیں گے۔''

یہ پڑھ کر میں مسکرادیا اور اپنے دوست کی چالاکی پر اُس کو خوب داد دی۔

ہمارے ایک دوست جو کہ موبائل کی مرمت کا کاروبار کرتے ہیں، اِن کے ساتھ بھی ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اُن کے پاس ایک اَن پڑھ اور جاہل سا گاہک آیا جس کا موبائل آن ہی نہیں ہو رہا تھا۔ جب اُس سے پوچھا گیا کہ یہ خراب کیسے ہوا تو اُس نے بتایا کہ میں ایک معمار ہوں اور دوران کام میرا موبائل گارے میں گر پڑا تھا۔ میں نے گارے سے نکال کر فوراً پانی سے اِس کو دھویا اور دھونے کے بعد سے یہ بند ہوگیا ہے۔ میرے دوست نے جب یہ سنا تو دیہاتی کی طرف دیکھ کر مسکرایا مگر دیہاتی پھر بھی بات کی تہہ تک نہ پہنچا لیکن میرے قارئین ضرور بات کی تہہ تک پہنچ گئے ہوں گے۔

میری بیگم صاحبہ نے ایک دِن مجھے اُردو میں ایس ایم ایس کیا جس کا مضمون کچھ یوں تھا۔

''آج بکورے لے کر آنا۔''

میں نے سمجھا کہ شاید بکرا لکھا ہوگا مگر جلد بازی میں بکورے لکھا گیا ہے لہٰذا میں بکرا منڈی جا کر بکریوں کے ریٹ پوچھتا رہا لیکن ریٹ بہت زیادہ ہائی تھے اور اِس دِن جیب میں رقم بالکل معمولی تھی لہٰذا میں بکری خریدے بغیر گھر واپس چلا آیا۔ بیگم سے پوچھا کہ خیر تو ہے، آج بیٹھے بٹھائے بکری کی ضرورت کیوں پیش آ گئی اور بکری لانے کی فرمائش کیوں کی تھی؟ جس کے جواب میں بیگم نے قہقہے لگانے شروع کردیئے اور میں حیران ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔ جب اُس کے قہقہے کچھ تھمے تو اُس نے بتایا کہ میں نے بکری کی فرمائش نہیں کی تھی، میں نے تو لکھا تھا کہ ''آج پکوڑے لے کر آنا۔

میرے موبائل میں جو اُردو زبان ہے، اُس میں ''پ'' اور ''ے'' کا حرف نہیں ہے اور اِن حروف کے نہ ہونے سے پکوڑے کو بکورے ہی لکھا جائے گا--- یہ سننے کے بعد میں نے قہقہہ لگایا اور بتایا کہ اچھا ہوا آج میری جیب میں رقم زیادہ نہیں تھی ورنہ میں تو بکرا منڈی جا کر بکریوں کے

ریٹ پوچھتا رہا ہوں۔

اِسی طرح ایک دِن جب مَیں رات کو سویا ہوا تھا تو اچانک میرا موبائل بج اُٹھا۔ اتنی رات گئے جب میرا موبائل بجا تو مَیں پریشان ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ بٹن پریس کر کے پریشانی کے عالم میں موبائل کان کو لگایا تو ایک نسوانی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

''مَیں چاند پڑھتی ہوں' آپ کا نمبر دیکھا تو مس کال کر دی' آپ کی ٹیلی نار والی سمارٹ ٹیون پسند آئی تو بار بار سن رہی تھی اور تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔''

اتنا کہہ کر موبائل آف کر دیا جبکہ مجھے اگلے دو تین گھنٹے تک دوبارہ نیند نہ آ سکی۔ بس اِسی دِن سے سرِ شام اپنا موبائل آف کر کے سوتا ہوں تا کہ کوئی محترمہ خود ٹیون کے مزے لے کر میری نیند کو خراب نہ کر سکے۔

چاند میں میرا نمبر پڑھ کر کچھ شوخ قسم کے لڑکے مجھے مس کالز کے ذریعے پریشان کرنے لگے۔ جب کسی طرح سے میری جان چھوٹتی نظر نہ آئی تو مَیں نے اُن کی مس کالز کو پکڑنا شروع کر دیا مگر اُن پر پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا بلکہ لگتا تھا کہ اُن کے والد صاحبان کوئی سرکاری آفیسرز ہوں گے اور کرپشن کر کے ناجائز دولت سے اُن کو کارڈ پر کارڈ خرید کر دیتے ہوں گے اور وہ جسے جی میں آیا' تنگ کرتے ہوں گے۔ مَیں اِن کی مس کالز پکڑ پکڑ کر بھی تنگ آ گیا مگر وہ مس کالز کر کر کے تنگ نہ آئے۔ آخر کار مَیں نے اپنی قوم کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے اُنہیں کچھ اِس قسم کا ایس ایم ایس کیا۔

''بھائی! آپ کی مس کالز سے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے لیکن آپ مس کالز آج کل کچھ کم کر رہے ہیں۔ پلیز' دِن میں سو یا دو سو مس کالز ضرور آنی چاہئے۔ میری خوشی کا معاملہ ہے' پلیز انکار مت کیجئے گا۔''

اِس ایس ایم ایس کے بعد اُن کی مس کالز میں بتدریج کمی ہوتی گئی اور وہ مس کالز سے باز آ گئے۔

مَیں اپنی زمینوں کی طرف جا رہا تھا اور موبائل پر کسی دوست کا نمبر ڈائل کر کے کان کو لگا رکھا تھا۔ جب میرے دوست نے میری کال ریسیو کی تو اِس وقت مخالف سائیڈ سے ایک اور راہگیر بالکل میرے پاس آ گیا تھا۔ جب میرے دوست نے کال ریسیو کی تو مَیں نے کہا۔

''السلام علیکم' کیا حال چال ہیں' جناب؟''

مخالف سائیڈ سے آنے والا راہگیر بولا۔ ''وعلیکم السلام' مَیں بالکل خیریت سے ہوں۔''

جس پر میرا قہقہہ یقینی تھا۔ میرے قہقہے کو سن کر جب اِس راہگیر کی نظر میرے موبائل پر پڑی تو وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا اور تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا دور نکل گیا۔

ایک دفعہ مَیں اپنے گاؤں کی دوکانوں پہ شاپنگ کرنے گیا۔ سودا سلف میں گوشت' فروٹ' مونگ پھلی اور دیگر چیزیں شامل تھیں۔ دوکاندار نے ہزار روپے میں سے اپنی رقم کاٹ کر بقایا سو سو کے نوٹوں کی بجائے دس دس روپے کے نوٹوں کی صورت میں دیا۔ اب رقم کا حجم اتنا بڑھ گیا کہ جیب میں رقم کے ساتھ موبائل رکھنا مشکل ہو گیا لہٰذا مَیں نے موبائل کو مونگ پھلی والے شاپر میں ڈال لیا۔ گھر لا کر مَیں نے تمام شاپر بیگم کو پکڑا دیئے۔ ابھی شاپر بیگم کے ہاتھ میں ہی تھے کہ موبائل پر کسی کی کال آ گئی اور موبائل وائبریشن پر لگا ہونے کی وجہ سے تھرتھرانے لگا جس سے سارا شاپر بھی تھرتھرا گیا۔ بیگم نے ایک چیخ کے ساتھ شاپر چھوڑ دیا اور ساری مونگ پھلی فرش پر بکھر گئی۔ مونگ پھلی فرش پر بکھری تو میرے قہقہے فضا میں بکھر گئے۔

میرے کمپیوٹر کمپوزنگ سنٹر سے کمپوزنگ کرانے والوں میں ایک مولانا صاحب ہیں جو انگریزی سے نفرت کرنے کے باوجود اِن کی ایجادات سے فائدہ اُٹھاتے ہیں مگر ایجادات کو انگریزی ناموں سے پکارنے کی بجائے اُردو ناموں سے پکارتے ہیں۔ مثلاً لاؤڈ سپیکر کو ''مکبر الصوت'' کہتے ہیں۔ ٹیلی فون کو ''ہاتف'' اور موبائل کو ''دستی ہاتف'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ ایک دِن موصوف میرے پاس کمپوزنگ کرانے آئے تو مَیں نے اُن کے جذبے کو داد دی جس پر وہ خوشی سے پھول گئے لیکن اِن کے غبارے سے ساری ہوا اِس وقت نکل گئی جب مَیں نے اُن سے مس کال اور موبائل کے چارجر کی اُردو پوچھی۔ وہ مجھ سے وعدہ کر کے گئے کہ جلد ہی وہ مذکورہ چیزوں کی اُردو مجھے بتا دیں گے مگر تا حال واپس میرے کمپوزنگ پوائنٹ پر نہیں آئے۔ ایک دِن مَیں نے اُنہیں ساتھ والے کمپوزنگ پوائنٹ سے کمپوزنگ کراتے دیکھا تو مولانا صاحب کی بے بسی اور اپنی نادانی پر بہت افسوس ہوا۔

میری رائے میں موبائل سمیت کوئی بھی سائنسی ایجاد نہ تو اچھی ہوتی ہے اور نہ ہی بُری' اچھائی بُرائی تو اِنسان کے اپنے اندر ہوتی ہے۔ نیک اِنسان ہر چیز کو استعمال نیکی کے لئے کرے گا اور بُرا اِنسان ہر چیز کو بُرائی کے لئے استعمال کرے گا لہٰذا موبائل کوئی بُری چیز نہیں ہے بشرطیکہ اِس کا مثبت استعمال کیا جائے لیکن اگر کیمرے والے موبائل سے چوری چھپے خواتین کی تصاویر بنائی جائیں یا آواز ریکارڈ کی جائے تو اِس کا نتیجہ تو آپ کے رُخساروں پر نسوانی ہاتھ کے نشانات کی صورت میں ہی برآمد ہو گا لہٰذا احتیاط کیجئے۔

☆☆

ظلم وتشدد' چور بازاری' ڈاکہ' اغوا---آج کے مرد کا شیوہ! نازیہ ناز نازی

سندیسے

''چاند'' کے شوخ وشریر ساتھیوں کی آپس میں ہنستی مسکراتی سرگوشیوں کے علاوہ چھیڑخانی والی ''تو تو' میں میں'' کے لئے یہ کالم مخصوص ہے۔ آپ بھی کسی کے نام اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتے ہیں تو ہم بلامعاوضہ آپ کا یہ پیغام پہنچا دیں گے لیکن ذرا حدِ اَدب کا خیال رہے اور طوالت کا بھی---سندیسے اِس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج سندیسے تیس روزہ ''چاند'' شمع پلازہ' فیروز پور روڈ' لاہور 54600

محترم شاہد اطہر! آپ کی ''مکس پلیٹ'' کافی چٹخارے دار ہوتی ہے' بندہ اُنگلیاں ہی چاٹتا رہ جاتا ہے---سیّد ابرار بخاری صاحب سے جب بھی میری بات فون پر ہوتی ہے' پنجابی میں ہی ہوتی ہے---محترم فضل کریم شگفتہ! چاچا جان' کیسے مزاج ہیں؟ دُعاؤں اور نیک خواہشوں کے بنڈل آپ کی نذر---محترم سید ابرار بخاری' شاہ صاحب! طویل مزاحیہ کہانیاں لکھنے میں آپ کا جواب نہیں ہے لیکن ایک طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد ہی آپ کی ایسی کوئی تحریر پڑھنے کو ملتی ہے---محترم ظفر ندیم وہرہ! ''بکرے کی تلاش'' بہت ہی اچھی تحریر تھی۔ لکھتے رہا کریں' لکھنے سے غم ہلکے ہو جاتے ہیں---محترم محمد سعید خان! آپ ''چاند'' پر بج درجے سے آتے ہیں۔ ''نگاہ انتخاب'' کا سلسلہ خوب ہے۔ سدا خوش رہیں' ہنستے ہنساتے رہیں--- بھائی شوکت علی مظفر! جناب مدت ہوگئی ہے کالم کے علاوہ آپ کی کوئی طویل تحریر پڑھنے کو نہیں ملی۔ آپ کے لئے ڈھیروں دُعائیں--- بھائی یادش منصور! آپ اپنے سندیسوں اور تبصروں میں مجھے ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اور میں اکثر کوتاہی کر جاتا ہوں۔ یقیناً زیادتی کرتا ہوں لہٰذا معذرت چاہتا ہوں۔ آپ بھی کوئی ماڑا موٹا جوال (موبائل) لے لیں' نا! پھر اللہ نے چاہا تو رابطہ رہے گا--- بابو جان! آپ جیسے بھائیوں کو کوئی کیسے بھول سکتا ہے؟--- بھائی امین بابر! کیسے ہیں جناب؟ بہت دُکھی دُکھی ٹونز بھروا رکھی ہیں آپ نے اپنے جوال (موبائل) میں۔ مجھ جیسا کوئی پردیسی جب سنتا ہے تو اُس کے دل پر کیا بیتتی ہے' آپ بھلا کیا جانیں---محترم احمد حسیب قیصر! اَن گنت دُعائیں آپ کے لیے--- بھائی منیر احمد شہزاد بلوچ! آپ کی محبتوں اور خلوص کا بیحد شکریہ۔ اللہ آپ کو خوش رکھے--- بھائی محمد محبوب ملک! یاد آوری کا شکریہ۔ آپ میری دُعاؤں میں شامل ہیں--- بھائی عادل گلزار! جناب' آپ کا کیا حال ہے؟ بے شمار خلوص' چاہتیں اور دُعائیں آپ کے لئے--- اصلی ہیرا! آج کل ملک کے حالات بہت خراب ہیں۔ بدمعاشی' چوری اور لوٹ مار بڑھ گئی ہے۔ اپنی بہت زیادہ تشہیر سے پرہیز کریں۔ کہیں کوئی لٹیرا آ کے آپ کو لوٹ ہی نہ لے۔ اپنا بہت زیادہ خیال رکھا کریں' بہتر تو یہ ہے کہ اپنی حفاظت کے لئے کوئی باڈی گارڈ رکھ لیں۔ پھر اُس باڈی گارڈ کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے ایک اور گارڈ رکھ لیں اور صبح وشام سیف گارڈ سے نہایا کریں---توصیف بھائی! آپ کا کیا حال ہے؟ بے شمار دُعائیں اور نیک خواہشات آپ کے لئے--- بھائی محمد فہیم صدیقی! اچھے بھائی' آپ مجھے یاد رکھتے ہیں تو بھلا میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں؟ آپ سے بس اتنی سی استدعا ہے کہ مجھ سے کبھی خفا مت ہونا--- بھائی انوار ارشد مغل! کیا حال ہے' جناب؟ آپ کے لئے دُعاگو رہتا ہوں۔ خوش وخرم رہیں--- بھائی عبدالقیوم اسد! آپ نے قلیل عرصہ میں نمایاں کارکردگی دکھائی ہے۔ یونہی دھڑا دھڑ لکھتے رہئے' آپ کی تحریر میں روز بروز نکھار پیدا ہوتا جارہا ہے---محترم جناب خالد بن حامد صاحب! آپ کے آپریشن کے بارے میں جان کر دل کو دھچکا سا لگا۔ دل سے آپ کے لئے دُعائیں نکل رہی ہیں۔ اللہ کرے آپ جلد سے جلد شفایاب ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز فرمائے۔ آپ اور اُدی عصمت ضیاء سدا سلامت اور خوش رہیں اور یونہی اُداس لوگوں میں خوشیاں بانٹتے رہیں--- چاند فیملی کے دیگر تمام بزرگوں' بھائیوں اور بہنوں کو درجہ بہ درجہ آداب' سلام۔ بچوں کو بیحد پیار!

❁ منظور احمد اعوان' مدینہ منورہ' سعودی عرب

☆

سویٹ فرینڈ عصمت ضیاء صاحبہ! پچھلے ماہ میں غیر حاضر نہیں تھی میں نے سندیسہ بھیجا تھا' پتہ نہیں کیوں نہیں چھپا۔ آپ کا یاد کرنا اچھا لگا' آئندہ بھی یاد فرماتی رہا کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے ہماری دُعاؤں کے سنگ--- ایس گیلانی! وعلیکم السلام۔ خوش رہیں اپنے خرچے پر--- حرا اعوان! میں یہاں چاند پر ہی ہوں' کہیں بھی نہیں گئی۔ لو' تمہیں آواز دے دی۔ اب یہ نہ ہو کہ میں آوازیں ہی دیتی رہوں اور گلا بیٹھ جائے--- یادش منصور! ہماری طرف سے بھی جوابی سلام وصول کرو اور چلتے بنو--- شاہد روف! ویلکم کہنے پر ممنون ہوں۔ ہم بڑھکیں نہیں مارتے بلکہ ہم کچھ کر کے دکھانے والوں میں سے ہیں اسی لئے تو چاند کے کاکوں کو ہم نے نتھ ڈالی ہوئی ہے--- نعیم قریشی! آپ غیر حاضر رہے' آپ سے زیادہ ہمیں خوشی تھی کہ چلو ایک احمق تو خاموش ہوا--- منظور احمد اعوان! مدینہ منورہ میں ہمارے لئے بھی دُعا کیا کریں--- اِس مرتبہ اِس چھوٹے سے سندیسے پر گزارہ کریں' آئندہ تفصیلی بات ہوگی۔

❁ نازیہ ناز نازی (مس پیشانیاں)' میرپور

☆

جناب خالد بن حامد صاحب! کیسے ہیں؟ محترمہ عصمت ضیا نے تو سخت سردی میں ہمارے پسینے چھڑوا دیے تھے کہ آپ کراچی آنے کے لئے بے چین تھے مگر آج ہی آپ سے بات کر کے دل کو کافی فرحت اور تازگی نصیب ہوئی ہے ورنہ محترمہ نے تو کوئی کسر نہ چھوڑی تھی ہماری ننھی سی جان کو اوپر پہنچانے کی۔ ہماری یہ حالت اِس لئے ہوئی کہ ہمارے خیال میں ہم سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں (مار' ڈانٹ' ککے) مگر ہم سے یہ کبھی برداشت نہیں ہوتا کہ کوئی ہم سے ناراض ہو جائے اور وہ بھی آپ' ہاں محترمہ چاہے ناراض ہو جائیں' ہمیں اِس کی پرواہ نہیں--- ارے' ارے محترمہ! پوری بات تو سنیں۔ آپ کی ناراضگی کی ہمیں اِس لئے فکر نہیں کہ ہمیں پتہ ہے ہماری بہنیں اوّل تو ہم سے ناراض نہیں ہوتیں (اللہ کا شکر ہے کبھی غرور نہیں کیا) اگر خدانخواستہ ہو بھی جائیں تو بہنوں کو منانا تو ہمارے لئے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ شکر ہے' آپ نے سکون کا سانس تو لیا) اور آپ نے کہا کہ ہر جگہ آپی کام نہیں آتی۔ بالکل ٹھیک کہا آپ نے مگر ہر جگہ آپی کی دُعائیں تو ساتھ ہوتی ہیں' نا! اور ویسے بھی جس بندے کے ساتھ اماں جان اور بہنوں کی دُعائیں ہوں' نصیب بھی ہمیشہ اِس کا ساتھ دیتے ہیں (بس بھئی' ورنہ چندا فیملی کو شبہ ہوگا کہ مکھن لگا رہا ہوں)---مسٹر ڈب کلاں! یاد کرنے کا شکریہ--- جناب توصیف احمد توصی! آپ کو مبارک ہو کہ آپ نے ہمیں پہچان لیا۔ اب اسی خوشی میں آٹے سے بھرا ایک ٹرک ہماری طرف روانہ کرو---محبوب (نارزن) یہ (نار) کیا ہے (زن) تو سمجھ میں آتا ہے اور شیر چاہے لاہور میں ہو یا کہیں بھی' شیر شیر ہی رہتا ہے--- تمام چندا فیملی کو پیار بھرا سلام!

❁ بابو جان

ربط مت کریں

پیراڈی ایک دقیق فن ہے اور اس فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی شعر میں الفاظ کا کچھ ایسا ہیر پھیر کیا جائے کہ اس کا مفہوم یکسر بدل جائے اور شعر کی ''صحت'' پر بھی مضر اثرات نہ پڑیں۔ اسی رہنما اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ فلمی نغموں اور فلمی و غیر فلمی نظموں، غزلوں کی دُرگت بنا سکتے ہیں۔ اگر آپ اِس کوشش میں کامیاب ہو جائیں تو اصل کلام کے ساتھ اپنی کوشش ہمیں بھجوا دیجئے۔ ہم یہاں اِسے شائع کریں گے تاکہ دوسرے بھی اِس سے لُطف اندوز ہو سکیں۔ اپنی ''مکریں'' اس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج ''مکریں'' تمیں روزہ ''چاند'' F-31، شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور 54600

تیمور حسن تیمور

محبت کا اثر ہوگا، غلط فہمی میں مت رہنا
وہ بدلے گا چلن اپنا، غلط فہمی میں بہت رہنا
تسلی بھی اُسے دینا، یہ ممکن ہے، مَیں لوٹ آؤں
مگر یہ بھی اُسے کہنا، غلط فہمی میں مت رہنا
تمہارا تھا، تمہارا ہوں، تمہارا ہی رہوں گا مَیں
مرے بارے میں اِس درجہ غلط فہمی میں مت رہنا
محبت کا بھرم ٹوٹا ہے، اب چھپ چھپ کے روتے ہو
تمہیں مَیں نے کہا تھا نا، غلط فہمی میں مت رہنا
بچا لے گا تجھے صحرا کی تپتی دُھوپ میں تیمور
کسی کی یاد کا سایہ، غلط فہمی میں مت رہنا

نوید ظفر کیانی

محبت کا اثر ہوگا، غلط فہمی میں مت رہنا
کہ مانے گا ترا ابا، غلط فہمی میں مت رہنا
تسلی بھی اُسے دینا، مَیں لوٹا دُوں گا ہر قرضہ
مگر یہ بھی اُسے کہنا، غلط فہمی میں مت رہنا
کنوارا تھا، کنوارہ ہوں، کنوارہ ہی رہوں گا مَیں
نہیں قربانی کا بکرا، غلط فہمی میں مت رہنا
رقیبوں نے جو سر توڑا تو بھوں بھوں کر کے روتے ہو
تمہیں مَیں نے کہا تھا نا، غلط فہمی میں مت رہنا
بچالے گا تجھے سسرال کی دیرینہ شامت سے
یہ نسخہ جی حضوری کا، غلط فہمی میں مت رہنا

محسن نقوی

یہ دِل، یہ پاگل دِل میرا، کیوں بجھ گیا، آوارگی!
اِس دشت میں اِک شہر تھا، وہ کیا ہوا، آوارگی!
کل شب مجھے بے شکل کی آواز نے چونکا دیا
مَیں نے کہا، تو کون ہے، اُس نے کہا، آوارگی!
لوگو! بھلا اِس شہر میں کیسے جئیں گے ہم جہاں
ہو جرم تنہا سوچنا، لیکن سزا آوارگی
یہ درد کی تنہائیاں، یہ دشت کا ویراں سفر
ہم لوگ تو اُکتا گئے، اپنی سنا، آوارگی!
اِک اجنبی جھونکے نے جب پوچھا میرے غم کا سبب
صحرا کی بھیگی ریت پر مَیں نے لکھا، آوارگی!
کل رات تنہا چاند کو دیکھا تھا مَیں نے خواب میں
محسنؔ مجھے راس آئے گی شاید سدا آوارگی

ہارون حسرت جالندھری

تھیٹر، ڈرامہ آج کا، پھیلا گیا بیہودگی
ماضی میں تھا جو حیا ذرا، وہ کیا ہوا، بیہودگی!
کل شب مجھے اِک فلم کے اِک سین نے چونکا دیا
مَیں نے کہا، تو کون ہے، اُس نے کہا، بیہودگی!
''وِد فیملی'' اِن فلموں کو دیکھے کوئی کیسے بھلا
ہو جرم کپڑے پہنا، جس کی سزا بیہودگی
کبھی جگت ٹھاکر کی سُنی، کبھی ناچ نرگس کا ہوا
ہم لوگ تو اُکتا گئے، اب باز آ، بیہودگی!
پوچھا، موجودہ فلموں کی ناکامی کا مجھ سے سبب
سوچا ذرا جو غور سے، مَیں نے کہا، بیہودگی
کل نیم عریاں ریما کو دیکھا تھا مَیں نے خواب میں
حسرتؔ مجھے راس آئے گی شاید سدا بیہودگی

تنویر پھولؔ

دِل شکستہ تو روتے رہیں گے
منہ کو اَشکوں سے دھوتے رہیں گے

لامبدّل اُصولِ زمانہ
کاٹیں گے وہ' جو بوتے رہیں گے

چند روزہ ہے یہ عمرِ فانی
اور تاحشر سوتے رہیں گے

دیکھ کر دِل کی بڑھ جائے دھڑکن
حادثے ایسے ہوتے رہیں گے

ہاتھ پرہاتھ دھرکے جو بیٹھے
اپنی قسمت کو روتے رہیں گے

منزلِ ارتقا' غیر ممکن
وقت اپنا جوکھوتے رہیں گے

تشنگی اُن سے اپنی بجھالو
بہتے زمزم کے سوتے رہیں گے

دوستی کا جنہیں ادّعا ہے
دِل میں ناوک چبھوتے رہیں گے

پھولؔ! اشعار اپنے گہر ہیں
موتیوں کو پروتے رہیں گے

تنویر پھولؔ

تیرے عاشق تو روتے رہیں گے
تیرے آنگن کو دھوتے رہیں گے

سب رقیبوں پہ کرنا ہے حملہ
فصل مرچوں کی بوتے رہیں گے

رَت جگا شاعروں کی ہے قسمت
دوپہر میں بھی سوتے رہیں گے

اُس کی اماں نے' ابا نے دیکھا
پھڈّے ایسے تو ہوتے رہیں گے

شیخ جی ساتھ شیخانی کے ہیں
منا' منی تو روتے رہیں گے

تجھ سے اُس کا ملن' غیر ممکن
ساتھ کھوتی کے کھوتے رہیں گے

ہو رہی ہے اذانِ سحر بھی
شیخ جی خوب سوتے رہیں گے

توند کا حجم کم کر لو' ورنہ
اُنگلیاں وہ چبھوتے رہیں گے

پھول جی! آپ کی ٹکروں سے
خوں سے ماتھا بھگوتے رہیں گے

فلم میرے حضور

ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے
لبوں پہ نغمے مچل رہے ہیں' نظر سے مستی چھلک رہی ہے
وہ میرے نزدیک آتے آتے حیاء سے اِک دِن سمٹ گئے تھے
مرے خیالوں میں آج تک وہ غزل کی جھانجھر جھنک رہی ہے
تڑپ مرے بے قرار دِل کی' کبھی تو اُن پر اثر کرے گی
کبھی تو وہ بھی جلے گے اُس میں' جو آگ دِل میں دہک رہی ہے
کبھی جو تھے پیار کی ضمانت وہ ہاتھ ہیں تحیر کی امانت
جو قسمیں کھاتے تھے چاہتوں کی' اُنھی کی نیت بہک رہی ہے

ڈاکٹر جاوید پنجابی

ہمارے شہروں کے سارے نالوں سے موج مستی چھلک رہی ہے
گٹر بھی سارے اُبل رہے ہیں' گڑھوں میں کیچڑ چمک رہی ہے
وہ میرے نزدیک آتے آتے سڑک پہ اِک دِن پھسل گئے تھے
مرے خیالوں میں آج تک وہ سڑک کی پھسلن کھنک رہی ہے
بغیر ٹوپی نہ نکلو باہر یہ دُھوپ سر پر اثر کرے گی
ہوا ہے خرچہ' مگر تمہاری یہ ٹنڈ اچھی چمک رہی ہے
جو دی ہے پچیس ہزار رشوت' ہوئی ہے تھانے سے جب ضمانت
مگر پڑے ہیں جو مجھ کو چھتر' مری طبیعت بہک رہی ہے

مَیں نے اُسے دیکھا اور پھر۔۔۔ میری ہمت جواب دے گئی کہ ایسا منحوس چہرہ دوبارہ دیکھنے کی جرأت کروں سیّد شعبان گیلانی

چاند نگر
مختلف موضوعات پر ہنستی مسکراتی، کھلکھلاتی منّی تحریریں

''چاند نگر'' ایسی شوخ تحریروں سے آباد ہوتا ہے جو طوات کے لحاظ سے ''نابالغ'' لیکن شوخی اور شرارت میں بالغ ہوتی ہیں۔ آپ بھی اِس میں جگہ حاصل کر سکتے ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ آپ کی تحریر میں مزاح کوٹ کوٹ کر بلکہ ٹھونس ٹھونس کر بھرا گیا ہو۔ یہ خیال بھی رکھئے کہ یہ مسکراہٹیں آپ کی اپنی تخلیق ہوں، کہیں سے اُڑائی نہ جائیں۔ اپنے مختصر مضامین اِس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج ''چاند نگر'' تیس روزہ ''چاند'' ، شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور 54600

نکتہ چینی

سید بدر سعید، لاہور

نام کتاب : طنز و مزاح کا اِنسائیکلو پیڈیا
مرتب : نذیر انبالوی
صفحات : 1168 (صرف)
قیمت : 500 روپے (صرف)
ملنے کا پتہ : مشتاق بک کارنر۔ الکریم مارکیٹ اُردو بازار، لاہور

زیادہ تر لوگوں کی طرح ہمیں بھی نکتہ چینی کی عادت ورثہ میں ملی ہے۔ پردادا حضور انگریز سرکار پر خوب خوب کیچڑ اُچھالا کرتے تھے۔ دادا حضور نے دین کا علم حاصل کیا اور عالم دین بننے کے بعد دینی کتب تحریر کیں اور اِسلام کے خلاف اُٹھنے والی تحریکوں پر دِل کھول کر نکتہ چینی کی۔ والد محترم کو تو ہماری ہی اوٹ پٹانگ حرکتوں پر اعتراض رہتا ہے لہٰذا وہ اکثر و بیشتر ہم پر چینی چھڑکنے کے بعد پانی پانی کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک دِن کہنے لگے۔

''برخودار! ماشاءاللہ آج کل خوب دِل لگا کر پڑھ رہے ہو۔۔۔''
ہم ابھی خوش بھی نہ ہو پائے تھے کہ اُنہوں نے ایک خوبرو حسینہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ''یہ نوٹس آپ کی کتاب سے برآمد ہوئے ہیں۔''

ہم نے لاکھ کوشش کی کہ اُنہیں بتائیں کہ یہ کتاب ایک اور لائق فائق دوست کی ہے اور ''نوٹس'' کا ہمیں سرے سے ہی پتا نہیں تھا (اگر پہلے پتا چل جاتا تو ضرور فوٹو کاپی کروا لیتے) لیکن کہاں جناب؟ والد صاحب اپنا کام کر کے جا چکے تھے اور ہم مفت کی بدنامی مول لے چکے تھے۔

کہتے ہیں اِنسانی شخصیت پر ماحول اور معاشرے کا بھی بہت اثر ہوتا ہے لہٰذا ہمیں نکتہ چینی کی عادت معاشرے سے بھی ملی ہے۔ ہم بچپن سے دیکھتے آئے ہیں کہ محلے کی خواتین جب کسی سبزی فروش سے کچھ خریدنے لگتی ہیں تو گھنٹوں بحث کرتی ہیں۔ ایک ایک چیز پر نکتہ چینی کرتی ہیں، اِن کا بس چلے تو گاجر پر بھی میڈ اِن جاپان کی مہر لگوا دیں۔ اتنی بحث سننے کے بعد اگر دریافت کیا جائے کہ کیا خریدا ہے تو جواب ملتا ہے آدھ پاؤ چنے کی دال اور وہ بھی پچھلی دوکان سے۔۔۔ اتنی لمبی تمہید باندھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم آپ کو سمجھا سکیں کہ ہم میں نکتہ چینی کے جراثیم کیسے پیدا ہوئی۔ ہم نے نکتہ چینی کے لئے اَدب کا انتخاب کیا۔ چند احباب سے مشورہ کیا تو اُنہوں نے بھی حوصلہ افزائی کی، کئی ایک نے تو خوب پیٹھ ٹھونکی۔ ایک پہلوان صاحب نے تو شاباش دیتے ہوئے جو تھپکی دی تو کندھا ہی اُتار کر ہاتھ میں پکڑا دیا۔ دوستوں کی ''حوصلہ افزائی'' کے بعد ہم نے بطور تبصرہ نگار عوام کی خدمت میں حاضری دی۔ یہ الگ بات کہ جن دوستوں نے حوصلہ افزائی کی تھی اب سر پکڑ کر روتے ہیں کیونکہ غلطی سے وہ سب صاحبِ کتاب ہیں۔

بہرحال، کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے تھوڑا عرصہ ہی گزرا ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کے نزدیک زمانے کی رفتار کیا ہے۔ کچھ لوگ تھوڑا عرصہ سے مراد کل پرسوں کی بات سمجھیں گے، کچھ لوگوں کے لئے دو سال تھوڑا عرصہ ہوتا ہے، کچھ لوگ بیس پچیس سال سمجھیں گے اور کچھ ہم جیسے وسیع نظر بھی ہوں گے جن کے نزدیک صدیاں بھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوتی (جیسے تاریخ دان)۔۔۔ قصہ مختصر، ہم نے اب تک جتنی کتابوں پر تبصرہ کیا اور جب بھی کیا، سنجیدہ ہی کیا لیکن اِس مرتبہ ہمارے ایک دوست نے اپنے ایک دوست کی کتاب عنایت فرمائی اور حکم دیا کہ اِس پر طنز و مزاح کے پیرائے میں تبصرہ کیا جائے۔

یہ کتاب نذیر انبالوی نے مرتب کی جبکہ مزاحیہ تبصرہ کرنے کا حکم حافظ مظفر محسن نے دیا۔ ہم اب تک موصوف کی کم و بیش چار کتابوں کی عزت خراب کر چکے ہیں اور اتنی ہی مزید کتابوں کو اغوا کر چکے ہیں (شاید

اِن کی نذیر انبالوی سے لڑائی ہوئی ہے جو یہ حکم دیا ہے) بہرحال' کتاب تھماتے ہوئے کہنے لگے یہ کتاب اُدب پر بھاری ہے۔ ہم نے فوراً اِن کی تصدیق کر دی کیونکہ کتاب واقعی بہت بھاری تھی' خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کم از کم ایک کلو کی تو ضرور ہوگی۔ بازار سے خریدیں تو پانچ سو کی ملے گی لیکن ردی میں بیچ دیں تو دس روپے فی کلو کے حساب سے صرف اِس کتاب کے ہی دس روپے مل جائیں گے--- چھابڑی والے کو اِس کتاب کا یہ فائدہ ہے کہ وہ صرف اِس کتاب کی مدد سے ہی تقریباً بارہ سو گاہک نمٹا سکتا ہے۔ اگر چوری ہو جائے تو چور خود واپس کر کے جائے گا کہ اتنی ضخیم کتاب کا مطالعہ ہر شخص کے بس میں نہیں' بھاری اتنی ہے کہ کسی کے سر پر ماریں تو اِس کا سر پھٹ جائے اور اِس کتاب کے مرتب کرنے کا اصل مقصد بھی یہی نظر آتا ہے--- اِس کتاب کے بارے میں بیگم کی رائے یہ ہے کہ اگر اِس کو آگ لگا دی جائے تو اِس آگ پر مرغا پکایا جا سکتا ہے۔

پہلی نظر میں کتاب کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ٹائٹل پر اپنی تصویر لگانے کے لئے جن چار مصوّر حضرات سے رابطہ کیا' وہ پکاسو کے شاگرد اور تجریدی آرٹ کے ماہر تھے لہٰذا اُنہوں نے جو تصاویر تیار کیں' اُنہیں دیکھ کر پولیس نے مصنف کو چار اشتہاری مجرموں کے شعبے میں گرفتار کر لیا ہوگا لیکن یہ صرف ہمارا خیال ہے' اصلیت یہ ہے کہ یہ تصاویر بچوں کو ڈرانے کے کام آ رہی ہیں--- مصنف کو کتاب مارکیٹ میں لانے کی جلدی تھی لہٰذا اُنہوں نے اِنہی تصاویر سے کام چلا لیا۔

اِس کتاب کا دیباچہ پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نذیر انبالوی صاحب کو سیاست کا بھی شوق ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بجا نہ ہوگا کہ وہ ایک کامیاب سیاستدان ہیں۔ اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ دیباچے کی ضرورت نہیں اور ساتھ ہی دیباچہ بھی لکھ دیا--- اِس بات کا اعادہ کیا کہ دوستوں کی تعریف اور نام لکھنے کی ضرورت نہیں اور تین عدد دوستوں کا نام لکھ دیا۔ شاید کل کو ایک ساتھ تین گلاس ٹھنڈے پانی کے چڑھا لیں اور پھر کہیں کہ باتھ روم جانے کی حاجت نہیں--- مصنف نے کم و بیش 138 لکھاری حضرات کے نمونے شامل کئے ہیں جن میں نثری مزاح' صحافتی مزاح' مزاحیہ غزلیں' نظمیں' پیروڈی شامل ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ عوامی مزاح کے عنوان سے کٹ پیس' ہری مرچیں اور اِسی قسم کا سلاد بھی شامل کیا گیا ہے اور کتاب کے آخر میں مزاحیہ کارٹون بھی شامل کر کے مزاح کو مکمل طور پر اکٹھا کر دیا ہے۔

موصوف نے اُردو اُدب کے قدیم لکھاری حضرات جن میں مرزا اَسداللہ خان غالب' منٹو' چراغ حسن' سر سیّد احمد خان' ابن انشاء' شفیق الرحمٰن سے لے کر جدید دور کے نامور مزاح نگاروں' عطاالحق قاسمی' ڈاکٹر محمد یونس بٹ' اعتبار ساجد' گل نوخیز اختر' حافظ مظفر محسن' فاروق قیصر' اطہر شاہ جیدی' خالد مسعود سمیت بے شمار آثار قدیمہ اور آثار جدیدہ کو یکجا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اِس کتاب کو آٹے کا نعم البدل بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ ایک من آٹے اور اِس کتاب کی قیمت میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ ''ماہنامہ چاند'' کے بے شمار لکھاری اِس کتاب میں ایک عدد پلاٹ کے مالک ہیں۔ یہاں اِس بات کا اعتراف کرنا بھی ضروری ہے کہ ہم اِس کتاب کو مکمل طور پر پڑھے بغیر اِس پر تبصرہ کر رہے ہیں کیونکہ اِس کو اتنی جلدی پڑھ لینا دِل گردے کا کام ہے جبکہ یہاں یہ صورتِ حال ہے کہ دِل کسی کو مفت دے آئے اور گردے چند عطائی بے ہوش کر کے مفت میں لے گئے ہیں--- ویسے اِس طرح تبصرہ کرنے کا سب سے بڑا فائدہ مصنف کو ہوگا کیونکہ اگر ہم مکمل پڑھ لیتے تو اِس سے بھی زیادہ نقطہ چینی کرتے حالانکہ یہ بات بھی سچ ہے کہ جب یہ کتاب ہمارے پاس پہنچی تو مصنف کو معلوم ہو چکا تھا کہ مہنگائی کے باعث ہمارے پاس چینی ختم ہو چکی ہے' اب صرف نقطے ہی بچے ہیں جو ہر دوسرے لفظ کے اوپر یا نیچے ٹھونک دیتے ہیں یا پھر ہر بات پر نقطہ اعتراض اُٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔

اِس کتاب ''طنز و مزاح کا اِنسائیکلوپیڈیا'' کی خاص بات یہ ہے کہ تادمِ تحریر مصنف کے پاس اِس کی صرف ایک جلد بچی ہے' باقی یا تو لائبریری والے لے گئے ہیں یا پھر کچھ بے وقوفوں نے بازار سے خرید لیں ہیں حالانکہ ہنسنے کے لئے پارلیمنٹ ہی کافی ہوتی ہے۔ ہم نے اِس کتاب کا جتنا مطالعہ کیا' اتنا ہی خوف محسوس ہوا۔ ہم سوچنے لگ گئے کہ اگر یہ کتاب بطورِ تحفہ دی جانے لگی تو کیا ہوگا؟ محبوبہ لب سڑک قہقہے لگا رہی ہوگی اور عاشق ب ''بھائیوں'' سے مار کھا رہا ہوگا۔ دُلہن قہقہے لگا رہی ہوگی اور دولہا شرمندہ شرمندہ وضاحتیں دے رہا ہوگا۔ ہونے کو تو اور بہت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً طوالت کے باعث یہ تبصرہ ردی کی ٹوکری میں بھی جا سکتا ہے لہٰذا ''کدی گل'' صرف اتنی ہے کہ مصنف اِس سے پہلے بھی ایسی ہی ایک ضخیم کتاب مرتب کر چکے ہیں اور اگلے سال بھی ایسی ہی ایک ''شرارت'' کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں لہٰذا تمام مزاح نگار تیاریاں شروع کر دیں اور پہلی ہی فلائٹ سے بذریعہ ٹرین کاغذ مارکیٹ سے بنڈل کے بنڈل خرید لائیں۔

اگر تبصرہ پسند آئے تو اپنی رائے سے ضرور نوازیں۔ اگر دوست احباب نے پسند کیا (جس کی اُمید نہیں) تو دوسری کتابوں پر بھی

مزاحیہ تبصرہ کریں گے جس کے لئے آپ کا تعارف بھی درکار ہے البتہ اگلی بار مختصر مختصر ہوگا۔ ☆☆

مشاغل+مشغول

سمیع ناظم، میانوالی

آج جس موضوع پر مَیں قلم کو رگڑ رہا ہوں، وہ ہے ''فراغت کے مشاغل''۔ اِس مضمون میں، مَیں نے مشاغل سے شغل کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مَیں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں، یہ آپ ہی بتا سکتے ہیں۔ مجھے آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

شاعری کرنا: شاعری دو اقسام کی ہوتی ہے۔ ایک کو معیاری شاعری کہتے ہیں جبکہ دوسری قسم کو غیر معیاری کا نام دیا گیا ہے---اَب آپ کو معیاری شاعری حاصل کرنے کے لئے 410 روپے خرچ کرنا پڑتے ہیں کیونکہ 400 روپے کی کتاب اور 10 روپے بس کا کرایہ دینا پڑتا ہے جبکہ ''مشہورِ زمانہ لاڈو مارکہ'' شاعری حاصل کرنے کے لئے آپ کو ٹرکوں اور ٹریکٹروں کے پیچھے جھانکنا پڑے گا۔ جہاں ''فری، فیئر اور ٹرانسپیرنٹ'' شاعری آپ کو دِکھائی دے گی۔

اَب چونکہ شاعر حضرات ''حساس پولنگ سٹیشن'' کی طرح حساس ہوتے ہیں اِس لئے ہر کسی کے غم کو ''عید مبارک'' کہہ کر گلے سے لگا لیتے ہیں۔ مہنگائی بڑھتی ہے تو مہنگائی پر شعر کس دیا، عید آتی ہے تو عید پر شعر دوڑا دیا۔ خصوصاً صنفِ نازک کے مظالم اُن کی زد میں اکثر آتے رہتے ہیں۔ جس کے پیچھے یہ لگ جائیں، اُس کی اِتنی دُھلائی کرتے ہیں کہ دو ہفتے کی میل اُتر جاتی ہے۔ اَب بیچارے حکیموں کو ہی لیں جن کے خلاف پہلے ہی MBBS ڈاکٹروں نے تلواریں ننگی کر رکھی ہیں۔ اُن کو کس طرح بدنام کرتے ہیں، عرض کیا ہے---

ہوتا مَیں پڑھا لکھا کرتا کام حکیموں کا
بہانہ نبض کا ہوتا پکڑتا ہاتھ حسینوں کا

اَب آپ خود سوچیں بیچارے حکیم دوہری چکی میں پس رہے ہیں اور قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ ایک اور جگہ پر شعر کو مَیں نے ''قابو'' کیا ہے۔ عرض کیا ہے---

ڈرائیور کی زندگی میں اکثر یہ الزام ہوتے ہیں
نگاہیں نیک ہوں تو بھی بدنام ہوتے ہیں

یعنی ڈرائیور حضرات کی بدنامی کا غم بھی اِن کو ہے ''مَیں صدقے واری''۔ (مَیں غیر معیاری شاعری کو اِس لئے گھسیٹ رہا ہوں کیونکہ ابھی میری جیب 410 روپے سے ناآشنا ہے)--- اَب یہ بات بھی نہیں ہے کہ شاعر حضرات کے پاس طاقت نہیں ہوتی بلکہ یہی شاعر اپنی شاعری سے پنجابی فلموں میں بڑی بڑی کرینوں اوہ--- سوری، ہیروئنوں کو تگنی کا ناچ نچاتے ہیں۔ شاعروں کے متعلق مزید بتاتا چلوں کہ اِن کا ناپسندیدہ پھل ٹماٹر ہے، ناپسندیدہ شخص انڈے فروش ہے اور پسندیدہ نام ''ارشاد'' ہے۔

کبوتر بازی: اگر آپ کہیں جا رہے ہوں اور ایک شخص آپ کو دِن میں ''چاند ستارے'' ڈھونڈتا نظر آ جائے تو فوراً پہچان لیجئے گا کہ موصوف کا کوئی ''لکی کبوتر'' گم ہوگیا ہے۔ ایسے شخص کو ''دہشت گرد'' بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ دہشت گرد مرنے سے پہلے گھر والوں کو کچھ نہ کچھ دے جاتا ہے، اِسی طرح کبوتر باز شخص جب گاڑی کی ٹکر سے مرتا ہے تو گھر والے ''ڈھائی لاکھ'' سے کم پر بات بھی نہیں کرتے۔

کبوتر ''عشق رسانی'' کا کام بھی سرانجام دیتے ہیں لیکن اَب یہ ''نیک فریضہ'' موبل آئل، یعنی موبائل نے لے لیا ہے۔ وہ بھی کیا دِن تھے جب کوئی شخص کبوتر کے ذریعے گھر پیغام دیتا تھا اور کبوتر بھی چونچ کی سیدھ--- میرا مطلب ہے، ناک کی سیدھ میں اُڑ کر پاؤں سے بندھی چٹھی لے کر منڈیر پر ''ایمرجنسی لینڈنگ'' کرتا۔ سب دوڑ کر اُسے ''رسیونگ پروٹوکول'' یعنی دانہ دُنکا ڈالتے اور ساتھ ہی چٹھی پاؤں سے الگ کرتے لیکن آج کل کے دور میں یہ پیغام رسانی اِس لئے مشکل ہے کیونکہ بعض کالونیاں بالکل ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اب بیچارہ کبوتر ٹھہرا ایک پرندہ، وہ یا تو ٹیلی نار کے ٹاور پر بیٹھا ہوگا یا پھر موبی لنک کے کھمبے پر بیٹھ کر ''لیڈی فرسٹ'' کو تلاش کرتا ہوگا اور کچھ نہیں تو حبیب پلازہ کی منڈیر پر بیٹھا ''غٹرغوں پیارا گھر کہاں ہے تو'' کا وِرد کرتا ہوگا۔

اِدھر کبوتر غائب ہوتا، اُدھر کبوتر باز بھی غائب ہوتا ہے۔ پوچھیں کیوں؟ نہیں پوچھتے تو چلو مَیں خود بتا دیتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ سڑک کے کنارے اور گلیوں میں گٹروں کے ڈھکن اکثر ہیروئنچی ''سوٹا لگا نے غم بھلانے'' کے لئے لے جاتے ہیں اور کبوتر باز افراد ''چاند تاروں میں نظر آئے چہرہ تیرا'' کا وِرد کرتے ہوئے کبوتروں کو تکتے رہتے ہیں۔ بس یہی وجہ ہے کہ کبوتر کو اپنا مالک نہیں ملتا، واسا والوں کو اُن کا ڈھکن نہیں ملتا البتہ ڈاکٹروں کو ایک زخمی ضرور مل جاتا ہے۔ اِسی وجہ سے ایریل کا نعرہ ہے کہ ''داغ نہیں تو سیکھنا نہیں''، جبکہ ہم کہتے ہیں کہ ''ڈھکن نہیں تو داغ تو ہے پر بندہ نہیں''--- مَیں کبوتر بازوں سے پرزور گزارش کرتا ہوں کہ وہ بھی کبھار زمین کی طرف بھی دیکھ لیا کریں، ہو سکتا ہے راستے میں پانچ روپے کا سکہ پڑا ہو۔

کتا پالنا: مَیں نے سنا ہے کہ یورپ میں ''انگریزوں کے کُتے بھی انگریزوں کی طرح ہوتے ہیں۔ یعنی بلاوجہ انگریز کسی کو تنگ نہیں کرتا اور کتا بھی ہمیشہ نگاہیں نیچے کیے کسی کو تنگ نہیں کرتا۔ یعنی دونوں میں نفسا نفسی کوٹ کوٹ کر بلکہ ٹھونک بجا کر بھری ہوتی ہے۔ اِدھر تو حال ہی عجیب ہے۔ جہاں صاف گھر ہو وہاں کتا نہیں ہوتا' جہاں کتا ہو وہاں بھکاری نہیں ہوتا البتہ جہاں بھکاری ہو وہاں ''بھکارن'' ضرور ہوتی ہے۔

اچھا اگر آپ نے کہیں پارک میں ٹہلتے ہوئے کسی شخص کو ہاتھ میں کُتے کی رسّی پکڑے دیکھا ہو تو دور سے کتا بھی نہایت محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ایسے لگتا ہے جیسے ''محبت کا ہول سیل ڈیلر'' ہے لیکن جب آپ قریب سے گزریں گے تو یقیناً وہ آپ پر اپنی ''مہر محبت'' ضرور ثبت کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ گلی میں گزرتے وقت جب بھی کوئی کتا میرے سامنے آتا ہے تو مَیں ''ریورس گیئر'' لگا کر 120Kmh کی سپیڈ سے دوڑتا ہوں اور دِل سے آواز آتی ہے کہ---

''مَیں اُڈی اُڈی جاواں ہوا دے نال''

آپ نے یہ واقعہ تو ضرور سنا ہوگا کہ ایک دیہاتی شہر میں گھوم رہا تھا ایک کتا اُس کے پیچھے لگ گیا تا کہ ''مہر محبت'' ثبت کر سکے۔ اب دیہاتی نے نیچے دھنسا ہوا پتھر اُٹھانے کی کوشش کی لیکن دھنسا ہوا پتھر ہاتھ نہ آنے پر ہسٹوریکل ڈائیلاگ بولا تھا کہ ''شہری لوگ کتوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور پتھروں کو باندھ کر رکھتے ہیں'' اِس میں غلطی پتہ ہے کس کی ہے؟ شاید دونوں کی۔ کتا بیچارہ پتھر کو ہڈی سمجھ رہا تھا اور دیہاتی---!

ایک اور واقعہ ہے کہ ایک ''ہوائی جہاز'' کی بکری گم ہوگئی۔ پوڈری نے ہر جگہ فلائیٹ اُڑائی لیکن کسی بھی ایئر پورٹ پر نہ ملی۔ جب گھر آیا تو اندھیرے میں اُسے بکری بندھی نظر آئی۔ غصے میں آ کر ''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی'' کہتے ہوئے اُسے ذبح کر ڈالا۔ صبح جب نگاہ دوڑائی تو بکری موجود تھی لیکن ''کتا'' غائب تھا۔ اب قصور کس کا ہے؟ ظاہر ہے' لوڈشیڈنگ کا۔

جس گھر میں جیکی شیروف اوہ---سوری' جیکی بندھا ہو' وہاں چور اور بھکاری بالکل نہیں جاتے۔ اگر جائیں تو واپسی پر اُن کی زبان پر ایک ہی بات ہوتی ہے---

بوہے باریاں تے نالے کندھاں ٹپ کے
ڈاکٹر صاحب! ہم آواں گے ہوا بن کے

بلی اور کتے کی ''ٹریڈیشنل وار'' اِن کے آباؤ اجداد کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ جب ایک کتا کسی گھر کی چوکیدار کر رہا ہوتا ہے تو بلی اُس سے پوچھتی ہے۔ ''میاؤں میاؤں'' یعنی مَیں آؤں' مَیں آؤں؟ لیکن کتا جواب دیتا ہے ''بھوں بھوں'' یعنی کیوں' کیوں--- پھر چونکہ بلی اعلیٰ پائے کے خاندان سے ہے یعنی ''اُچا شملہ'' رکھتی ہے اِس لئے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہاں سے بھاگ جاتی ہے۔

مرغ پالنا: مرغ پالنا ایک ''زر آمد قسم کا شوق ہے۔ عموماً مرغ باز افراد کی 6x4 کی مونچھ ہوتی ہے اور بغل میں مرغ ہوتا ہے۔ مرغ پالنے والے افراد مرغوں کو لڑانے پر جوا بھی لگاتے ہیں جن پر اُن کا نعرہ ہوتا ہے ''جوا صرف ہمارا ہوا'' لیکن اکثر ''ہمارا ہونے'' سے پہلے پولیس پہنچ جاتی ہے اور مرغ باز کو جوتے چھوڑ کر شتر مرغ بننا پڑتا ہے' یعنی بھاگنا پڑتا ہے۔

مرغ باز افراد مرغوں کو اولاد سے بڑھ کر پیار کرتے ہیں لیکن مرغ ہمیشہ ایسے پیار سے نالاں رہتے ہیں کیونکہ یہ ''پیار'' یا تو اِن کو بھینگا بنا دیتا ہے' یا پھر بالکل اندھا کر دیتا ہے یا پھر چکن کڑاہی بنا دیتا ہے اور بیچاری مرغی کو جہلم کا خرچ بھگتنا پڑتا ہے اور بدلہ لینے کے لئے ''برڈ فلو'' جیسے ''خودکش'' دھماکے کرنا شروع کر دیتی ہے۔ مرغوں کا کام صبح کا الارم بجانا بھی ہوتا ہے کیونکہ دیہاتوں میں لوگ مرغ کی آواز سن کر ہی بستر سے نیچے قدم رکھتے ہیں۔ اگر مرغ اذان نہ دے تو دوپہر تک صبح ہی نہیں ہوتی۔

میرے پڑوس میں ایک مرغ باز رہتا ہے۔ اِس کا مرغ صرف ایک غلطی کرتا ہے۔ چاندنی راتوں میں جب رات کو ایک یا دو بجتے ہیں تو وہ صبح سمجھ کر اذان دینا شروع کر دیتا ہے اور اپنے مالک کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی ''چاند'' کے درشن ضرور کرواتا ہے ورنہ اگر کالے بادل چھائے ہوں تو صبح دوپہر کی نمازیں اکٹھی ادا کرواتا ہے۔

اگر کبھی آپ مرغوں کی لڑائی دیکھنے گئے ہوں تو آپ کو پتہ ہوگا کہ لڑائی کا منظر بالکل ''سٹاک ایکسچینج'' کی مانند ہوتا ہے جہاں ہر کوئی بولی لگا رہا ہوتا ہے۔ یعنی ''جوا'' کا ہنڈرڈ انڈکس معلوم کر رہا ہوتا ہے۔ میانوالی مرغ پالنے کے حوالے سے بھی پہچانا جاتا ہے کیونکہ جیب میں موبائل ہو نہ ہو بغل میں مرغ ضرور ہوگا۔ یعنی اِدھر موبائل کی گھنٹی کی بجائے مرغ کی بانگ زیادہ سنائی دیتی ہے--- بہرحال' مرغ ایک خوبصورت پرندہ ہے' ہمیں اِس کو لڑا کر اِس پر ظلم نہیں کرنا چاہئے بلکہ صرف پالنے کی حد تک ہی رکھنا چاہئے۔

کتابیں پڑھنا: ایسے افراد کا حدود اربعہ یہ ہے کہ عینک کے نیچے ناک ہوتی ہے اور ہاتھوں میں کتاب پکڑی ہوتی ہے اور سامنے والی جیب میں پنسل ہوتی ہے اور اکثر وہی راستہ' یعنی وہی گلی استعمال کرتے ہیں جو

ناچ نچاتے ہیں۔شاعروں کے متعلق مزید بتاتا چلوں کہ اِن کا ناپسندیدہ پھل ٹماٹر ہے' ناپسندیدہ شخص انڈے فروش ہے اور پسندیدہ نام "ارشاد" ہے۔

کبوتر بازی: اگر آپ کہیں جا رہے ہوں اور ایک شخص آپ کو دِن میں "چاند ستارے" ڈھونڈتا نظر آ جائے تو فوراً پہچان لیجئے گا کہ موصوف کا کوئی "لکی کبوتر" گم ہو گیا ہے۔ایسے شخص کو "دہشت گرد" بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ دہشت گرد مرنے سے پہلے گھر والوں کو کچھ نہ کچھ دے جاتا ہے' اِسی طرح کبوتر باز شخص جب گاڑی کی ٹکر سے مرتا ہے تو گھر والے "ڈھائی لاکھ" سے کم پر بات بھی نہیں کرتے۔

کبوتر "عشق رسانی" کا کام بھی سرانجام دیتے ہیں لیکن اَب یہ "نیک فریضہ" موبائل آئل' یعنی موبائل نے لے لیا ہے۔وہ بھی کیا دِن تھے جب کوئی شخص کبوتر کے ذریعے گھر پیغام دیتا تھا اور کبوتر بھی چونچ کی سیدھ---میرا مطلب ہے' ناک کی سیدھ میں اُڑ کر پاؤں سے بندھی چٹھی لے کر منڈیر پر "ایمرجنسی لینڈنگ" کرتا۔سب دوڑ کر اُسے "رسیونگ پروٹوکول" یعنی دانہ دُنکا ڈالتے اور ساتھ ہی چٹھی پاؤں سے الگ کرتے لیکن آج کل کے دور میں یہ پیغام رسانی اِس لئے مشکل ہے کیونکہ بعض کالونیاں بالکل ایک جیسی ہوتی ہیں۔اب بیچارہ کبوتر ٹھہرا ایک پرندہ' وہ یا تو ٹیلی نار کے ٹاور پر بیٹھا ہوگا یا پھر موبی لنک کے کھمبے پر بیٹھ کر "لیڈی فرسٹ" کو تلاش کرتا ہوگا اور کچھ نہیں تو حبیب پلازہ کی منڈیر پر بیٹھا "غٹرغوں پیارا گھر کہاں ہے تو" کا وِرد کرتا ہوگا۔

اِدھر کبوتر غائب ہوتا' اُدھر کبوتر باز بھی غائب ہوتا ہے۔پوچھیں کیوں؟ نہیں پوچھتے تو چلو مَیں خود بتا دیتا ہوں۔آپ کو معلوم ہوگا کہ سڑک کے کنارے اور گلیوں میں گٹروں کے ڈھکن اکثر ہیرونچی "سوٹا لگا کے غم بھلانے" کے لئے لے جاتے ہیں اور کبوتر باز افراد "چاند تاروں میں نظر آئے چہرہ تیرا" کا ورد کرتے ہوئے کبوتروں کو تکتے رہتے ہیں۔بس یہی وجہ ہے کہ کبوتر کو اپنا مالک نہیں ملتا' واسا والوں کو اُن کا ڈھکن نہیں ملتا البتہ ڈاکٹروں کو ایک زخمی ضرور مل جاتا ہے۔اِسی وجہ سے ایریل کا نعرہ ہے کہ "داغ نہیں تو سیکھنا نہیں" جبکہ ہم کہتے ہیں کہ "ڈھکن نہیں تو داغ تو ہے پر بندہ نہیں"---مَیں کبوتر بازوں سے پرزور گزارش کرتا ہوں کہ وہ کبھی کبھار زمین کی طرف بھی دیکھ لیا کریں' ہوسکتا ہے راستے میں پانچ روپے کا سکہ پڑا ہو۔

کتّا پالنا: مَیں نے سنا ہے کہ یورپ میں "انگریزوں کے کُتے بھی انگریزوں کی طرح ہوتے ہیں۔یعنی بلاوجہ انگریز کسی کو تنگ نہیں کرتا اور کتا بھی ہمیشہ نگاہیں نیچے کیے کسی کو تنگ نہیں کرتا۔یعنی دونوں میں نفسا نفسی کوٹ کوٹ کر بلکہ ٹھونک بجا کر بھری ہوتی ہے۔اِدھر تو حال ہی عجیب ہے۔جہاں صاف گھر ہو وہاں کتا نہیں ہوتا' جہاں کتا ہو وہاں بھکاری نہیں ہوتا البتہ جہاں بھکاری ہو وہاں "بھکارن" ضرور ہوتی ہے۔

اچھا اگر آپنے کہیں پارک میں ٹہلتے ہوئے کسی شخص کو ہاتھ میں کُتے کی رسّی پکڑے دیکھا ہو تو دور سے کتا بھی نہایت محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ایسے لگتا ہے جیسے "محبت کا ہول سیل ڈیلر" ہے لیکن جب آپ قریب سے گزریں گے تو یقیناً وہ آپ پر اپنی "مہرِ محبت" ضرور ثبت کرے گا۔یہی وجہ ہے کہ گلی میں گزرتے وقت جب بھی کوئی کتا میرے سامنے آتا ہے تو مَیں "ریورس گیئر" لگا کر 120Kmh کی سپیڈ سے دوڑتا ہوں اور دِل سے آواز آتی ہے کہ---

"میں اُڈی اُڈی جاواں ہوا دے نال"

آپ نے یہ واقعہ تو ضرور سنا ہوگا کہ ایک دیہاتی شہر میں گھوم رہا تھا ایک کتا اُس کے پیچھے لگ گیا تا کہ "مہرِ محبت" ثبت کر سکے۔اب دیہاتی نے نیچے دھنسا ہوا پتھر اُٹھانے کی کوشش کی لیکن دھنسا ہوا پتھر ہاتھ نہ آنے پر ہسٹوریکل ڈائیلاگ بولا تھا کہ "شہری لوگ کتوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور پتھروں کو باندھ کر رکھتے ہیں" اِس میں غلطی پتہ ہے کس کی ہے؟ شاید دونوں کی۔کتا بیچارہ پتھر کو ہڈی سمجھ رہا تھا اور دیہاتی---!

ایک اور واقعہ ہے کہ ایک "ہوائی جہاز" کی بکری گم ہوگئی۔پوڈری نے ہر جگہ فلائیٹ اُڑائی لیکن کسی بھی ایئرپورٹ پر نہ ملی۔جب گھر آیا تو اندھیرے میں اُسے بکری بندھی نظر آئی۔غصے میں آ کر "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی" کہتے ہوئے اُسے ذبح کر ڈالا۔صبح جب نگاہ دوڑائی تو بکری موجود تھی لیکن "کتا" غائب تھا۔اب قصور کس کا ہے؟ ظاہر ہے' لوڈشیڈنگ کا۔

جس گھر میں جیکی شیروف اوہ---سوری' جیکی بندھا ہو' وہاں چور اور بھکاری بالکل نہیں جاتے۔اگر جائیں تو واپسی پر اُن کی زبان پر ایک ہی بات ہوتی ہے---

بوہے باریاں تے نالے کندھاں ٹپ کے
ڈاکٹر صاحب! ہم آواں گے ہوا بن کے

بلی اور کتے کی "ٹریڈیشنل وار" اِن کے آباؤاجداد کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔جب ایک کتا کسی گھر کی چوکیدار کر رہا ہوتا ہے تو بلی اُس سے پوچھتی ہے۔"میاؤں میاؤں" یعنی مَیں آؤں مَیں آؤں؟ لیکن کتا جواب دیتا ہے "بھوں بھوں" یعنی کیوں' کیوں---پھر چونکہ بلی اعلیٰ پائے کے خاندان سے ہے یعنی "اُونچا شملہ" رکھتی ہے اِس لئے اعلیٰ ظرفی

کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہاں سے بھاگ جاتی ہے۔
مرغ پالنا: مرغ پالنا ایک ''زرآمد قسم کا شوق ہے۔ عموماً مرغ باز افراد کی 6x4 کی مونچھ ہوتی ہے اور بغل میں مرغ ہوتا ہے۔ مرغ پالنے والے افراد مرغوں کو لڑانے پر جوا بھی لگاتے ہیں جن پر اُن کا نعرہ ہوتا ہے ''جو اصرف ہمارا ہوا'' لیکن اکثر ''ہمارا ہونے'' سے پہلے پولیس پہنچ جاتی ہے اور مرغ باز کو جوتے چھوڑ کر شتر مرغ بننا پڑتا ہے' یعنی بھاگنا پڑتا ہے۔

مرغ باز افراد مرغوں کو اولاد سے بڑھ کر پیار کرتے ہیں لیکن مرغ ہمیشہ ایسے پیار سے نالاں رہتے ہیں کیونکہ یہ ''پیار'' یا تو اِن کو بھینگا بنا دیتا ہے' یا پھر بالکل اندھا کر دیتا ہے یا پھر چکن کڑاہی بنا دیتا ہے اور بیچاری مرغی کو چہلم کا خرچ بھگتنا پڑتا ہے اور بدلہ لینے کے لئے ''برڈ فلو'' جیسے ''خودکش'' دھماکے کرنا شروع کر دیتی ہے۔ مرغوں کا کام صبح کا الارم بجانا بھی ہوتا ہے کیونکہ دیہاتوں میں لوگ مرغ کی آواز سن کر ہی بستر سے نیچے قدم رکھتے ہیں۔ اگر مرغ اذان نہ دے تو دوپہر تک صبح ہی نہیں ہوتی۔

میرے پڑوس میں ایک مرغ باز رہتا ہے۔ اس کا مرغ صرف ایک غلطی کرتا ہے۔ چاندنی راتوں میں جب رات کو ایک یا دو بجتے ہیں تو وہ صبح سمجھ کر اذان دینا شروع کر دیتا ہے اور اپنے مالک کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی ''چاند'' کے درشن ضرور کرواتا ہے ورنہ اگر کالے بادل چھائے ہوں تو صبح دوپہر کی نمازیں اکٹھی ادا کرواتا ہے۔

اگر کبھی آپ مرغوں کی لڑائی دیکھنے گئے ہوں تو آپ کو پتہ ہوگا کہ لڑائی کا منظر بالکل ''سٹاک ایکسچینج'' کی مانند ہوتا ہے جہاں ہر کوئی بولی لگا رہا ہوتا ہے۔ یعنی ''جوا'' کا ہنڈرڈ انڈکس معلوم کر رہا ہوتا ہے۔ میانوالی مرغ پالنے کے حوالے سے بھی پہچانا جاتا ہے کیونکہ جیب میں موبائل ہو نہ ہو بغل میں مرغ ضرور ہوگا۔ یعنی اِدھر موبائل کی گھنٹی کی بجائے مرغ کی بانگ زیادہ سنائی دیتی ہے--- بہرحال' مرغ ایک خوبصورت پرندہ ہے' ہمیں اِس کو لڑا کر اِس پر ظلم نہیں کرنا چاہئے بلکہ صرف پالنے کی حد تک ہی رکھنا چاہئے۔

کتابیں پڑھنا: ایسے افراد کا حدود اربعہ یہ ہے کہ عینک کے نیچے ناک ہوتی ہے اور ہاتھوں میں کتاب پکڑی ہوتی ہے اور سامنے والی جیب میں پنسل ہوتی ہے اور اکثر وہی راستہ' یعنی وہی گلی استعمال کرتے ہیں جو ایک لوہار کی'' کا مطلب سمجھ میں آیا۔

بعض لوگ اِس لئے بھی اپنے نازک دماغ کو استعمال نہیں کرتے کیونکہ اُنہیں معلوم ہے کہ دماغ زیادہ استعمال کرنے سے خرچ ہو جائے گا اور اگر ایسا ہو گیا تو وہ مشکل وقت میں کیا استعمال کریں گے؟ (مَیں ایسے دوستوں سے ہزار فیصد متفق ہوں اِسی لئے مَیں نے اپنے ''پن پیک'' دماغ کو ابھی استعمال نہیں کیا' یعنی سیل بند ہے)--- ویسے بھی اگر پڑھ لکھ گئے تو کوئی نہ کوئی نوکری مل جائے گی اور اگر نوکری مل گئی تو پیر جنگلی سے بغاوت کرنا پڑے گی۔

سکے جمع کرنا: بعض لوگوں کو سکے جمع کرنے کا شوق چٹ جاتا ہے لیکن یہ اللہ کے نام پر دے دؤ بابا! والے سکے نہیں ہوتے بلکہ ''بابا گرونانک'' کے دور کے سکے اور کرنسی ہوتی ہے۔ عجیب بات ہے' ہمیں آج کل کی کرنسی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی اور اِن کو پرانے زمانے کی جس پر بیل گاڑی کا نشان بنا ہوتا ہے کی تلاش ہے اور بعض لوگوں کو ٹکٹیں اور تصاویر جمع کرنے کا شوق بھی ہوتا ہے جو کہ پاکستان کی معیشت کو دھچکا--- سوری' دھکا لگانے میں اہم ''کریم رول'' ادا کرتا ہے کیونکہ اِسی وجہ سے فلم کی ہیروئنوں کی ''دال روٹی'' چلتی ہے (تصویریں جو بکتی ہیں)--- تصویروں سے یاد آیا۔ حال ہی میں الیکشن ہوئے ہیں۔ جن اُمیدواروں کے انتخابی نشان چھوٹے ہوتے ہیں' وہ انتخابی نشان کو اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر سجاتے ہیں۔ مثلاً تیر کا نشان منڈیر پر لگا دیا۔ سائیکل ہے تو بہت سوں نے سائیکل چھت پر کھڑی کی ہوتی تھی۔ اَب مسئلہ بیچارے شیر والوں کو پیش آیا۔ خیر' شیر تک تو بات ٹھیک ہے لیکن خدانخواستہ انتخابی نشان ''ہاتھی'' ہوا تو یہ بات میرے نازک دماغ کے اندر نہیں گھس رہی کہ وہ چھت پر کیا لگائیں گے؟ ☆☆

تین بٹا تین

۞ ایلفا اینڈ اومیگا

ساتھیو! ہم آپ سب کو سب سے پہلے نہایت عاجزی سے سلام پیش کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمارا نام دیکھ کر غصے کی تاب نہ لاتے ہوئے' ہمیں مارنے مرنے پر تل گئے ہوں گے لیکن آپ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ ہم ابھی تک اپنے پیر جی ہاں' پیر جنگلی کی مریدی میں ہیں اِس لئے اِن باتوں کو چھوڑیئے اور ہمارے لکھے ہوئے الفاظ حرف بہ حرف پڑھئے اور اِن سے فائدہ اُٹھایئے۔

دوستو! ہم اپنی سائنس کی کتابوں میں سائنسدانوں کے عجیب عجیب نام پڑھتے چلے آ رہے ہیں اور پتا نہیں اور کتنے عجیب و امیر نام پڑھتے کہ ہم نے اور ہمارے دوست حافظ زبیر نے اِن پر تحقیق شروع کر دی۔ چونکہ حافظ صاحب مسجد کے بگڑے ہوئے تھے اِس لئے اُنہوں

نے کچھ زیادہ ہی تحقیق کر ڈالی۔ بہر حال' اِس تمام تحقیق کا نچوڑ کچھ یوں تھا۔

نیوٹن :۔ ہم نے ایک ایسی مشین ایجاد کی جس کے ذریعے ہم نیوٹن انکل کے زمانے میں چلے گئے اور ہم نے اِس مشین کا نام "TPKWM" (ٹائم پیچھے کرنے والی مشین) رکھا۔ ہم نے دیکھا کہ کچھ لوگ آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ ہم نے پوچھا تو ایک نے ہمیں بتایا کہ ہم میں سے کچھ کہتے ہیں کہ چھبیس من کا ایک ٹن ہوتا ہے تو کچھ کہتے ہیں کہ تیس من کا ایک ٹن ہوتا ہے۔ ابھی اِس نے یہی کہا تھا کہ نیوٹن چلایا۔

"پاگلو! ٹن نہ تو چھبیس من کا ہوتا ہے' نہ تیس من کا بلکہ دس کلو کا ایک ٹن ہوتا ہے۔"

سب لوگ اِس بات پر متفق ہو گئے اور وہ اندھوں میں کانا راجہ کی بجائے' کانوں میں اندھا راجہ ہو گیا۔ ہم سرپٹ بھاگے آئے اور ہماری ایجاد مشین TRKWM وہیں رہ گئی۔ بعد میں نوید شاہ (نمائندہ خصوصی) کی رپورٹ سے پتا چلا کہ نیوٹن کو نیا ٹن ایجاد کرنے کی بناء پر نیو---ٹن (New tun) ہی کہا جانے لگا ہے۔

فیراڈے :۔ ہم دِن رات بھاگتے دوڑتے' رُکتے' چلتے سفر کرتے رہے۔ ہمیں یہ بھی نہ پتا تھا کہ ہم اگلے زمانے کی طرف سفر کر رہے ہیں یا پچھلے زمانے کی طرف اور ہمیں نہ ہی کوئی بندہ نہ بندے کی ذات نظر آئی تھی کہ جس سے ہم پوچھ سکیں کہ ہم کون سی صدی میں ہیں۔ اچانک ہماری نظر ایک درخت پر لٹکے ہوئے بندر پر پڑی۔ جب ہم اِس بندر کے قریب پہنچے تو ہمیں پتا چلا کہ وہ بندر نہیں بلکہ اِنسان ہے۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی (کیونکہ ابھی ابتدا بھی نہیں ہوئی تھی) وہ ہمیں دیکھ کر ڈر گیا۔ وہ بھاگنے لگا تھا کہ ہم نے اُس کو پکڑ لیا۔ ہم نے اُس سے پوچھا کہ یہ کون سی صدی ہے؟ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر کار ہم نے اُس سے دِن کے بارے میں پوچھا تو اُس نے بتایا کہ آج فیراڈے (فرائی---ڈے) ہے تو ہمیں اِس کے جواب پر بہت ہنسی آئی۔ خیر' ہم نے اُس بندر اوہ---سوری' اِنسان کا نام ہی "فیراڈے" رکھ دیا۔

مادام کیوری :۔ وہ بندر (فیراڈے) پہلے تو ہم سے ڈر رہا تھا لیکن بہت جلد وہ ہم سے مانوس ہو گیا لیکن اب ہم اِس سے تنگ آ گئے تھے۔ بڑی مشکل سے ہم نے اُس سے جان چھڑائی۔ تقریباً ایک صدی پیدل چلنے کے بعد ہمیں ایک غار نظر آیا۔ ہم اِس میں جا گھسے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں دو عدد بستر ہمارے منتظر ہیں۔ ہم دونوں علیحدہ علیحدہ بستروں میں گھس گئے اور جلد ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ ابھی مجھے سوئے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ مجھے کسی کی چیخنے کی آوازیں آنے لگی۔ میں جب لاشعور سے شعور میں آیا تو پتہ چلا کہ حافظ صاحب فل آواز میں آیۃ الکرسی پڑھ رہے ہیں۔ میں بیٹھ گیا۔ اب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے سامنے ایک عدد ڈائن کھڑی ہے اور ہمیں خونخوار نظروں سے گھور رہی ہے۔ جب حافظ صاحب نے آیۃ الکرسی ختم کر لی تو اِس ڈائن سے پوچھا۔

"کون ہے تو؟"

ڈائن نے کہا۔ "کیوری---کیوری---!"

حافظ نے پوچھا۔ "یہاں کیوں آئی ہوں؟"

وہ بولی۔ "کیوری---کیوری---!"

ہم اُس غار سے بڑی مشکل سے باغ اوہ---سوری' بھاگ کر آئے۔ تقریباً تین سال دوڑنے کے بعد ہمارے ذہن میں خیال آیا کہ یہی مادام کیوری ہوگی تو ہم نے حافظ سے بھی اپنا خیال کہہ دیا۔ حافظ بھی مان گیا اور حافظ نے مفروضہ بھی پیش کیا کہ یہ تابکاری کر رہی ہوگی کہ کچھ شعاعیں اِس پر پڑی ہوں گی تبھی اُس کی یہ حالت ہوگئی۔ ہم اِس کی عقل کی داد دینے لگے۔

دوستو! سائنسدانوں پر ابھی تک ہماری تحقیق جاری و ساری ہے۔ جیسے ہی کوئی حتمی رپورٹ تیار ہوگی' ہم آپ تک پہنچائیں گے اور ہمارا نمائندہ خصوصی بھی آج بیسواں سال ہے' گم ہو گیا ہے اور ہم نے نمائندہ خصوصی نوید شاہ کو ہر حال میں ڈھونڈنا ہے کیونکہ اِس کے بغیر ہمارا دِل بالکل نہیں لگا۔ ہمیں اب اجازت دیں بلکہ خوش ہو جائیں کہ ہم جا رہے ہیں۔

☆☆

واشنگ مشین

روح اللہ روح

روزینہ کو جب اُس کے پانچ سالہ بچے طفیل نے مسلسل چھٹے روز بھی وہی بات بتائی تو اُس نے اپنے شوہر جمشید سے مشورہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ پانچ سالہ طفیل سے گزشتہ چند دِنوں سے مدرسے میں ماسٹر فضل دین پوچھنے لگا تھا۔

"کیوں' بیٹا! تمہاری امی میرا پوچھتی ہیں کہ نہیں' اُسے میرا سلام کہنا۔"

رات کو جمشید اور روزینہ نے موجودہ صورتحال پر بحث کی تو آخر یہ فیصلہ کیا کہ لگتا ہے ماسٹر فضل دین کی نیت میں فتور ہے لہٰذا اُس کو تھوڑا سا

سبق سکھانا ضرور ہے۔ پروگرام کے مطابق بچے کو سمجھایا۔ بچے نے فضل دین کو بتایا کہ ماسٹر صاحب! میری امی آپ کو یاد کرتی ہیں اور آپ کو کل صبح دس بجے گھر بلایا ہے--- فضل دین نے سنا تو آنے والے خوشگوار لمحوں کے احساس سے خوشی سے اُچھلنے لگا۔ رات کو ٹھیک طرح نیند بھی نہیں آئی' خیالوں میں خوبصورت روزینہ کے ساتھ ڈائیلاگ کی ریہرسل کرتا رہا۔

صبح سویرے اُٹھا' مہینہ بعد صابن سے نہایا' صاف کپڑے پہنے۔ کانوں میں عطر ملی روئی کے گولے ٹھونسے' کئی زاویوں سے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور ٹھیک دس بجے روزینہ کے گھر کی کنڈی کھڑکائی۔ روزینہ نے دیکھا تو جھٹ دروازہ کھول کر ماسٹر کو اندر آنے کا کہا۔ اندر آ کر ابھی ماسٹر فضل دین ٹھیک سے چارپائی پر بیٹھا بھی نہیں تھا کہ باہر سے جمشید کے کھانسنے کی آواز آئی۔ روزینہ نے کمال ایکٹنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھبراہٹ میں کہا۔

''اوئی' ربا! یہ تو طفیل کے ابا آ گئے۔''

ماسٹر فضل دین بھی خوفزدہ ہو کر بولا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

روزینہ بولی۔ ''جلدی سے نلکے کے پاس بیٹھ جا اور یہ کپڑے (پہلے سے پروگرام کے مطابق رکھا کپڑوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ہاتھوں سے دھونا شروع کرو۔ ویسے بھی ہماری واشنگ مشین خراب ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ تم پر اپنی چادر ڈال دیتی ہوں۔ طفیل کے ابا نے پوچھا تو بتا دوں گی کہ ہمسائی ہے' کپڑے دھونے آئی ہے۔''

فضل دین کو بھی یہ مشورہ مناسب لگا اور جھٹ کپڑے دھونے لگ گیا۔

جمشید نے آتے ہی روزینہ سے پوچھا۔ ''کیوں بھئی' یہ کون مائی ہے؟''

روزینہ بولی۔ ''یہ اللہ وسایا کی گھر والی ہے' کپڑے دھونے آئی ہے۔''

جمشید نے کہا۔ ''اچھا' اچھا میں ذرا اِس چارپائی پر سستا لوں۔'' اور چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔

فضل دین جس نے ساری زندگی کبھی اتنی مشقت نہیں کی تھی' کپڑے دھوتے دھوتے بیچارے کا کچومر نکل گیا۔ جمشید نے جب دیکھا کہ کپڑے ختم ہونے کے قریب ہیں تو اُٹھ کر بولا۔

''بھئی' بیگم! میں ذرا قریبی دکان سے پان لے کر آتا ہوں۔''

جونہی جمشید باہر نکلا' ماسٹر فضل دین جو موقعے کی تاک میں تھا' تیر کی طرح بھاگ گیا اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ واپسی پر جمشید اور روزینہ خوب ہنسے۔

چند دِن بعد روزینہ نے پانچ سالہ طفیل سے پھر کہلوا بھیجا کہ ماسٹر صاحب! میری امی نے سلام بھیجا ہے اور آپ کا پوچھتی ہیں۔ فضل دین تپ کر بولا۔

''چل بھاگ جا' سلام کے پتر! لگتا ہے تمہاری واشنگ مشین پھر خراب ہوگئی ہے۔''

☆☆

آشنا---

محمد عباس

جب دوسری جماعت پاس کی تو یکدم ہم پہ انکشاف ہوا کہ ہم تدریسی سلیبس کے ساتھ ساتھ باقی لکھے گئے الفاظ بھی سمجھ سکتے ہیں جس میں اپنی لکھائی شامل نہیں ہے--- اِس کے بعد ہم اِردگرد کی عمارات پر لکھے گئے الفاظ پڑھتے اور اپنے جنرل نالج میں اضافہ کرتے۔ کہیں کوئی حکیم صاحب اپنی پبلسٹی کر رہے ہیں تو کہیں پرائیویٹ سکول والے۔ ایک دفعہ بس میں سفر کیا تو مزید شخصیتی ''جنرل نالج'' میں اضافہ ہوا کیونکہ وہاں مختلف بندوں کے بارے میں رائے دی گئی تھی۔ مثلاً اشفاق کالا ہے' ریحان بے غیرت ہے۔'' ٹرکوں کے پیچھے یہ عبارت تو ہم نے بڑے شوق سے پڑھی کہ ''ہم دوست ہیں دِل والوں کے' بہت جی چکے۔''

محلے اور دوسری جگہوں پر ہم نے دیکھا کہ جو بھی معزز نظر آتے ہیں یا سمجھے جاتے ہیں' وہ اخبار کا مطالعہ ضرور کرتے ہیں تو ہم میں بھی اخبار کے مطالعے کا جنون چڑھا۔ ایک دفعہ ہم نے پکوڑے خریدے تو اخبار میں لپیٹ کر دیئے گئے۔ خیر' پکوڑے کھانے کے بعد ہم نے مطالعہ اخبار کی نیت باندھی۔ اخبار پڑھنے کے آداب کے مطابق کرسی کھینچی اور اخبار پڑھنے کے لیے اُستاد نصیرالدین کی طرح اِس پر براجمان ہوئے۔ اِس وقت ہمارے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے (کیونکہ اِس وقت قد ہی اتنا تھا) ہوا میں معلق پیروں کے ساتھ' بڑے کروفر کے ساتھ' پکوڑوں کی چکنائی کے ساتھ ہائی لائیٹ کی گئی زندگی کی بقلم خود پہلی خبر پہلے دِل ہی دِل میں ہجوں کے ساتھ پڑھی' پھر روانی سے پڑھی' پھر زبانی پڑھی' پھر گانا بنا کر اِس کو گنگنانے لگے۔ خبر تھی کہ ''دو بچوں کی ماں آشنا کے ساتھ فرار'' --- یہ خبر اماں کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔ ساتھ ہی اماں نے

کہا۔

''ہائے ہائے کیا زمانہ آگیا ہے' بے غیرت لوگ!''

خیر' اِس وقت ہم ''آشنا'' اور ''فرار'' کے مفہوم سے بے خبر تھے مگر اماں کے تبصرے کے ساتھ ساتھ ازراہِ احتیاط ہم نے بھی اپنے مخصوص انداز میں ''آشنا'' نامی بندے کے بارے میں لب کشائی کی تو اماں کی طرف سے ہمارے تبصرے پر مزید تبادلہ خیال کے لئے جوتا آیا۔ وہ تو بھلا ہو کرسی کا جو ہمارے قد سے بھی ایک فٹ بلند تھی۔ کرسی سے ہم نے چھلانگ لگائی تو اماں کی طرف سے دوسرا جوتا آیا۔ ہم اپنی ہی جگہ پہ ساکن ہو گئے کیونکہ اماں کے جوتے سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اپنی جگہ پہ کھڑے رہو کیونکہ جونہی بچنے کے لئے اِدھر اُدھر ہلو گے تو جوتا لگنے کے چانسز ننانوے فیصد ہوتے ہیں مگر تیسرے کا انتظار کیے بغیر ہی ہم نے بھاگنے میں عافیت سمجھی۔

بعد میں بھی ہم نے کئی خبروں میں پڑھا کہ فلاں لڑکی آشنا کے ساتھ فرار۔ لڑکیوں پر بھی بہت غصہ آتا کہ ہر دفعہ آشنا کے ساتھ ہی کیوں فرار ہوتی ہیں' آخر یہ آشنا نامی بندہ ہے کون جو ہر لڑکی کو گھر سے بھگائے جا رہا ہے؟--- اِس پر لڑکیوں پر اَور بھی غصہ آتا کہ کیا وہ آشنا کے کرتوتوں کے بارے میں نہیں جانتیں' وہ اخبار نہیں پڑھتیں؟ مگر خبروں کی تفصیل میں جانے سے پتہ چلتا کہ اکثر و بیشتر جو لڑکی آشنا کے ساتھ فرار ہوتے تو اِس کا تعلق کسی نہ کسی گاؤں سے ہوتا۔ چنانچہ تعلیم کی کمی گردانتے ہوئے سوچا کہ اِن گاؤں کی مٹیاروں کو شاید تعلیم کی کمی کی وجہ سے آشنا صاحب کے کرتوتوں کا پتہ نہیں چلتا مگر ایک دفعہ خبر پڑھی کہ ''گلبرگ (لاہور) میں لڑکی آشنا کے ساتھ فرار''--- ہم نے سوچا کہ شاید لاہور میں بھی بعض گھروں میں لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دی جاتی شاید اِس لیے وہ بھی آشنا کے بارے میں کچھ نہیں جان پائی۔

ایک دفعہ پیر جنگلی بابا سیانا' المعروف پیر جنگلی سے شرف ملاقات حاصل ہوئی تو اُس کو اپنا دُکھڑا سنایا کہ ہر لڑکی آشنا کے ساتھ ہی فرار کیوں ہوتی ہے' آخر یہ آشنا نامی بندہ ہے کون؟ پیر جنگلی نے مدبرانہ انداز میں سر ہلایا' داڑھی پہ کھجلی کی اور پھر فلسفیانہ انداز میں سر ہلایا۔

''میری بات یاد رکھنا کہ آشنا نامی بندہ کا تعلق امریکہ سے ہے۔''

پیر جنگلی کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھے اور امریکہ کی حرمت پر چار حرف کہے۔

آشنا کے ساتھ فرار ہونا کی اصل وجہ تعلیم کی کمی ہے۔ ایسی وجہ جو کالجوں' یونیورسٹیوں میں بی اے' ایم اے کرنے کے باوجود بھی رہتی ہے اور پھر بھی آشنا نامی امریکی ایجنٹ کے ساتھ گھر سے بھاگتی ہیں اور اپنے گھر والوں کی عزت کی دھجیاں بکھیرتی ہیں--- ہمارے ذہن میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ آشنا نامی اِس امریکی ایجنٹ کو ہمارے ادارے گرفتار کیوں نہیں کرتے جو تمام ملک سے لڑکیاں بھگا رہا ہے۔ پھر اپنی ہی سوچ کو رَد کرتے ہوئے کہ پاکستانی ادارے ایک امریکی ایجنٹ کو گرفتار کرنے کا ''گناہِ عظیم'' کیسے کر سکتے ہیں۔

اِنہی دِنوں ہمارے محلے کی لڑکی سلیم نامی لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔ مارے صدمے کے میری تو جان ہی نکلی جا رہی تھی کہ سلیم اتنا بے غیرت نکلے گا۔ یہ امریکی ایجنٹ ہے' اب تلک اتنی لڑکیوں کو گھر سے بھگا چکا ہے کیونکہ اگلے ہی دِن اخبار میں خبر آئی تھی کہ ''چاندنگر کی لڑکی آشنا کے ساتھ فرار''--- بہت افسوس ہوا یہ جان کر۔ صرف دو دِنوں بعد ہی لڑکی کے بھائیوں نے سلیم کو قتل کر دیا تو ہماری جان میں جان آئی کہ اَب کوئی لڑکی گھر سے نہیں بھاگے گی۔ ایک ایجنٹ تو اِن کا مارا جا چکا ہے' اَب شاید وہ دوسرا ایجنٹ بھیجنے میں ہچکچاہٹ سے کام لے۔ شکر ہے کہ اِس ''آشنا'' نامی بلا سے پاکستان کی جان چھوٹی۔

ایک دِن یونہی چوک پہ کھڑے تھے کہ ہاکر نے زور زور سے اخبار بیچنے کے لئے خبر پڑھی۔

''چار بچوں کی ماں آشنا کے ساتھ فرار!''

☆☆

محفل مشاعرہ

✿ صائمہ، لاہور

معزز چکورانِ سرزمین چاند! آج ہم آپ کو ایک محفل مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا اور کسی اور کے کانوں سنا حال بتاتے ہیں۔ اُمید ہے' پسند آئے گا۔

آداب! مَیں ہوں مس ہوا ہوائی' آج ہم آپ کو معزز شاعروں اور شعراء اور ہرایرے غیرے کا کلام سنائیں گے۔ دِل تھام لیجئے کہ وہ مرحلہ آن پہنچا۔ مَیں اپنے مشاعرے میں سب سے پہلے دعوت دیتی ہوں لاہور کے ایوارڈ یافتہ دِل پھینک عاشق' ریٹائرڈ عاشق کو۔ ریٹائرڈ ہو چکے ہیں مگر کرتوت وہی ہیں۔

ریٹائرڈ عاشق مس ہوا ہوائی کو گھور گھور کر دیکھتے ہوئے آتے ہیں۔ (عادت سے مجبور) اور سٹیج پر پہنچ کر کھانستے ہیں۔ پھر ہوا ہوائی کو گھورتے ہیں۔ آخر مس کو غصہ آ جاتا ہے اور وہ کہتی ہیں۔

ہواہوائی: شرم کرو! ابھی تو مَیں بچی ہوں۔ بچیوں کو گھورتے ہیں؟
عاشق: مَیں کیہڑا بزرگ آں، بچہ ہی آں، اپنی ماں دا (مَیں کون سا بزرگ ہوں، بچہ ہی ہوں اپنی ماں کا)
ہواہوائی: آپ شعر پڑھیں گے یا---!
عاشق: او باجی! غصہ نہ کرو مَیں تو مذاق کر رہا تھا۔ عرض کیا ہے---

دِل کی چوٹوں نے کہیں چین سے رہنے نہ دیا
جب کسی ایک سے مار پڑی، مَیں نے دوجا پنگا لیا

سرظریف نے "واہ، واہ" کی گردان شروع کی۔
شاہداطہر: بس کرو یار! یہ واہ ہے، پان کی پچکار نہیں ہے جس کو چھوڑ نہیں رہے ہو۔
سرظریف نے شاہداطہر کی طرف اپوزیشن جیسی کڑی نظر سے دیکھتے ہوئے منہ مبارک بند کر لیا۔
ریٹائرڈ عاشق:---

مار کھا کھا کر بھی نہ بدلا مَیں ظالم
جو بھی دیکھتا ہے پوچھتا ہے، ٹائم کیا ہوا

ریٹائرڈ عاشق نے شعر پورا کرنے کے بعد مس ہواہوائی کی طرف دیکھا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔
مس ہواہوائی: اب تشریف لاتے ہیں ڈاکٹر بابو سیّد نسیم، عرف قصائی صاحب!
ڈاکٹر نسیم---

آیا تھا میرے پاس اپنڈکس کا اِک مریض
مَیں نے چپکے سے کڈنی کا ہی کام مکا دیا

مس ہواہوائی: ڈاکٹر بابو جی! قبرستان کے نیڑے کوئی کلینک کھول لو، فرشتوں سے کمیشن طے ہو جائے گی اور مریضوں کی بھی آسانی۔
ڈاکٹر بابو: او یوشٹ اپ---مَیں ڈاکٹر ہوں، قصائی نہیں۔
ہواہوائی: اب بن جائیں، کون سا فرق پڑتا ہے۔
ڈاکٹر بابو: یو اَن ایجوکیٹڈ گرل! مجھ سے بدتمیزی کر رہی ہو (اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے) پیر جنگلی کو بلاؤ۔
پیر جنگلی: ہانپتے کانپتے ہوئے سٹیج پر آئے اور سمجھانے لگے۔
"ڈاکٹر جی! جانے دیں کا کی ہے۔
ڈاکٹر بابو: تم کہتے ہو تو جانے دیتا ہوں ورنہ میرے پاس سے تو اوپر کے سوا کوئی کہیں جا ہی نہیں سکتا۔
ہواہوائی: چلیں جی، سوری کر لیتی ہوں۔
ڈاکٹر بابو: کوئی بات نہیں، روز کی بات ہے، ایک شعر سنئے---

اے صنم! کبھی جو ہمارے کلینک آپ آئیے
دِل، گردہ، کلیجی سب حاضر ہے لے جائیے
جنت میں جانے کی خواہش بھی ہو جائے گی پوری
اِک بار آ کے ہم سے آپریشن تو کروائیے

ہواہوائی: شکریہ جی، ابھی 60 سال تک ہمارا مرنے کا ارادہ نہیں--- اب تشریف لاتے ہیں ہم سب کے جانے مانے کھلاڑی--- سوری، شاعر، شاہداطہر!
شاہداطہر---

تم سے اُلفت کے راستے نہ ٹاپئے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے
کی ہے جلدی ہم نے شادی کی کیوں، ہائے
ورنہ 20, 25 سال تو ایویں ہی لنگائے جاتے
کچے گھڑے کی مانند ہم ٹھیک ہی تھے، جاناں
کاش، بیگم کے ہاتھوں نہ لٹکائے جاتے

عبدالقیوم: قسمت ماڑی تھی آپ کی ورنہ---!
ہواہوائی: مسٹر شاہد! کیا آپ بیتی بیان کی ہے آپ نے، واہ واہ---!
شاہداطہر: یہ تو کچھ نہیں، کسی دِن چائے شائے ساتھ پئیں تو اور زیادہ دُکھ بیتی سناؤں گا--- ویسے اللہ معاف کرے، بندہ مَیں شریف سا ہوں۔
ہواہوائی: جی جی "شریف" ہیں تو ملک میں ہیں ورنہ باہر نہ ہوتے۔
شاہداطہر: بس جی، ہر روز آپ جیسیوں کی دُعائیں مس کالز کی صورت ملتی رہیں تو کون ظالم دُہائی دے۔
ہواہوائی: اب آتے ہیں شعیب اکبر بلوچ کی طرف۔ ایک پرانے قاری ہیں، ابھی گواچے ہوئے تھے، آج ہی ملے ہیں۔
شعیب اکبر---

میرے شاپ پر سدا آؤ مگر کچھ دیر بیٹھنا سیکھو
تم اکثر گزر جاتے ہو میری دوکان کے آگے سے

ڈیئر چکورانِ چاند! آج کے لئے اتنا کافی ہے کیونکہ ہم اگلی بار سب کا پوسٹ مارٹم کریں گے تب تک کے لئے آپ بے پر کی اُڑاتے رہیں۔
☆☆

جھوٹے وعدے

ستارہ

شاید اُس نے مجھے کسی شادی کی تقریب میں دیکھا تھا جب میں اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی خوش گپیوں میں مشغول تھی۔ میں نے اِس پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور پھر اپنی سہیلیوں میں مصروف ہوگئی۔ ویسے بھی مرد ایسے مواقع کی تلاش میں ہوتے ہی ہیں کہ کب اور کس طرح لڑکیوں کو تاڑا جائے اور اِنہیں اپنی طرف متوجہ کیا جائے۔ جہاں بھی کوئی خوبصورت لڑکی نظر آئی' اِن کا دِل سینے کے بند پنجرے سے باہر نکل کر تڑپنے لگا۔

اِس روز کالج میں میرے آخری دو پیریڈ آف تھے اِس لئے میں کالج سے جلد ہی نکل پڑی۔ اِسی بنا اپنی گاڑی سے محروم تھی۔ چنانچہ گھر جانے کی غرض سے بس سٹاپ پر آن کھڑی ہوئی۔ سٹاپ پر کچھ منچلے بھی موجود تھے' اِنہی میں مجھے وہی شکل نظر آئی تو میں نے اپنا رُخ دوسری جانب کر لیا لیکن چند لمحوں ہی میں وہ میرے قریب آ کھڑا ہوا اور گویا ہوا۔

''تم ستارہ ہو نا؟''

میں خاموش رہی لیکن وہ پھر بولا کہ وہ مجھ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہے اور اگر میں قریب واقع پارک میں چلوں تو وہ باتیں با آسانی کر سکے گا۔ میں پھر خاموش رہی۔ اسی اثنا ایک بس' سٹاپ پر رُکی اور وہاں کھڑے تمام افراد باری باری بس پر سوار ہونے لگے۔ میں نے جونہی قدم بڑھائے' وہ میرا رستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ میں اِس کی بات مان لوں---میں نے چند لمحے غور کیا اور پھر ارادہ کر لیا کہ آج اِس منچلے کو سبق سکھا ہی دوں تو بہتر ہوگا' ویسے بھی معمول کے مطابق ابھی کالج ہی کا ٹائم ہے۔ میں آہستہ آہستہ پارک کی طرف چل دی اور شیشم کے درخت کے نیچے پڑے بینچ پر بیٹھ گئی۔ اِس وقت میں نے اپنے آدھے چہرے پر نقاب اوڑھا ہوا تھا۔ وہ بولا۔

''ستارہ! شادی کی تقریب میں تمہیں دیکھا تھا اور اِسی وقت سے میرا دِل میرے قابو میں نہیں رہا' اب تمہارا حصول میری زندگی کا مقصد بن گیا ہے۔''

میں اِسے غصے سے دیکھنے لگی اور بولی۔

''میرے رستے میں نہ آؤ۔''

''تو ٹھیک ہے۔ میری بربادی کی ذمہ دار تم ہو گی' ستارہ!''

میں کھل کھلا کر ہنس پڑی اور اِسی لمحے میرا نقاب میرے چہرے سے سرک گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مبہوت ہو گیا اور گویا ہوا۔

''چاند نکل آیا ہے' ستارہ! تم واقعی میری قسمت کا ستارہ ہو۔''

''بلاوجہ میرے گلے کیوں پڑتے ہو؟ جاؤ کسی اور کے سنگ اپنے ستارے ملاؤ۔'' میں نے گھور کر اِس کی طرف دیکھا۔

''کتنا غصہ کرتی ہو' ستارہ! میں تمہیں بتا دوں کہ میرا نام نعمان ہے اور وکالت کے آخری سال میں ہوں' پھر وکالت کرتے ہی اپنے بزرگوں کو تمہارے گھر تمہارا ہاتھ مانگنے بھیجوں گا۔''

''جاؤ اپنا کام کرو۔''

میں وہاں سے اُٹھنے لگی تو وہ پھر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''نہیں' ستارہ! نہیں---میرے دِل کی سب سنتی جاؤ۔''

''اور کیا کہنا چاہتے ہو---ابھی تو خود کتابیں چاٹ رہے ہو' میرے لئے کیا کر سکتے ہو؟''

''تمہارے لئے میں آسمان سے تارے توڑ لاؤں گا' اِک بار کہو تو سہی۔'' وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔

''مجھے تارے نہیں چاہئیں۔ میں رکھوں گی کہاں' کیا مجھے اتنا بڑا محل بنا کر دو گے؟ جاؤ' میرے ستارے تمہارے ساتھ نہیں ملتے' اپنا رستہ ناپو۔ مجھے کوئی ایسی ویسی لڑکی سمجھ رکھا ہے کہ راہ چلتے لڑکوں کے ساتھ دوستیاں کرتی پھروں؟'' میں نے اِسے ڈانٹ دیا۔

میں اُٹھنے لگی تو وہ پھر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''اتنی سنگدل نہ بنو' ستارہ! صورت سے تو کسی پرستان کی پری لگتی ہو مگر ہو کتنی پتھر دِل---''

''چلو یہ بتاؤ' کیا میرے لئے دودھ کی نہر کھود سکتے ہو؟'' میں نے اِسے امتحان میں ڈال دیا۔

''یہ افسانوی باتیں ہیں' حقیقت کا اِس میں کوئی تعلق نہیں۔ دودھ کی نہر کھودنا صرف کتابوں تک ہی محدود ہے ورنہ کون مائی کا لعل پتھروں کے جگر سے دودھ نکال سکتا ہے؟''

''بس یہی ہے نا' تمہارا عشق---؟'' میں نے اِسے شرمندہ کر دیا۔ ''تم سب جھوٹے وعدے کر رہے ہو---'' میں اِسے لاجواب کر چکی تھی۔ ''جاؤ میرا راستہ چھوڑو' میں نے گھر بھی پہنچنا ہے۔ اگر اب میرے راستے میں آئے تو میری ایک ہی چیخ سے پارک کے کرنوں کھدروں سے سب لوگ میری مدد کو پہنچ جائیں گے اور پھر تمام لوگوں کے ساتھ میں بھی تمہارا حشر دیکھوں گی۔''

ابھی یہ بات میرے منہ ہی میں تھی کہ اِس نے بڑھ کر میرا بازو تھام

لیا۔ میں زور سے اپنا بازو چھڑانے لگی لیکن وہ پھر بھی مرد تھا' میں اپنا بازو چھڑانے میں ناکام رہی۔ اِسی چھینا جھپٹی میں میری سبز سبز چوڑیاں ٹوٹ کر بچے آ رہیں۔ اِنہی میں سے ایک چوڑی ٹوٹ کر میرے بازو میں چبھ گئی جس سے سرخ سرخ خون اُبل پڑا۔ شاید اس نے میری کسی رگ کو کاٹ دیا تھا۔ وہ گھبرا گیا اور اپنی پینٹ کی جیبوں کو رومال ڈھونڈنے کی غرض سے ٹٹولنے لگا جو اس سے برآمد نہ ہو سکا۔ میں نے فوراً ہی اپنی کتابیں زمین پر پھینکیں اور اس کے گلے میں بندھی ٹائی پکڑ کر اپنے بازو کا خون صاف کرنا شروع کر دیا۔ اِس نے آناً فاناً ٹائی کھول دی اور میرے بازو پر کس کر باندھ دی۔ اِس کی ٹائی خون آلود ہو چکی تھی۔ کچھ دیر میں جب خون تھم چکا تو میں نے اِس کی ٹائی بازو سے اُتار کر اِس کے منہ پر دے ماری۔ اِس نے ایک بار پھر میرا بازو تھامنا چاہا مگر اب میں ہوشیار ہو چکی تھی۔ زمین سے اپنی کتابیں اُٹھا کر تیز تیز قدموں سے وہاں سے چل دی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا مگر میرے قدموں نے میرا بھرپور ساتھ نہ دیا اور میں ایک پتھر سے ٹھوکر کھا گئی۔ اِس نے پھر مجھے تھامنا چاہا لیکن اِس بار میرے غصے کی انتہا نہ رہی اور میں نے پوری قوت سے اِس کے داہنے گال پر سرخ سرخ نقشہ بنا دیا۔ وہ سہا ہی تھا کہ اِسی اثناء میری چھوٹی بہن مجھے جھنجھوڑ کر جگا رہی تھی۔

''اب اُٹھ بھی جاؤ نا' ستارہ باجی! دِن چڑھے تک سوتی رہتی ہو۔''

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر کے سپنوں میں کھو گئی۔ ☆☆

کھیل کھیل میں

اظہار المصطفٰی صدیقی، شیخوپورہ

آپ نے یقیناً حروف ابجد پڑھے ہوں گے۔ جو لوگ ''علم النجوم'' رکھتے ہیں' وہ اِن حروف سے بخوبی واقف ہوں گے اور ہر حرف کے نیچے لکھے گئے اعداد بھی جانتے ہوں گے۔ ''چاند'' میں یوں تو ہر طرح کا مزاح پایا جاتا ہے۔ ہمارے سینئر و جونیئر رائیٹرز صاحبان اور صاحبہ ہم تک اچھا اور معیاری مزاح پہنچانے کے لئے دِن رات مغزماری کرتے ہیں۔ ہمارے جیسے رائیٹرز جو کہ ایڈیٹر ان کی نظر میں نام نہاد ہوتے ہیں' کبھی کبھی حاضری لگانے آ جاتے ہیں اور یہ خالد بھائی کی مہربانی ہے کہ انہوں نے ہمیں بہت کم مایوس کیا ہے--- ہم جیسے کم علم و کم فہم کسی کا قیمتی وقت ضائع نہیں کرتے کیونکہ ہمیں تو ثقیل اُردو لکھنے کا تجربہ ہے ہی نہیں۔ ہماری آسان اُردو سے مزاحیہ کھیلوں سے بھی متعارف کرایا ہے۔ مثلاً گلی ڈنڈا' لکن میٹی' شٹاپو' ککلی' باندر کلا' کوکلا چھپاکی' یسو پنجو وغیرہ لیکن میرا دعویٰ ہے کہ جو کھیل میں آپ کے گوش گزار کرنے لگا ہوں' وہ پورے چاند کی رات اوہ--- سوری' پوری تاریخ ''چاند'' میں کسی نے متعارف نہیں کرایا ہوگا۔ اِس کے لئے آپ کو تھوڑی مغزماری کرنی پڑے گی (اگر مغز ہے تو) اِس کھیل کو آپ "Digits Game" یا پھر عام الفاظ میں ''علم الاعداد'' کہتے ہیں۔ اِس کھیل میں آپ کو ریاضی کے چار اصول جمع' تفریق' ضرب' تقسیم یاد ہونے چاہئیں۔ یا یوں کہئے کہ یہ گیم کھیلنے کے لئے آپ کو پریپ' نرسری یاد کرنا ہوں گی--- مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہ کھیل تمام قارئین کو پسند آئے گا اور فراغت کا بہترین ساتھی ثابت ہوگا۔

جو قارئین حروف ابجد سے واقف نہیں ہیں اُن کی رہنمائی کے لئے حروف اعداد سمیت پیشِ خدمت کرتا ہوں۔

جدول اعداد قمری

ا	ب	ج	د	ہ	و
1	2	3	4	5	6
ز	ح	ط	ی ے	ک	ل
7	8	9	10	20	30
م	ن	س	ع	ف	ص
40	50	60	70	80	90
ق	ر	ش	ت	ث	خ
100	200	300	400	500	600
ذ	ض	ظ	غ	پ	چ
700	800	900	1000	2	3
ژ	گ	ٹ	ڈ	ڑ	ء
7	20	400	4	200	1

اب آپ کھیل شروع کریں اور اپنا دماغ حرکت میں لائیں اور خوب سوچ کر ایک لفظ بنائیں مثلاً ''بیوی'' اِس کے چار حرف ہیں۔ ''ب+ی+و+ی'' اِن کے اعداد کو جدول سے دیکھ کر جمع کریں۔ 2+10+6+10=28 اِس میں ''ٹی وی'' کے اعداد جمع کریں۔ یعنی' 400+10+6+10=426 یہ سوال اِس طرح بنا کہ بیوی+ٹی وی=؟ اب اِن دونوں کا حاصل جمع دیکھتے ہیں۔ 28+426=454

اب اپنی مرضی سے حروف ملا کر الفاظ بنائیں اور اعداد کو اِس طرح ایڈجسٹ کریں کہ لفظ بھی مزاحیہ بن جائے اور حاصل جمع بھی 454 آئے۔ مثال کے طور پر میں ایک سوال حل کر دیتا ہوں۔

بیوی+ٹی وی+کلب (کتا)=شور
یعنی 28+426+426+52=506
اب حاصل جمع 506 کو مَیں نے تین الفاظ میں تقسیم کیا ہے
''ش و ر'' 300+6+200=506 اس کا مقصد یہ ہوا کہ بیوی ٹی وی اور کتا ہمیشہ شور ہی کرتے ہیں، کیسا؟
اب، جناب! مَیں چند سوال آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اگلے شمارے میں اِس کے مزے دار اور ٹو دی پوائنٹ جواب ارسال کریں۔ اپنے دماغوں کو لڑائیں تا کہ ہمیں بھی پتا چلے کہ آپ کتنے ذہین ہیں۔

☆ شرم-غیرت-حیا=؟
☆ ساس+سسر+سالی=؟
☆ رشوت / کالا دھن=(جواب ''بٹا'' میں ہوگا مخطوط کسر)
☆ پولیس x ڈاکو=؟

☆☆

قصہ آخری درویش

یادش منصور، رحیم یار خان

دوستو! میری داستان الم بڑی دردناک المناک اور حسرتناک ہے۔ منہ ہاتھ پیر نہ ہونے کے برابر ہیں کیونکہ جس طرف بھی منہ کیا، منہ کی کھائی۔ جس نے دیکھا اُس نے منہ پھیر لیا۔ اگر کسی کو متوجہ کیا تو اُس نے کہا کہ میرے منہ نہ لگنا--- غرض کہ جس نے منہ دیکھا، اُس نے کہا یااللہ! آج کس کا منہ دیکھ لیا۔ جس سے ہاتھ ملایا، اُسی نے ہاتھ دکھادیا۔ جس محفل میں گئے بغیر نوٹس دیئے نکال دیئے گئے--- میری بربادی کے لیے اُس وقت شروع ہوئے جب شہر کے مشہور سینما منحوس--- معاف کیجئے گا، فانوس میں پشتو فلم دیکھ کر باہر نکلے۔ ہمارا کندھا اِک خان صاحب سے لگ گیا اور وہ ہمارے گاٹے لگ گئے (یعنی گلے کو آگئے) ایک تو وہ خان تھے، دوسرے باریش ہونے کی وجہ سے پکے مسلمان تھے۔ ماتھے پر پڑا ہوا محراب بتا رہا تھا کہ وہ دین اور دُنیا دونوں سے استفادہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اِدھر ہم بھی پکے سورج ونشی راجپوت اور بڑی مونچھوں والے مسلمان تھے کیونکہ جیسے 47ء میں واہگہ بارڈر سے پاکستان میں داخل ہوئے، والد صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا کہ بیٹے! جو ذات پوچھے اُسے راجپوت ہی کہنا، کہیں مروانہ دینا حالانکہ اِس میں منت کرنے کا جواز ہی نہیں بنتا تھا، والد صاحب راج تھے اور راقم الحروف اُن کا پوت (وہ راج مستری کا کام کرتے تھے) چالیس سال تک غیر نصابی رسائل میں ہمارا مضمون چھپتا رہا کہ ہم راجپوت کیوں بنے اور کیسے بنے--- چھوڑیں جی! میں بھی کون سے قصے لے کر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں میں خوب لڑائی ہوئی جس میں میری قمیص کے دونوں بازو سگے بھائیوں کی طرح الگ ہو گئے۔ ہمارے گاؤں کا واحد درزی متین جابر ٹیلر ماسٹر تھا، اُن کی منت سماجت کر کے قمیص ٹھیک کرنے کو دی۔ اُس کا سیا ہوا لنگوٹ جو پہلوان پہن کر اکھاڑے میں اُترتا، وہ اسٹریچر پر ہی اکھاڑے سے باہر آتا اور جس بچے کو والدین اِس کے سلے ہوئے لنگوٹ پہناتے، اُسے دَست لگ جاتے اور والدین پھر اپنے دَست مبارک سے وہ لنگوٹ ضائع کر دیتے۔ (غالباً یہی اُنہی دِنوں کی ایجاد ہے)--- بہرحال، پچاس روپے کا معمولی نذرانہ لے کر متین جابر نے ہماری قمیص ٹھیک کی۔

اِسی دوران ہمارے ایک دیرینہ دوست زاہد مظہر کا ٹیلی فون آ گیا کہ وہ ہمارے گھر تشریف لا رہے ہیں، وہ بھی آخری بس میں۔ وہ ہی جوڑا زیب تن کر کے بس اڈے پر پہنچے۔ جب حُلیے پر نظر ڈالی تو سر پیٹ لیا۔ ایک بازو چھوٹا تو دوسرا لمبا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے بازو کٹا ہوا ہو۔ گھر دوبارہ جانے کا ٹائم نہیں تھا لہٰذا ٹائم وہیں گزارنے کا سوچا۔ دوست تو آیا نہ، اِس اثناء میں ایک بس سے خوش پوش آدمی اُترا اور دس کا نوٹ میری جیب میں ڈال کر یہ جا وہ جا۔ ابھی مَیں کچھ کہنے والا تھا کہ میرے قریب سے ایک فیملی گزری۔ ایک ننھی منی بچی جو شکل سے مظہر شبیہہ رانجھا لگ رہی تھی، اپنے پرس سے بیس روپے نکالے اور ہماری بڑھی ہوئی شیو دیکھ کر میرا دایاں ہاتھ اپنے سر پر پیار سے پھیرتی ہوئی بولی۔

''بابا جی! میرے حق میں دُعا کرنا، مَیں نازیہ نازی کے بھائی کے سالے کی بھتیجی کے ممانی کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لئے جا رہی ہوں۔ زندہ واپس آ گئی تو یہاں سے گزرتے ہوئے پچاس روپے اور دوں گی۔''

دو گھنٹے کے اندر اندر کافی پیسے جمع ہو گئے۔ سوچا اتنے پیسوں میں ہارون سے ملنے کی حسرت پوری ہو سکتی ہے۔ جو تھوڑی بہت شرم اور جھجک تھی، وہ بھی جاتی رہی اور حلال کی روزی بُری لگنے لگی۔ متین صاحب کے اِس آئیڈیے نے لائف ہی بدل دی۔ سوچا کچھ عرصہ یوں ہی چلتا رہا تو اپنے وارثوں کے لئے اتنا کچھ کر جاؤں گا کہ اُن کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی اور خود یادِالٰہی کے لئے سوئٹزر لینڈ چلا جاؤں گا جہاں فارغ اوقات میں کیسینو سے دِل بہلایا کروں گا۔ دوست نے موبائل پر رابطہ

کرتے ہوئے معذرت چاہی۔

اللہ نے اپنے نیک بندے کا رِزق لگا دیا۔ اندھے اور لنگڑے اِس بندے کو رشک اور حسد کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ گلی گلی سائیکل پر پھیری لگا کر ''پریشر گکر ٹھیک کرالو'' کی آوازیں لگا کر بہ مشکل روزی کمانے والے کو اللہ نے ایک ہی جگہ رِزق لگا دیا۔

چند دِن اچھے گزر گئے اِسی اثنا میں موٹر سائیکل خرید چکا تھا۔ سوچا اب مَیں گلشن اسد میں اچھا سا بنگلہ خریدوں گا' کیبل لگاؤں گا۔ اِسی سوچ میں گم تھا کہ کسی کی بددُعا لگ گئی اور بس اسٹینڈ پر پولیس نے عوامی شکایت پر ریڈ کیا جس کے ساتھ اِنسدادِ گداگری کی ٹیم بھی تھی۔ اندھے بس اسٹینڈ سے یوں بھاگے جیسے پہلے ٹائم پر نیو خان کی بسیں نکلتی ہیں۔ لنگڑوں نے بھی ایک ٹانگ کا سلف مارا اور بھاگ لئے اور پھنس گیا مَیں شامت کا مارا۔

پہلے چار دِن اِنسدادِ گداگری کے مہمان رہے' اُس کے بعد انہوں نے تھانے میں ٹرانسفر کر دیا۔ تین دِن تک انہوں نے بلا معاوضہ دُھلائی کی' پھر ایک روشن صبح ہمیں تھانیدار کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ جو وزن میں پروفیسر حنیف باجوہ صاحب کی طرح کرسی میں پھنسا ہوا اپنی خضاب لگی مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔ میرے سامنے مجھے چھڑا کر لے جانے والے شریف اصحاب آئے ہوئے تھے جن سے مَیں بار بار نظریں چرا رہا تھا۔

تھانیدار نے مجھے سنانے کے لئے کہا۔

''آپ بے فکر رہیں' شام تک یہ گھر پہنچ جائیں گے۔'' تھانیدار نے تسلی دی۔

وہ لوگ مطمئن ہو کر گھر جانے کے لئے اُٹھے' ساتھ مَیں بھی جانے لگا۔

''اوئے' تم اِدھر ہی ٹھہرو---'' مَیں رُک گیا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''جی' نازش منظور---''

''کیا کہا؟ بارش منحوس--- عجیب نام ہے۔'' تھانیدار نے مجھے مشتبہ نظروں سے گھورا اور میرا منہ سونگھا۔ ''کیا کرتے ہو؟''

''جی مَیں شاعر ہوں۔''

''کس رسالے میں لکھتے ہو؟''

''جی' ماہنامہ ''چغل خور'' میں۔''

تھانیدار صاحب دھاڑے۔ ''اوئے سپاہی لاٹھی خان---!'' میرا پیشاب خطا ہو گیا۔ ''اِس کے گھر سے پورا دیوان منگواؤ اور ایک غزل دس مرتبہ سناؤ۔ کم از کم تین کتابوں کا مصنف ہے' مَیں نے اِس کی کتابیں پڑھی ہوئی ہیں--- ''مجھے تم سے نفرت ہے' اپنی گھر کب جاؤ گے' میری آنکھیں موتیے سے بھر دو'--- اور ہاں' یہ کام رات کے دو بجے کے بعد ہونا چاہئے۔ زیادہ تنگ نہیں کرنا' شاعر لوگ بڑے حساس ہوتے ہیں۔''

''نہیں' صاحب! مجھے موت سے بھی کڑی سزا دو' پھانسی دے دو مگر میرا کلام نہ سناؤ۔''

''لے جاؤ اِسے---'' تھانیدار نے حقارت سے کہا۔ ''جن لوگوں کو تم نے کلام سنایا تھا' اُن کا کیا قصور تھا؟''

مَیں سپاہیوں کی معیت میں چلا۔

''اوئے' جھک کر چلو' ہم تمہارے باپ کے سیکورٹی گارڈ نہیں۔'' سپاہی دھمکی آمیز لہجے میں بولے۔

مَیں سو سالہ بوڑھے آدمی کی طرح چلنے لگا۔ ناکام سیال کوٹی نے مجھے ساری رات میری غزلیں سنائیں۔ اگر ذرا سی اونگھ آتی تو وہ مجھ پر پانی انڈیل دیتے یا ٹھوکا دے دیتے۔ بڑی مشکل سے جان چھوٹی تو فرمانے لگے۔

''معاف کیجئے' آپ ہمارے پسندیدہ شاعر ہیں۔ آپ سے واقعی زیادتی ہوئی ہے لیکن کیا کریں' سرکاری نوکری ہے' گورنمنٹ کا حکم نہ مانیں تو روٹی کہاں سے کھائیں؟''

یہ کہہ کر اُنہوں نے پچاس بے وزنی غزلیں سنائیں اور درمیان میں داد بھی وصول کی۔ صبح تک میں آدھا پاگل ہو چکا تھا۔ جب تھانیدار صاحب کے حضور پیش ہوا تو اُنہوں نے اپنے دوست سے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''جناب! یہ ہیں نوازش منظور' ہمارے ملک کا سرمایہ اور قوم کی آواز' یعنی شاعر۔ آپ ماہنامہ ''چغل خور'' کے مستقل لکھاری ہیں---'' یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنے دوست کی جیب سے پرتکلف ناشتہ کروایا' پھر سو روپیہ میری جیب میں ڈالا اور کہا۔ ''اگر دوبارہ اِس علاقے کے اِرد گرد نظر آئے تو ساری عمر پورے جسم سے پلاسٹر نہیں اُترے گا۔ دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔''

اِس طرح آخری درویش کی واپسی ہوئی۔

☆☆

معدنیات

شبیہہ مظہر رانجھا، بھلوال

چاچی شگوفہ کو کراچی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اِن کے کافی رشتہ دار اور سگے بھائی بھی وہاں کراچی میں رہائش پذیر تھے اِس لئے اِن کا اشتیاق بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بمشکل چاچا سیٹھی نے انہیں اجازت کا سرٹیفکیٹ جاری کیا۔ آخر ایک سنہرے دِن کی حسین صبح کو وہ کراچی کے لئے روانہ ہو گئیں۔ ڈھیروں تحائف وہ پرس میں بھر کر لے گئیں۔ ایک بیگ الگ سے صرف کھانے پینے کی اشیاء سے بھر کر ساتھ کر لیا تھا کیونکہ آخر سفر دُور کا جو تھا اور پھر وہ کھانے کی بھی بہت رسیا ہیں۔ انہیں کھلاتے پلاتے رہو تو آپ پرویز مشرف یا بش با آسانی بن سکتے ہیں لیکن اگر اِس کے برعکس ہو تو سارے گھٹیا الفاظ آپ کی شان میں کہہ ڈالیں گی--- خیر، جناب! میڈم شگوفہ اپنے بھائیوں اور بھابیوں سے ملیں۔ تقریباً مہینہ وہاں پر قیام کیا، اِس دوران بہت دعوتیں ہوئیں۔ سب کزنوں کے گھر گئیں اور اِن کے بچوں کے لئے جو تحفے لے کر گئی تھیں، وہ بھی خوب بانٹے۔ مہینے کا آخر آ چکا تھا اور اِن کا واپسی کا ارادہ بن ہی رہا تھا کہ ایک کزن عابدہ نے بھی میڈم شگوفہ کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کر لیا۔ اب اِس کا دعوت نامہ سن کر سب حیرت زدہ ہو چکے تھے کیونکہ وہ تو اپنی کنجوسی اور فاقے کشی میں مشہور تھی، پھر کیا مسئلہ ہوا کہ انہوں نے شگوفہ جی کو اپنے گھر مدعو کر لیا؟ اب کوئی جیسے مرضی سوچے شگوفہ میڈم تو پورے گھر میں خوشی سے بولائی ہوئی پھر رہی تھیں۔ صبح سے عابدہ صاحبہ کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے مل رہے تھے۔ بھائیوں کو بُرا بھلا کہہ رہی تھیں کہ تمہیں اِنسان کی پہچان نہیں ہے۔

''خیر، جناب! بہت شدت اور بے چینی کے انتظار کے بعد اللہ اللہ کر کے رات ہوئی اور شگوفہ میڈم نے جانے کی تیاری پکڑی کیونکہ انہوں نے اِس دعوت کے چاؤ میں صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا اور یہ ایک خطرناک بات تھی۔ بھائی نے منع کیا۔

''میری مانو تو پروگرام کینسل کر دو، وہ کنجوس بہت ہے اور تمہیں کھانے کو کچھ نہ دے گی۔''

لیکن میڈم شگوفہ کو انتہا کا غصہ آیا اور صرف تیوریاں چڑھا کر کہا۔

''میرا کھانا نہ بنانا اگر اِس نے نہ دیا تو میں بھوکی سو جاؤں گی۔''

یہ کہہ کر وہ عابدہ جی کے گھر کی طرف چل پڑیں، نزدیک ہی تو تھا۔ وہاں پہنچ کر دستک دی، کسی نے نہ کھولا۔ خیر، تھوڑے وقفے کے بعد پھر دروازہ بجایا۔ کافی انتظار کے بعد تیسری اور چوتھی دستک دی تو دروازہ کھل گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے عابدہ سوتے ہوئے اُٹھ کر آئی ہے۔ اِس نے حیرانی سے پہلے شگوفہ کو دیکھا، پھر تھوڑا پریشان ہوئی اور اندر آنے کے لئے رستہ چھوڑ دیا۔ کمرے میں جا کر شگوفہ میڈم نے چاروں طرف دیکھا اور پھر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ رسمی باتوں کے بعد انہوں نے خاموشی اختیار کر لی کیونکہ انہیں بھوک نے بے حال کر رکھا تھا۔ دس منٹ بیس تیس یہاں تک کہ گھنٹہ گزر گیا۔ شگوفہ بیگم بھی آخر معدہ رکھتی تھیں سو کہہ اُٹھیں۔

''عابدہ! تم نے مجھے دعوت پہ بلایا ہے، مَیں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ بھئی اب کچھ لے بھی آؤ، کب تک ترساتی رہو گی؟''

عابدہ اِس کے بولنے پر مزید پریشان ہو گئی۔

''وہ دراصل، شگوفہ باجی! مَیں نے کھانا بنایا تو تھا لیکن وہ سارا تو بچے کھا گئے ہیں--- خیر، مَیں دوبارہ بنانے کی کوشش کرتی ہوں۔ ویسے بچوں کے پاپا آپ کے لئے باہر سے کچھ کھانے کے لئے لینے گئے ہیں۔''

اب تو شگوفہ میڈم کا موڈ دیکھنے والا تھا۔ انہوں نے بظاہر خوش دلی سے کہا۔

''اچھا چلو کوئی بات نہیں، مَیں اب چلتی ہوں۔ کبھی آنا تم بھی ہمارے پنجاب میں، تمہاری بھی دعوت کریں گے اور تمہارا میاں جو کچھ بھی لے آیا، کھانے سے پہلے ختم پڑھ کر ثواب مجھے پہنچا دینا اور کھا خود لینا--- بلانے کا شکریہ۔''

وہاں سے گھر پہنچیں تو بھیا بھابی اِن کی شکل دیکھ کر ہی سمجھ گئے اور میڈم سے ہاتھ ہو گیا ہے سو انہوں نے خاموشی سے شگوفہ جی کے آگے کھانا چن دیا جس کا بعد میں نشان بھی نہ ملا۔ اب شگوفہ جی نے سر جھکا لیا اور بھیا ڈانٹنے لگے۔

''تم سے، باجی! کہا کس نے تھا کہ عابدہ کے ہاں جاؤ؟ وہ تو ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی کرتی ہے، تم کو نہیں پتہ اِس نے ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی کیا ہے۔''

خیر یہ واقعہ بہت مشہور ہوا اور کہاوتوں اور مثالوں کی طرح مشہور ہوا۔ اِس واقعہ کے یاد آتے ہی ہمارے چہروں پر مسکراہٹوں کے ڈونگرے برسنے لگتے ہیں اور میڈم شگوفہ کے غصے سے نتھنے پھولنے لگتے ہیں۔

☆☆

شاعرانہ بونگیاں

عاشر نثار، سندھ

شاعری شاہ لطیف کی سمجھ، شہزادی زیب النساء کی پائل، غالب اور فراز کا خمار ہے مگر جب شاعری ''فٹ سکیل برانڈ شاعروں'' کی لپیٹ میں آ کر پڑھنے والوں تک پہنچتی ہے تو غصہ میں جذباتی اِس طرح ٹوٹتے ہیں جیسے کہ ڈیم ٹوٹتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب تاریخ میں شاعروں کی بات کی جاتی ہے تو ایک گروپ ایسا بھی ملتا ہے جس کے لئے لغت میں ''فراریت پسند، نکما، بیروزگار، روٹی پہ بھاری، بھاؤ ایک پیالی چائے'' جیسے الفاظ ملتے ہیں---ایک دوست نے کہا۔

''بجٹ میں کاریں سستی ہوگئی ہیں، اِس لئے نئی کار لوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے پاس تو ویسے ہی گاڑی ہے، پھر نئی کار کی کیا ضرورت ہے؟''

کہنے لگے۔ ''یار! وہ کار تو شاعروں کے نصیب کی طرح ہمیشہ خراب رہتی ہے۔''

کہتے ہیں کہ بجٹ اور بددعاؤں کا اثر شاعروں پر نہیں ہوتا۔ یہ شاعر ہی تو ہیں جو ہر بجٹ میں ٹیکس سے بچ جاتے ہیں۔ شاعروں کی بھی کیا عجب زندگی ہے۔ ہر وقت بس کھانا، چاہے وہ پیٹ پوجا کے لئے کھا رہے ہوں یا پھر کسی غریب کا دماغ یا پھر پان---ایک سوتیلی ماں نے بیٹی سے کہا۔

''میں تمہارا رشتہ ایک شاعر سے طے کر کے آئی ہوں۔ اب تمہیں بدنصیبی کی اور کسی بددعا کی ضرورت ہی نہیں۔''

شاعر ایسی چیز ہے جسے شرافت سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ شاعری اور شادی کے لئے تجربہ ضروری نہیں ہے۔ جس پر شاعر کا سایہ پڑ جائے، اُس پر بھوت آسیب اثر نہیں کرتے۔ اِس حساب سے تو شاعر بہت اعلیٰ درجے پر فائز دِکھائی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ شاعری کی ابتدا لکھنؤ سے اور اُنت بھی لکھنؤ میں ہوا۔ جیسے دہلی کے ٹھگ مشہور ہیں، بالکل ایسے ہی لکھنؤ کے لکھنوی شاعر مشہور ہیں لیکن اب وہ بات کہاں؟ جب شاعر تنگ پاجامہ پہنے، منہ میں پان رکھے اگلدان سمیت کندھے پر مخصوص تھیلا لٹکائے اَدبی ذوق والوں کے ہاں ڈیرہ جماتے تھے۔ اب تو ایک پاپ سنگر اور شاعر میں ایک ہی فرق ہے۔ یعنی پاپ سنگر کے گھٹنے، میرا مطلب گھٹنے کی جگہ سے جینز کی پینٹ پھٹی ہوتی ہے۔ آج کل شاعر حضرات پان بھی کم کھاتے ہیں، شاید مہنگائی کی وجہ سے یا پھر اِس لئے کہ اب ہر جگہ پان چبا کر تھوکنا بھی ایک مشکل آرٹ ہے۔ آنکھ بچا کر تھوکنا یا پچکاری مارنا بالکل خطرے کی بات ہے کیونکہ اب لوگوں میں صفائی کے متعلق شعور ہے۔ بھئی ''سیف گارڈ کمانڈر'' کا جو کہنا ہے کہ ''پاک پاک پاکستان، صاف صاف پاکستان---!''

شاعروں کو اچھی شاعری کے لئے ایک عدد ناکام عشق ضروری ہے۔ شاعر خود اچھا ہو نہ ہو، شاعری اچھی ہونی چاہئے۔ جس شاعر کی شاعری میں گہرائی نہ ہو، جو دِل کو نہ بھائے، سمجھو وہ ایک عدد کامیاب عاشق یا کامیاب شوہر ہے---آج کل کی لڑکیاں شاعروں کی کم، شاعری کی زیادہ دیوانی ہیں۔ ہمارے ہاں چند ایک کو چھوڑ کر باقی شعراء کرام بزرگ اور احترام لائق ہیں۔ خواتین شعراء کرام شادی شدہ بھی ہوں تب بھی نقاب پہن کر مشاعروں میں آتی ہیں۔ اِن کو دیکھ کر لگتا ہے کہ شاعری بھی نقاب و حجاب پر مشتمل ہوگی۔

شاعر اگر اکیلے میں کہیں مل جائے تو جب تک بھیجہ چاٹ نہ لے، جان آسانی سے نہیں چھوڑتا۔ اگر کسی شاعر کو راستے میں کوئی جانور بھی مل جائے تو شاعر صاحب اُسے بھی نہیں بخشتے (یہ جھوٹ نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو آپ کا کیا جاتا ہے؟) ایک بار ایسے ہی ایک شاعر کو راستے میں ایک گدھا مل گیا۔ گدھے کے اکیلے پن کا فائدہ اُٹھاتے شاعر صاحب نے ڈائری کھول کر، جھک کر میٹھے انداز میں فرمایا۔

''ارشاد ہے---''

شاعر کی یہ ادا اُس غریب معصوم گدھے کو اتنی پسند آئی کہ گدھے نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ جس پر شاعر صاحب نے آہ بھر کر کہا۔

''اِنسانوں سے تو یہ جانور ہزار بار اچھے ہیں جو کہ اشعار سننے سے پہلے ہی داد دیتے ہیں۔''

شاعر حضرات سے کوئی حسد نہیں کرتا، ماسوائے بہروں کے۔ شاعر حضرات کے لئے تنقید بخار برابر ہے۔ اگر کوئی تنقید کرے تو اِنہیں بخار چڑھ جاتا ہے اور تعریف پر یوں خوش ہتے ہیں جیسے اِنہیں سرکاری نوکری مل گئی ہو۔ شاعر حضرات کو چاہئے کہ شادی ضرور کریں، بیوی اچھی مل گئی تو زندگی اچھی ہو جائے گی اور بیوی اچھی نہ ملی تو شاعری اچھی ہو جائے گی---آج کل شاعروں کی حالت تو یہ ہے کہ بغیر کسی دعوت مشاعروں میں پہنچ جاتے ہیں۔ ایک مشاعرے گاہ میں اگر 25 یا 30 شعراء کرام موجود ہوں تو باری آنے کے انتظار میں شاعر حضرات سوکھ کر کانٹا ہو جاتے ہیں۔

مشاعرہ گاہ، یعنی محفل میں شعراء کرام پر ''ہوٹنگ'' بھی ایک اضافی فن ہے جس سے محفل میں موجود لوگ انجوائے کرتے ہیں۔ شاعر صاحب

اگر غلط شعر پڑھ جائیں، لمبی بور غزل پڑھ لیں تو پھر سامعین ہوٹنگ کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ اِن حالات میں اکثر شاعر حضرات سامان سمیٹ کر رختِ سفر باندھتے ہیں ہاں' البتہ کچھ حضرات ناک کے پکے ہوتے ہیں جن کے لئے ٹماٹر استعمال ہوتے ہیں جو کہ سستے داموں مل جاتے ہیں۔

اکثر سینئر شعراء کرام کو آخر میں بلایا جاتا ہے تاکہ محفل میں سامعین آخر تک بیٹھے رہیں اور محفل میں رنگ جمے مگر اکثر اوقات اتنی دیر ہوجاتی ہے کہ وہی سینئر شعراء کرام خود بھاگ جاتے ہیں--- ہوٹنگ میں بسا اوقات تو رنگ محفل دیکھ کر ثقہ اور سنجیدہ مزاج سامعین بھی ہوٹنگ پر اُتر آتے ہیں۔ ایک مشہور واقعہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں بزرگ حضرات ہادی مچھلی شہری پر ہوٹنگ ہوئی تو وہ بگڑ کر بولے۔

''آپ لوگ جانتے ہیں کہ مَیں کوئی نیا شاعر نہیں؟''

جواب میں علی گڑھ کے ایک سفید ریش بوڑھے نے کہا۔ ''حضور! ہم بھی کوئی نئے ہوٹر نہیں۔''

ایسا بھی ہوتا ہے کہ مشاعرے گاہ میں قبرستان سا سناٹا طاری ہو جاتا ہے اور سامعین یوں بیٹھے رہتے ہیں جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ علی گڑھ کے ہی ایک مشاعرے میں جہاں حضرت جوش' جگر مرادآبادی' حسرت موہانی' ساحرلدھیانوی اور معین احسن جذبی جیسے شعراء کرام موجود تھے' وہاں ہر شاعر کو ہٹ کیا جا رہا تھا۔ ایک موقع پر جب جگر مرادآبادی پر ہوٹنگ ہوئی تو انہوں نے طلبہ کو شاندار جھاڑ پلائی اور جناب! پھر ہوا یہ کہ سامعین نے بالکل خاموشی اختیار کر لی۔ اِن شعراء کرام میں بزرگ شاعر حضرت علامہ جمیل مظہری بھی شامل تھے۔ وہ اپنی باری پر کلام پڑھنے کیلئے آئے۔ انہوں نے غزل کا مطلع پڑھ کر سامعین کی طرف دادطلب نظروں سے دیکھا مگر جب اُن کی جانب سے کوئی سن گن نہ پائی تو دیوان لپیٹ کر واپس جانے لگے۔ ایک سامع نے ترس کھا کر اِن سے کہا۔

''حضور! باقی اشعار تو پڑھئے؟''

اِس پر علامہ جمیل بولے۔ ''باقی اشعار بھی ایسے ہی ہیں۔''

کچھ بھی ہو لیکن کوئی پرستار اپنے ہیرو یا چاہنے والے کے خلاف کچھ بھی نہیں سن سکتا یا برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک دِن مجھے ایک لڑکی نیٹ پر ملی' کہہ رہی تھی کہ عاشر جی! مَیں آپ کی فین ہوں' ویسے آپ کس کے فین ہیں؟

مَیں نے محترمہ سے کہا۔ ''مَیں احمد فراز کا پرستار ہوں۔ لکھاریوں میں مجھے ڈاکٹر یونس بٹ اور شاہداطہر پسند ہیں۔ یہ میرے ہیرو ہیں۔''

محترمہ کہنے لگیں۔ ''عاشر جی! مجھے بھی وہی فراگ اچھے لگتے ہیں۔''

مَیں نے جب یہ سنا تو میرا پارہ کے۔ ٹو پر چڑھ گیا اور اِس کے بعد سے مَیں اِس کا ہیرو نہیں رہا البتہ وہ فین ہونہ ہو۔

☆☆

کہتا ہوں سچ

توصیف احمد، میانوالی

دُنیا کی سب سے مختصر داستان یہ ہے کہ ایک شخص نے دوسرے سے پوچھا۔

''کیا تم بھوتوں پر یقین رکھتے ہو؟''

دوسرا بولا۔ ''نہیں۔''

یہ کہتے ہی دوسرے نے پہلے شخص کی طرف دیکھا تو پہلا شخص غائب تھا۔ اب یہ ہمیں معلوم نہیں کہ اِس دوسرے شخص کا کیا حال ہوا ہوگا لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ پہلا شخص بھوت تھا۔

بھوتوں سے ملنے کا شوق کسے نہیں ہے؟ ظاہر ہے' کسی کو بھی نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے کہ یہ شوق مجھے بہت تھا (تھا اِس لئے کہ اب نہیں ہے) اوپر والی مختصر ترین داستان سننے کے بعد یہ شوق کچھ اور بڑھ گیا' بس یہی شوق مجھے قبرستان کی طرف لے گیا۔ جیسے ہی قبرستان میں داخل ہوا' میرے دِل نے کہا کہ بھاگ لے بچے! لیکن مَیں بچہ ہوتا تو میں بھاگ بھی جاتا---قبرستان کے تقریباً وسط میں مجھے کوئی شخص کھڑا نظر آیا۔ فوراً میرے دماغ میں خیال آیا کہ دُنیا کی سب سے چھوٹی کہانی کیلئے دوسرے شخص کا کردار یہ شخص بخوبی نبھا سکتا ہے۔ سو مَیں اِس شخص کے قریب پہنچا اور اِس سے پوچھا۔

''کیا آپ بھوتوں پر یقین رکھتے ہیں؟''

''جی ہاں---''

وہ شخص بولا اور میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ مَیں دلبرداشتہ ہو کر واپس مڑا تو اِس شخص نے پوچھا۔

''کیا تم بھوتوں پر یقین رکھتے ہو؟''

میں جب تک بھوت دیکھ نہ لیتا' کیسے یقین کرتا پس میں بولا۔

''جی نہیں---''

مگر یہ کہتے ہی مَیں نے اِس شخص کی طرف دیکھا تو وہ غائب

تھا۔ اِس کے بعد مَیں بھی غائب ہو گیا--- جی ہاں' دماغی طور پر۔ تب مجھے پتہ چلا کہ اِس "دوسرے شخص" کا کیا حال ہوا ہوگا۔ پتہ نہیں پھر مجھے قبرستان سے گھر کون لایا البتہ جب میری آنکھ کھلی تو مَیں اپنے گھر میں موجود تھا اور مجھے پورے چار گھنٹے بعد ہوش آیا تھا۔

اِس دِن میرے والدین نے مجھے بہت ڈانٹا اور بالآخر میرے منہ سے یہ الفاظ نکلوا کے رہے کہ آئندہ مَیں کبھی قبرستان نہیں جاؤں گا مگر یہ سوال دِل میں ہی رہ گیا کہ کیا مرنے کے بعد بھی نہ جاؤں؟--- اِس واقعے کے چند روز بعد میری آتش شوق پھر بھڑک اُٹھی اور مَیں ایک بار پھر قبرستان میں موجود تھا۔ شام کا وقت تھا (مردے بھی اِس وقت آرام کر رہے ہوں گے) یہاں جان پہچان تو کسی سے نہ تھی' بس دادا' دادی کی قبر پر پہنچ گیا۔ ابھی وہاں کھڑا ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک "جہاز" آن گرا۔ بھئی' ریگستان اور قبرستان کے جہازوں سے کون واقف نہیں ہے؟ وہ بھی قبرستان کا جہاز تھا۔ مَیں نے سوچا' کاش! بھوت ہوتا۔ اتنے میں وہ بولا۔

"اللہ کے نام پہ کچھ دے' نا!" مَیں نے اِسے تسلیاں دی تو وہ بولا۔

"تسلیوں سے تو ایک پڑیا بھی نہیں آتی۔"

مَیں نے اِسے بھگایا' وہ دور کچے کے علاقے کی طرف اُترتا چلا گیا۔ بہرحال' ابھی بھی میرے دِل میں کہیں بھوت دیکھنے کی تمنا تھی اور تمنا بھی ادا کارہ تمنا جتنی مگر شام ڈھلنے لگی تھی' مجبوراً واپس گھر کو آنا پڑا۔

گھر تو پہنچ گیا مگر دِل وہیں رہ گیا' شاید مجھے بھوتوں سے عشق ہو گیا تھا۔ رات کے وقت میرا کزن مرتضٰی مجھے ملنے آیا۔ اِسے دیکھتے ہی مجھے قربانی کا بکرا یاد آیا۔ بس پھر کیا تھا' مَیں نے اِسے زبردستی تیار کیا اور قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہمارے شہر میں مشہور ہے کہ ماہ صفر میں عیدگاہ والے قبرستان میں ایک چڑیل آتی ہے جو پورا مہینہ یہیں رہتی ہے (میرے خیال میں چھٹیاں گزارنے آتی ہے) اور ہمارا پاگل پن دیکھئے کہ صفر کے مہینے میں ہم اِسی قبرستان کی طرف محوِ پرواز---یعنی چلے جا رہے تھے۔ قبرستان کے گیٹ پر پہنچ کر مرتضٰی رُک گیا' بولا۔

"مجھ میں ہمت نہیں ہے اندر جانے کی۔"

مَیں نے اِسے ایسے دیکھا جیسے 99ء کا وَرلڈ کپ جیتنے کے بعد آسٹریلیا نے پاکستان کی طرف دیکھا تھا اور اِس کا مذاق اُڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ کوئی انجانی قوت مجھے اندر لئے جا رہی تھی۔ چاند کی 12 تاریخ تھی' ملگجی سی روشنی پورے قبرستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ مَیں نے سوچا کہ اِس روشنی کا تو بل بھی نہیں آتا' واقعی مردے خوش قسمت ہیں۔ یہ سوچتا ہوا مَیں آگے بڑھتا گیا۔ اچانک مَیں نے سامنے دیکھا تو مجھے ایسے لگا جیسے کوئی کھڑا ہے۔ مَیں نے آنکھیں ملیں' پھر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ مَیں نے خوشی سے نعرہ مارا۔

"او مَیں نے بھوت دیکھ لیا۔"

مگر افسوس! بھوت نے مجھے بھی دیکھ لیا۔ میرا نعرہ سن کر باہر کھڑا مرتضٰی ڈر گیا اور گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ ادھر مجھے اچانک قبرستان میں کسی عورت کی ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ مَیں یہ سمجھا کہ چڑیل طارق ٹیڈی کا ڈرامہ دیکھ رہی ہے مگر یہ تو مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ وہ مجھے طارق ٹیڈی سمجھ رہی ہے۔ اچانک مجھے ذرا فاصلے پر وہ کھڑی نظر آئی ("وہ" سے میری مراد چڑیل ہے' اب قبرستان میں ریما تو آنے سے رہی)--- میرے دِل نے کہا کہ بیٹے! اب تو چڑیل کے درشن کرو' بھوت کو بھول جاؤ۔ مَیں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ دِل میں قرآنی آیات پڑھنے کی کوشش کی مگر کچھ یاد نہ آیا۔ بڑی مشکل سے سامنے گیٹ نظر آیا مگر وہاں مرتضٰی کو نہ پایا اور اب تو اور بھی گھبرایا۔ میرے رہے سہے ہوش بھی پرواز کر گئے۔ اچانک مجھے ایک زوردار ٹھوکر لگی اور مَیں دھڑام سے ایک قبر پر آ گرا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بہت بھاری بوری میری کمر پر آ گری ہو اور پھر مَیں ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا۔ پھر کیا ہوا' مجھے نہیں معلوم مگر یہ پتہ ہے کہ ڈھائی ماہ بعد میرا بخار اُترا۔ اس دوران مَیں چلتا پھرتا تھا لیکن مجھے پتہ نہ چلتا تھا' کافی علاج کے بعد ٹھیک ہوا۔ جب ہوش آیا تو میری زبان پر پہلا لفظ "بھوک" تھا جسے گھر والے "بھوت" سمجھے اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

☆☆

حمایت

ایک امریکی رپورٹر ایک سروے کر رہا تھا۔ ایک صاحب کو روک کر اِس نے پوچھا۔

"مغرب کے غیر شادی شدہ جوڑوں میں بغیر شادی کے رہنے کا جو رواج زور پکڑ چکا ہے' اِس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

وہ صاحب نہایت جذباتی انداز میں بولنے لگے۔

"یہ بہت بیہودہ رواج ہے' اِسے ختم ہونا چاہئے۔ قانونی شادی' تہذیب' شائستگی اور شرافت کی بنیاد ہے۔ جب ایک گھر' ایک کنبے کی بنیاد رکھی جاتی ہے' تب ہی ملک اور قوم کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے۔ اگر شادی کرنے کا رواج اِسی طرح کم ہوتا رہا تو معاشرہ تباہ ہو جائے گا۔"

وہ خاموش ہوئے تو رپورٹر نے مرعوب لہجے میں پوچھا۔

"کیا آپ باقاعدہ مقرر ہیں؟"

"نہیں' مَیں وکیل ہوں اور صرف طلاقوں کے کیسے لیتا ہوں۔"

ماہ نور بلال' سرگودھا

مہینہ بھر کے قہقہوں کا راشن، شادی شدہ وغیر شادی شدہ خواتین وحضرات کو خوش رکھنے کے لئے لازمی نسخہ
تیس روزہ
زچہ وارڈ
انتظار گاہ
نومبر 2012
قیمت: 50رو
”ہائیں، آپ دو ماہ میں تیسری دفعہ یہاں---آخر اور کتنی بیگمات چھپائی ہوئی ہیں اس شہر میں---؟“